سیّد احمد عروج قادری

مطبوعاتِ اشاعتِ اسلام ٹرسٹ — ۴۴۷

اسلامی تصوّف

سیّد احمد عروج قادری

یونیورسل بکس
۴۰ اے اردو بازار ◎ لاہور

ناشر ـــــــــــ یونیورسل بکس
۴۰۔ اے اُردو بازار۔ لاہور

مطبع ـــــــــــ زاہد بشیر پرنٹرز۔ لاہور

قیمت ـــــــــــ روپے

ملنے کا پتہ

افیصل پبلشنگ کمپنی اُردو بازار۔ لاہور

فہرست مضامین

پیش لفظ ۹

مقدمہ ۱۱

اسلامی تصوف کا ماخذ اور اس کی بنیاد ۱۴

تصوف کیا ہے اور صوفی کون لوگ ہیں ۲۲

کشف و کرامت و الہام محتاجِ دلیل ہیں ۲۹

اولیاء اللہ کون لوگ ہیں ۳۳

احوال و مقامات ۴۵

باب (۱)

نیت ۴۶

نیت کی توضیح

اعمال بالنیات

اعمال کی تین قسمیں

رضائے الٰہی کی متعدد تعبیریں

ایک غلط خیال کی تردید

نیکی کی صرف نیت پر بھی اجر ملتا ہے

ایک طاعت میں متعدد نیکیوں کی نیتیں

مباحات میں حُسنِ نیت

احضارِ نیت

باب (۲)

اخلاص ۶۳

اخلاص کی تشریح

قرآن مجید کی چند آیتیں

مخلِص اور مخلَص ۶۷

من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ

ریاء و سمعہ ۷۴

حقیقتِ اخلاص کی توضیح قرآن میں ۷۸
پہلی تمثیل ۸۱
دوسری تمثیل ۸۲
اخلاص کو ختم کرنے والی تیسری چیز ۸۲
اخلاص کا اعلیٰ درجہ ۸۳
حقیقتِ اخلاص کی توضیح احادیثِ نبویؐ میں ۸۴
دنیا میں مومن کے لیے بشارت ۸۹
صوفیۂ کرام کے اقوال ۹۰
اخلاص کی نعمت کن لوگوں کو ملتی ہے ۹۶

باب (۳)

توبہ ۹۷
توبہ کی تشریح
گناہ کی دو قسمیں ہیں کبیرہ اور صغیرہ ۱۰۰
گناہوں کی تقسیم، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حیثیت سے ۱۰۴
توبہ کی ترغیب اور اس کے فضائل ۱۰۷
اوبہ و انابت ۱۱۰
شکستِ توبہ سے مایوس نہ ہونا چاہیے ۱۱۱
چند مؤثر واقعات ۱۱۵
توبہ سے کوئی شخص کسی حال میں بے نیاز نہیں ہے ۱۱۷
توبہ میں تاخیر خطرناک ہے ۱۱۸

باب (۴)

صبر ۱۲۱
صبر کی تشریح
صبر کی فضیلت ۱۲۴
چند احادیث ۱۲۶
چند آثار ۱۲۸
صبر کی متعدد قسمیں ۱۳۰
صبر کے مختلف نام ۱۳۱
صبر کو ترقی دینے کی تدابیر ۱۳۲

باب (۵)

شکر ۱۳۶
شکر کی تشریح

گریۂ شکر و سپاس ۱۴۹

باب (۶)

توکّل ۱۵۱

توکّل کا مقام صوفیہ کی نظر میں
توکّل کا حکم قرآن میں
احادیثِ نبویؐ ۱۵۴
توکّل کا مفہوم اور اس کی حقیقت ۱۵۶
صوفیۂ کرام کے اقوال و احوال ۱۵۸
توکّل علی اللہ کی وسعت ۱۶۲

باب (۷)

حُسنِ خلق ۱۶۴

حُسنِ خلق صُوفیہ کی نظر میں
اخلاق کی تشریح علمی انداز میں ۱۶۵
حُسنِ خُلق کی فضیلت قرآنِ کریم میں ۱۶۶
حُسنِ خُلق کا ذکر احادیث میں ۱۶۷
حُسنِ خلق کی علامتیں ۱۶۹
حُسنِ خلق کے کچھ واقعات ۱۷۰

باب (۸)

خوف ۱۷۴

خوف کی توضیح
اللہ سے خوف کا مفہوم ۱۷۵
خوف اور خشیّت کی کیفیات ۱۷۶
دل لرز جاتے ہیں ۱۷۹
رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۱۸۰
خشیّتِ الٰہی کا اعلیٰ ترین اسوہ ۱۸۱
خلفائے راشدین کی خشیت و انابت ۱۸۴
چند مزید حدیثیں ۱۸۹

باب (۹)

رجاء ۱۹۲

رجاء کی تشریح
قرآن کی چند آیتیں
تمنائے خام کی مذمت
صوفیۂ کرام کے اقوال
رجاء کے کچھ اور معانی

باب (۱۰)

فقر ۱۹۷

فقر کی تشریح

لفظِ فقر دوسرے معنی میں ۱۹۹
فقر کی دو قسمیں ۲۰۱
دُنیا میں قیام کی تمثیل ۲۰۵
فقراء کی فضیلت ۲۰۵
رزق کفاف کی فضیلت ۲۰۵
حضورؐ کی دُعا اپنے لیے ۲۰۶
حضورؐ کی محبت کا ایک اثر ۲۰۶
فقر کتبِ تصوف میں ۲۰۷
دو آیتوں سے استدلال ۲۱۲
صوفیہ کے اقوال ۲۱۵
فقرائے صوفیہ کے احوال ۲۲۱
فقر و غنا کے درمیان فضیلت کی بحث ۲۲۷
دوسروں کو ترجیح دینے کا واقعہ ۲۲۹
پورا مال قبول کر لینے کا موثر واقعہ ۲۳۰
پورا مال قبول نہ کرنے کا واقعہ ۲۳۱

باب (۱۱)

زہد ۲۳۳
زہد کی تشریح
کیا زہد کے لیے ترکِ مال و اسباب ضروری ہے
چند احادیث

باب (۱۲)

تفکّر ۲۳۸
قرآنِ مجید کی آیتوں سے استدلال
احادیث سے استدلال
بزرگوں کے اقوال ۲۴۰
فکر کی حقیقت اور اس کا ثمرہ ۲۴۲
فکر کے میدان ۲۴۲

باب (۱۳)

مُراقبہ ۲۴۶
مراقبہ کی تشریح
حقیقتِ مراقبہ قرآن میں
احادیث ۲۴۸
صُوفیہ کے اقوال ۲۴۹

باب (۱۴)

محاسبہ ۲۵۳
محاسبہ کی تشریح
قرآنِ کریم میں محاسبہ کا حکم ۲۵۵

محاسبۂ نفس کا ذکر احادیث میں ۲۵۶
کوتاہیوں کا کفارہ ۲۵۷
مؤثر واقعات

باب (۱۵)

مُجاہدہ ۲۶۱

مجاہدہ کی تشریح
سورۂ عنکبوت کی آخری آیت
افضل الجہاد
اصلی مجاہدہ
فساد کے چھ اسباب
چند احادیث ۲۶۷
مجاہدہ میں اتباعِ سُنّت ۲۷۱
اہم ترین مجاہدہ ۲۷۱

باب (۱۶)

محبّت ۲۷۴

محبت کا درجہ
محبتِ الٰہی قرآن میں ۲۷۵
محبتِ الٰہی کا ذکر بصیغۂ خبر ۲۷۷
اللہ کے محبوب و مبغوض ۲۸۳
وہ لوگ جن سے اللہ محبت کرتا ہے ۲۸۳
وہ لوگ جن کو اللہ پسند نہیں کرتا ۲۸۴
محبتِ الٰہی کی کسوٹی ۲۸۷
دُنیا میں محبتِ الٰہی کا ایک صلہ ۲۸۸
محبتِ الٰہی کے بارے میں صوفیہ کے اقوال و احوال ۲۸۹
صُوفیہ کا متفقہ قول ۲۹۲

باب (۱۷)

استقامت ۲۹۵

تمہید و تشریح
سُورۂ حٰم السجدہ کی ایک آیت
حدیث ۳۰۲
بزرگوں کی تصریحات ۳۰۳
استدراج ۳۰۴
صُوفیہ کے دو قول ۳۰۶

باب (۱۸)

دُعاء ۳۰۸

دُعاء کی حقیقت ۳۰۸
دین میں دُعاء کی اہمیت ۳۱۰

رسولِ خدا کو دُعاء کا حکم ۳۱۴
اضافۂ علم کی دُعاء ۳۱۴
غلبہ و اقتدار کی دُعاء ۳۱۵
طلبِ حکومت کی لطیف دُعاء ۳۱۶
ہدایت پر استقامت کی دُعاء ۳۱۷
ہر بُرائی سے پناہ مانگنے کی دُعاء ۳۱۸
طلبِ مغفرت کی دُعاء ۳۲۰
فرشتوں کو دُعاء کا حکم ۳۲۲
غیر اللہ سے دُعاء شرک ہے ۳۲۴
دُعاء کی اہمیت و فضیلت احادیث میں ۳۲۷
دُعاء کا تاکیدی حکم
تکثیرِ دُعاء کا حکم ۳۲۹
دُعاء کی فضیلت ۳۳۰
دُعاء کے شرائط و آداب ۳۳۱
دین کو اللہ کے لیے خالص کر لینا ۳۳۲
اکلِ حلال و کسبِ حلال ۳۳۴
دُعاء کے اندر کی شرطیں
چند قابلِ احتراز چیزیں ۳۳۹
ناروا چیزوں کی طلب ۳۴۰
بلا ضرورت زور زور سے دُعاء کرنا ۳۴۱
دعاء کو تقریر بنا لینا ۳۴۵
اپنی حیثیت سے زیادہ کی طلب ۳۴۵
آدابِ دُعاء ۳۴۵
دعاؤں کے لیے بہتر اوقات و حالات ۳۴۶
مقبولیتِ دُعاء کی ایک اور شرط ۳۴۷
مومن کی دُعاء رد نہیں کی جاتی ۳۴۸
دُعاء کے بارے میں ایک بڑی غلطی کا ازالہ ۳۵۰
امام ابوالقاسم قشیریؒ ۳۵۵

پیش لفظ

کتاب "اسلامی تصوف" کا نقشِ اوّل حاضر ہے۔ اس کتاب کا بڑا حصّہ میں نے اپنے وطن اجھر شریف، ضلع اورنگ آباد، صوبہ بہار میں مُرتّب کیا تھا۔ کچھ حصّے یہاں رام پور میں اپنے فرائضِ منصبی سے فرصت پاکر لکھے گئے ہیں۔ متعدد ابواب ماہنامہ زندگی میں اس لیے شائع کیے گئے تھے کہ قارئین کے کچھ مشورے مل جائیں گے متعدد اشخاص نے جو مشورے بھیجے وہ صرف یہ تھے کہ یہ کتاب جلد شائع کی جائے۔ ایک کاتب صاحب کی علالت کی وجہ سے کتابت مکمل ہونے میں تقریباً ایک سال گزر گیا۔ شکر ہے کہ اب کتابت کا کام پورا ہو گیا اور دُعا ہے کہ کتاب جلد شائع ہو جائے۔ مجھے احساس ہے کہ میری تحریر میں وہ سوز و گداز ہو گا اور نہ وہ تاثیر ہو گی جو "صاحبِ حال" لوگوں کی تحریروں میں ہوتی ہے لیکن بہت سے لوگ "پند بر دیوار" سے بھی فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔

کتاب کے اخیر میں مآخذ کی فہرست عام طور سے دی جاتی ہے لیکن میں نے یہ فہرست نہیں دی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے زیادہ تر قرآن و احادیث سے استفادہ کیا ہے۔ کتبِ تصوّف میں اصلاً صرف دو کتابیں ــــ الرسالۃ القشیریہ اور احیاء علوم الدین ــــ پیشِ نظر رہی ہیں۔ میرے والد ماجد مولانا السیّد عبید اللہ القادری رحمۃ اللہ علیہ "احیاء العلوم" کو نصابِ تصوف کی سب سے اونچی کتاب کہتے تھے۔ تصوّف کی کتابوں میں رسالہ قشیریہ کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ صاحبِ رسالہ کے مختصر سوانحِ حیات اس کتاب کے اخیر میں دے دیئے گئے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مرتّب کتاب کے لیے بھی اور قارئین کے لیے بھی مفید بنائے۔

سیّد احمد قادری

مُدیر ماہنامہ زندگی۔ رام پور۔ یوپی

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ؕ لَاتَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

سُنو، اللہ کے اولیاء کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، دُنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے، اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔

(یونس : ٦٢ تا ٦٤)

مقدمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

تصوف کا اقرار و انکار اور اس کے بارے میں بحث و تمحیص اور اعتراض و جواب اعتراض کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ اگر کسی نے اس کا انکار کیا تو اقرار کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ انکار کس تصوف کا کیا جا رہا ہے اور اگر کسی نے اقرار کیا تو انکار کرنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ کس تصوف کا اقرار کیا جا رہا ہے۔ اقرار کرنے والے منکرینِ تصوف کے درمیان مطعون ہوتے ہیں اور انکار کرنے والے حامیانِ تصوف کے درمیان مذموم قرار پاتے ہیں۔ افراط و تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ گم ہو جاتی ہے اور اس پر چلنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ بعض لوگ تو "تصوف" کے لفظ اور اس اصطلاح پر جھگڑا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اصطلاح پر جھگڑنا معقول بات نہیں ہے۔ اسی طرح بعض لوگ حقیقت سے زیادہ اس اصطلاح کو ماننے اور منوانے پر اصرار شروع کر دیتے ہیں اور یہ بات بھی قرینِ عقل نہیں ہے۔

راقم الحروف نے تصوف کی کتابوں کا جو مطالعہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کے تصوف پائے جاتے ہیں۔ مومنانہ تصوف، فلسفیانہ تصوف، ملحدانہ تصوف۔

ملحدانہ تصوف نے اگرچہ مسلم عوام کو بہت نقصان پہنچایا ہے لیکن علما حق اور صوفیہ صافیہ ہمیشہ اس کی تردید کرتے آئے ہیں اور کسی مومن مخلص کو اس کے قابل ترک ہونے میں شبہ نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ملحدانہ تصوف اس تصوف کا نام ہے جو بزعم خویش اللہ تک پہنچے ہوئے لوگوں کے لیے اسلامی شریعت کو معطل قرار دیتا ہے۔ ملحد اور گمراہ صوفیہ جو مسلمانوں کے بھیس میں دراصل منافق ہوتے ہیں، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب کوئی مسلمان مقام یقین پر فائز ہو کر خدا رسیدہ ہو گیا تو اب وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اس طرح کے شرعی احکام کا مکلف نہیں رہتا، اس گروہ کے نزدیک، طریقت، شریعت سے بالکل علیحدہ چیز ہے، اس کے نزدیک شریعت، مدرسۂ سلوک کے صرف مبتدی طلبہ کے لیے ہے۔

مومنانہ، یعنی اسلامی تصوف جن حقائق کا نام ہے آج تک کسی مومن مخلص نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اس لیے کہ وہ کتاب وسنت سے بصراحت ثابت اور ایمان واسلام کے لازمی تقاضے ہیں۔ علما حق کے درمیان اختلاف ونزاع صرف اس تصوف میں ہے جسے ہم نے فلسفیانہ تصوف کہا ہے۔ اس تصوف کی بنیاد فلسفۂ یونان اور علم الکلام کی دور از کار بحثوں پر قائم کی گئی ہے۔ اس میں بہت سی ایسی چیزیں داخل کر لی گئی ہیں جن کی تائید کتاب وسنت سے نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ قرآنی حقیقتوں کی فلسفیانہ تشریحیں کر کے انھیں کچھ سے کچھ بنا دیا گیا ہے اور ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ بہت سی چیزوں کے لیے انتہائی ضعیف اور موضوع حدیثوں کا سہارا لیا گیا ہے کیونکہ مسلمانوں میں کوئی چیز اس وقت

تک قبولِ عام حاصل نہیں کرتی جب تک اس کے لیے کوئی حدیث نہ پیش کی جائے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے تصوف کے انکار میں شدت اسی فلسفیانہ تصوف پر زور دینے کا نتیجہ ہے۔ صوفیہ میں بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں جو زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ تصوّف کی بنیاد کتاب و سنّت پر ہے لیکن ان کی روش یہ ہے کہ جو لوگ فلسفیانہ تصوف کا انکار کرتے ہیں انھیں بھی وہ اس گروہ میں داخل قرار دیتے ہیں جو مطلقاً تصوّف کا منکر ہے۔ اس کے علاوہ بزرگوں کے بارے میں انھوں نے ایسی غالیانہ عقیدت اختیار کر رکھی ہے جس کا کوئی ثبوت کتاب و سنّت میں موجود نہیں ہے اور اسی کو انھوں نے تصوّف کے اقرار و انکار کی کسوٹی بنا دیا ہے۔ جو شخص ان کی اس خود ساختہ کسوٹی پر کھرا اُترے یعنی غالیانہ عقیدت میں ان کا ساتھ دے وہ تصوّف کا ماننے والا ہے اور جو اس پر کھوٹا ثابت ہو یعنی اس عقیدت میں ان کا ساتھ نہ دے وہ تصوّف کا انکار کرنے والا ہے اور نوّے فی صد یہ بات بھی صادق ہے کہ انھوں نے بزرگوں کی غالیانہ عقیدت کو اپنے لیے حصولِ عقیدت کا حربہ اور وسیلہ بنالیا ہے۔ یہ اپنے ماسبق بزرگوں کے سامنے اس لیے سر جھکاتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کے سامنے سر جھکائیں، جو لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں انھیں وہ تصوّف کا مخالف اور اولیاء کا منکر کہہ کر لوگوں میں بدنام کرنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ لوگوں کی عقیدت ان کے ساتھ وابستہ رہے اور اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

تصوّف کی مشہور و مستند کتابوں میں اسلامی تصوّف اور فلسفیانہ تصوّف ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط ہیں اور ان دونوں کے درمیان امتیاز صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود کتاب و سنّت کا علم رکھتے ہوں اور جن کے دل و دماغ بزرگوں کی اندھی عقیدت سے ماؤف نہ ہوں ——— ہماری

اس کتاب کا موضوع چونکہ اسلامی تصوّف ہے اس لیے ہم نے فلسفیانہ تصوّف سے صرفِ نظر کیا ہے ——— ہم اس مختصر مقدمہ میں حسبِ ذیل نکات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں :-

۱۔ اسلامی تصوّف کا ماخذ کیا ہے۔
۲۔ تصوّف کیا ہے اور صوفی کون لوگ ہیں۔
۳۔ کشف و کرامات و الہام کوئی دلیل نہیں بلکہ خود ان کی صحت دلیلِ شرعی کی محتاج ہے۔
۴۔ "اولیاء اللہ" کون لوگ ہیں۔

اسلامی تصوّف کا ماخذ اور اُس کی بنیاد

تمام صوفیۂ علیہ بلا استثناء اس بات پر متفق ہیں کہ وہ جس تصوّف کے قائل ہیں اس کی بنیاد کتاب و سنّت پر قائم ہے اور یہی اس کے اصل مآخذ ہیں۔ اگر کتبِ تصوّف سے اس سلسلہ کی تمام عبارتیں جمع کی جائیں تو ایک الگ پمفلٹ تیار ہو جائے۔ ہم طوالت سے بچنے کے لیے چند اقوال یہاں نقل کرتے ہیں :-

ابو عبداللہ سہل بن عبداللہ التستری المتوفی ۲۷۳ھ کہتے ہیں :

اصول طریقنا سبعۃ ؛ التمسك بالکتاب و الاقتداء بالسنۃ و اکل الحلال و کف الاذی و تجنب المعاصی والتوبۃ و اداء الحقوق۔ (۱)	ہمارے طریق کے اصول سات ہیں : کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا۔ سنّت کی پیروی۔ حلال کھانا۔ اذیت رسانی سے رُکنا معصیتوں سے اجتناب۔ توبہ اور حقوق کی ادائیگی۔

---

(۱) نتائج الافکار القدسیہ ج ۱ ص ۱۱۱

ابوالحسین احمد بن ابی الحواری (م ۲۴۰ھ) کہتے ہیں:

من عمل عملا بلا اتباع سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فباطل عملہ (۱)

جس کسی نے اتباع سنت کے بغیر کوئی عمل کیا تو اس کا وہ عمل باطل ہوگا۔

ابو حفص عمر بن مسلمۃ الحداد (۲۶۵ھ) کہتے ہیں:

"جو شخص ہر وقت اپنے افعال و اقوال و احوال کو کتاب و سنت پر نہیں تولتا اور جو اپنے وارداتِ قلبی میں شک کر کے اسے نہیں جانچتا اسے "مردانِ حق" کے گروہ میں شمار نہ کرو، مردان حق سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے" ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا" یہ جو بات ابو حفص نے فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص ایسا نہ ہو وہ اپنے دشمن نفس کے فریب سے بے خوف اور اپنے حال میں مگن ہوتا ہے اور جو شخص ایسے دشمن کی عداوت سے اپنے کو محفوظ و مامون سمجھے جس سے دشمنی کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے بارے میں یہ سمجھ لے کہ کسی کا فریب اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا تو ایسا شخص اللہ کی چال سے اپنے آپ کو بے خوف سمجھ رہا ہے اور قرآن میں ہے کہ " اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہو" (۲)

سید الطائفہ ابو القاسم جنید بن محمدؒ (م ۲۹۷ھ) کہتے ہیں:

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۱ ص ۱۲۹ (۲) الرسالۃ و شرحہا

"جس شخص نے قرآن وحدیث کے احکام نہیں سمجھے اور ان کا علم حاصل نہیں کیا، تصوف میں اس کی اقتدار نہیں کی جاسکتی، کیونکہ ہمارا یہ علم (تصوف) کتاب وسنّت سے مقید ہے اور اجماع و قیاس کا مرجع بھی یہی دونوں ہیں۔

ابو علی روذباری جنیدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ہمارا یہ مذہب (تصوف) اصول یعنی کتاب وسنّت کے ساتھ مقید ہے پہلے قول میں "علم" کا لفظ استعمال ہوا ہے اور دوسرے میں "مذہب" کا۔ پہلے لفظ سے اشارہ صحت علم کی طرف ہے اور دوسرے لفظ کا اشارہ صحتِ سلوک کی طرف۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوفیہ کسی وقت بھی اپنے علم وعمل میں کتاب وسنّت سے مستغنی نہیں ہیں اس قول میں اور اس سے پہلے کے قول میں اس شخص کی تردید ہے جو راہِ سلوک میں اپنے "وارداتِ قلبی" پر اعتماد کرتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور سچے ہیں، وہ انھیں کتاب وسنّت پر تولنے سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے اور یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ (۱)

السیّد مصطفٰے العروسی اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

حضرت جنیدؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ طالب سلوک کے لیے شرط یہ ہے کہ علماء سے شریعتِ مطہرہ کے احکام کا علم حاصل کرکے اس پر عمل کرے اس کے بعد اس راہ میں اس کی رہبری درست

---

(۱) رسالۂ قشیریہ مع شرح ج ۱ ص ۱۴۳

ہو سکتی ہے اور جو شخص اس کے بغیر اللہ تک پہنچ جانے کا مدعی ہو وہ بدعتی ہے، نہ اس کی طرف رجوع کیا جائے گا اور نہ اس کی کسی بات پر اعتماد صحیح ہوگا۔

"علم تصوف دائرۂ کتاب و سنت کے اندر ہے"۔ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ علم تصوف کتاب و سنت سے حاصل کیا جائیگا اور اسی کے مطابق عمل ہوگا اور جو شخص علماً و عملاً اس سے خارج ہو وہ زندیق (بے دین) ہے۔ (۱)

ابو حمزہؒ بغدادی (م ۲۸۹ھ) کہتے ہیں:

جو راہِ خدا کا علم رکھتا ہے اس پر اس راہ کی رہروی آسان ہو جاتی ہے اور اللہ تک پہنچانے والے راستے کا رہنما بجز متابعتِ رسولؐ کوئی اور نہیں ہے، متابعت آپؐ کے احوال، افعال اور اقوال سب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ (۲)

ابو اسحاق ابراہیم بن داؤد رقیؒ (م ۳۲۶ھ) کہتے ہیں:

محبتِ الٰہی کی علامت، اس کی اطاعت کو ترجیح دینا اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا ہے اس لیے کہ متابعت محبت کا ثمرہ ہے۔ جو شخص کسی سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کی پیروی نہیں کرتا وہ اس کی محبت میں جھوٹا ہے۔ رقیؒ نے یہ بھی کہا ہے ہر انسان کی قیمت اس کی ہمت کے مطابق ہوتی ہے، پس اگر اس

---

(۱) نتائج الافکار ج۱ ص ۱۴۳ (۲) الرسالہ ج۱ ص ۱۷۷

کی ہمت دنیا ہے (یعنی اس کا مطمح نظر دنیا کا حصول ہے) تو اس کی کوئی قیمت نہیں اور اگر اس کی ہمت اللہ کی رضا ہے تو پھر اس کی قیمت کا ادراک کرنا ممکن نہیں ہے، کوئی اُسے جان نہیں سکتا۔ (۱)

ابوبکر الطمستانی (م ۳۴۰ھ) کہتے ہیں:

الطریق واضح والکتاب والسنۃ قائم بین اظھرنا وفضل الصحابۃ معلوم بسبقھم الھجرۃ والجھاد مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وصحبتھم لہ واما نحن فمن صحب منا الکتاب والسنۃ ای عمل بما فیھما وتغرب ای بعد عن نفسہ و عن الخلق وھاجر بقلبہ الی اللہ تعالیٰ فھو الصادق المصیب دون غیرہ طریق السعادۃ الابدیۃ (۲)

راستہ واضح ہے اور کتاب و سنّت ہمارے درمیان موجود ہیں اور صحابہؓ کا فضل و شرف معلوم ہے اس لیے بھی کہ وہ آپؐ کی صحبت میں رہے اور اس لیے بھی کہ انھوں نے آپؐ کے ساتھ ہجرت کی اور جہاد کیا، رہے ہم لوگ تو ہم میں سے جس نے کتاب و سنّت کی صحبت اختیار کی یعنی کتاب و سنّت میں جو کچھ ہے اس پر عمل کیا اور جس نے اپنے نفس اور مخلوق کی اطاعت سے منہ موڑا اور اپنے دل سے اللہ کی طرف ہجرت کی وہی سچا ہے اور اس نے ابدی سعادت کا راستہ پالیا ہے۔

ابوالقاسم ابراہیم بن محمد النصر آبادی (م ۳۶۷ھ) کہتے ہیں:

تصوف کی اصل یہ چیزیں ہیں: کتاب و سنّت کی پابندی،

---

(۱) نتائج الافکار ج ۱ ص ۱۴۳ (۲) الرسالہ ج ۱ ص ۱۷۷

خواہشات[۲] و بدعات کا ترک، مشائخ[۳] کا احترام، مخلوق[۴] کی معذرتوں کو قبول کرنا، اوراد[۵] پر مداومت۔ رخصتوں[۶] کے ارتکاب سے پرہیز، تاویلات[۷] کو ترک کرنا۔ اس قول میں مشائخ سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم وعمل کے لحاظ سے کامل ہوں اور جنہوں نے ان مباحات سے بھی اعراض کیا ہو جو ذکر و عبادت میں خارج ہوتے ہیں ایسے لوگ یقیناً احترام واکرام کے مستحق ہیں۔ اوراد، ورد کی جمع ہے ان سے مراد وہ نفل عبادتیں ہیں جو بندہ اپنے رب کی رضا اور تقرب کے لیے روزانہ کرتا ہے۔ یہ عبادتیں اللہ کے لطف وکرم کو جاری رکھتیں اور دلوں کو زندہ کرتی ہیں جب کہ حدیث قدسی میں ہے کہ میرا بندہ برابر نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ "رخصتوں" سے یہاں مراد آرام وراحت، تنعم اور لذائذ ہیں۔ "تاویلات" سے مراد یہ ہے کہ کسی شئے کے بارے میں بندہ اپنے نفس میں یہ خیال کرے کہ نہ اسے کرنے میں گناہ ہے، اور نہ ترک میں گناہ ہے، وہ یہ نہ سوچے کہ قرب الٰہی کے حصول میں اس کا فعل یا ترک مفید ہے یا نہیں۔ (۱)

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۹۱ھ) کہتے ہیں:

اجعل الکتاب والسنۃ امامك وانظر فیھما بتامل وتدبر واعمل بھما ولا تغتر بالقال والقیل والھوس (۲)	کتاب وسنت کو اپنے سامنے رکھو۔ تامل وتدبر کے ساتھ ان دونوں کا مطالعہ کرو اور انھیں دونوں کو اپنا دستور العمل بناؤ اور قال وقیل اور ہوا وہوس سے دھوکا نہ کھاؤ۔

---

(۱) الرسالہ مع شرح ۲ صر ۱۵ (۲) فتوح الغیب مقالہ ۳۶۔

آگے چل کر وہ پھر فرماتے ہیں:

لیس لنا نبی غیرہ فنتبعہ ولا کتاب غیر القرآن فنعمل بہ فلا تخرج عنہما فتہلک فیضلک ہواک والشیطان قال اللہ تعالیٰ ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ والسلامۃ مع الکتاب والسنۃ والہلاک مع غیرہما (۱)

سیدنا محمدؐ کے سوا ہمارا کوئی نبی نہیں کہ ہم اس کی پیروی کریں اور قرآن کے سوا کوئی کتاب نہیں کہ ہم اس پر عمل کریں لہذا تم ان دونوں کے دائرے سے باہر نہ نکلو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے تمہاری خواہش اور شیطان تمہیں گمراہ کر دیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ سلامتی کتاب و سنّت کے ساتھ ہے اور ہلاکت غیر کتاب و سنّت کے ساتھ۔

یعنی جو کتاب و سنّت کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کی طرف جھکتا ہے وہ گمراہ ہو کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔

ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل بن عطا (م ۳۰۹ھ) معقول و منقول دلیل کے ساتھ اتباع سنّت پر زور دیتے ہیں:

جو شخص اپنے آپ کو آداب شریعت کا پابند کر دیتا ہے، اللہ اس کے قلب کو نور معرفت سے روشن کر دیتا ہے اور حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت سے اشرف کوئی مقام نہیں ہے، متابعت آپؐ کے اوامر، افعال اور اخلاق سب میں۔ کیونکہ حضورؐ ہی جانتے ہیں کہ وہ افضل

---

(۱) ایضاً

عمل کون سا ہے جسے اللہ پسند کرتا ہے اور وہ اس کے تقرب کا بہترین ذریعہ ہے، حضور بہ نفس نفیس اپنے تمام حرکات و سکنات میں اللہ کی مدد سے، افضل ترین طاعات پر عامل تھے لہٰذا اس میں جو شخص بھی آپ کی پیروی کرے گا اس کا مقام سب سے بلند ہوگا اور اسی بلند مقامی کی ایک بات یہ ہے کہ وہ اللہ کا محبوب بن جائے گا، اللہ خود فرماتا ہے " اے نبی کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تمہیں محبوب رکھے گا" (۱)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن سنت کا اتباع، عبادات، عادات و اخلاق اور اعتقادات سب میں لازم ہے اور یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ ان کی سنت اور طریقے کے خلاف ہے وہ باطل ہے اور جس شخص نے بھی کوئی نئی بات پیدا کی ہے جس سے سنت رسول کی مخالفت ہوتی یا اس میں تغیر پیدا ہوتا ہے خواہ یہ مخالفت اور تبدیلی قول میں ہو یا عمل میں یا اعتقاد میں وہ گمراہی ہے اور مردود ہے۔ (۲)

یہ صراحتیں، ان تمام تضادات و بدعات کے خلاف حجت ہیں جو غفلت و استغراق کے عالم میں کتب تصوف کے اندر داخل ہو گئی ہیں اور آج انھیں تضادات و بدعات کو بہت سے لوگ "تصوف" سمجھ رہے ہیں۔

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ۱۴۰ اور ۱۴۲ (۲) مکاتیب و رسائل، مکتوب ۹

تصوّف کیا ہے اور صُوفی کون لوگ ہیں

صوفیہ کے اقوال پیش کرنے سے پہلے یہ یاددہانی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ "تصوّف" اور "صوفی" کی اصطلاحیں بہت مشہور ہیں، لیکن صوفیۂ کرام اپنی کتابوں میں یہ بھی لکھتے آرہے ہیں کہ یہ دونوں لفظ قرآن و حدیث میں نہیں آئے ہیں اس لیے نہ "تصوّف" کا لفظ مطلوب ہے اور نہ "صوفی" کا لقب مقصود ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (م ۶۳۲) عوارف المعارف میں لکھتے ہیں:

> "پورب سے پچھم تک اسلامی ممالک کے دونوں کناروں میں اہلِ قرب کے لیے "صوفی" کا نام معروف و مشہور نہیں ہے۔ یہ نام انھیں لوگوں کے لیے معروف ہے جو خاص قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں۔ بلادِ مغرب، بلادِ ترکستان اور ماوراء النہر میں بہت سے اللہ کے مقرب بندے ہیں لیکن وہ "صوفیہ" سے موسوم نہیں ہیں کیونکہ وہ صوفیہ کا لباس استعمال نہیں کرتے اور الفاظ و اصطلاحات میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوفیہ سے ہماری مراد "مقربین" ہی ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ چھٹی، ساتویں صدی ہجری تک "صوفیہ" کے نام سے وہی لوگ جانے پہچانے جاتے تھے جو خاص قسم کا لباس پہنتے تھے لیکن بعد کو لباس کی قید اُٹھ گئی اور یہ نام اس طبقے کے لیے مشہور ہو گیا جس میں پیری مریدی کا سلسلہ جاری ہو اور وہ بزرگوں کے بارے میں غالیانہ عقیدت رکھتا ہو ـــــ

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء میں لکھا ہے:

علوم احسان ویقین کہ الیوم باسم   علوم احسان ویقین کہ آج کل تصوّف کے

تصوف مشہور شدہ ...... حقیقت تصوف کہ بعرف شرع نام آں احسان است۔ (۱)	نام سے مشہور ہو گئے ہیں .... تصوف کی حقیقت جس کا نام عرف شرع میں "احسان" ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ "تصوف" کوئی شرعی نام نہیں ہے بلکہ اس کا شرعی نام احسان ہے ——— بعض علمائے صوفیہ نے تصوف کو طریق تقویٰ کہا ہے اور تصوف کے لیے "تزکیہ نفس" کی اصطلاح تو اتنی ہی مشہور ہے جتنی خود تصوف کی اصطلاح ۔ بہر حال، علوم احسان و یقین کہئے یا طریق تقویٰ یا تزکیہ نفس یہ سب اس تصوف کی تعبیریں ہیں جس کی بنیاد کتاب و سنت پر قائم ہے اور جسے ہم اسلامی تصوف کہتے ہیں ۔

تصوف کو "احسان" کہنے کی وجہ وہ حدیث ہے جس میں حضرت جبریلؑ نے صحابۂ کرامؓ کے مجمع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے بارے میں چند سوالات کیے تھے اور آپؐ نے جوابات دیئے تھے۔ احسان کے بارے میں سوال و جواب کے الفاظ یہ ہیں :

قال فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک ۔ (۲)	مجھے احسان کے بارے میں بتایئے، حضورؐ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ حدیث تصوف کی بہت بڑی اصل ہے اور تصوف

---

(۱) ازالۃ الخفاء مقصد دوم ص ۱۴۲ (۲) ریاض الصالحین بحوالہ مسلم شریف

کی تمام مستند کتابوں میں اس سے استدلال کیا گیا ہے۔ تصوف اب ایک مستقل علم کا نام ہے اس لیے اس کی تعریف یہ کی گئی ہے:

التصوف علم تعرف به احوال تزکیۃ النفوس وتصفیۃ الاخلاق وتعمیر الظاہر والباطن لنیل السعادۃ الابدیۃ۔ (۱)

تصوف ایک علم ہے جس سے نفوس کی پاکی، اخلاق کی صفائی اور ظاہر و باطن کی آبادی و آراستگی کے احوال معلوم ہوتے ہیں اور اس کا مقصد ابدی سعادت کا حصول ہے۔

اس عبارت میں علم تصوف کی فنی تعریف بھی کی گئی ہے اور اس کی غرض وغایت بھی بتائی گئی ہے۔ ائمہ صوفیہ اپنی کتابوں میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں) اور حضور ؐ نے فرمایا ہے من عمل بما علم ورثہ اللہ علم ما لم یعلم (آدمی جو کچھ جانتا ہے جب اس پر عمل کرتا ہے تو اللہ اسے ایسی باتوں کا علم عطا کرتا ہے جنھیں وہ نہیں جانتا تھا) صوفیہ کہتے ہیں کہ علم الوراثۃ دین میں فہم و بصیرت کا نام ہے اور اسی کو قرآن میں "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ط وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝ (البقرہ، ۲۷۰)

وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا گر یاد دہانی وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

اب میں تصوف اور صوفی کے بارے میں ائمہ تصوف کے چند اقوال نقل کرتا ہوں:

---

(۱) شیخ الاسلام زکریا انصاری، شرح الرسالۃ القشیریہ ج ۱ ص ۶۹

" میں نے محمد بن احمد بن یحییٰ صوفی کو کہتے ہوئے سُنا، وہ کہتے ہیں
کہ میں نے عبداللہ بن تمیمی کو کہتے ہوئے سُنا کہ ابو محمد جریری سے تصوّف
کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ تصوّف ہر بلند اخلاق میں
داخل ہونے اور ہر پست اخلاق سے خارج ہونے کا نام ہے۔ بلند اخلاق
جیسے ورع، زہد، توکّل، رضا اور تفویض وغیرہ اور پست اخلاق جیسے ریا،
عُجب، کبر، حسد اور بدگمانی وغیرہ۔ (۱)

امام قشیری نے اپنی کتاب کے " باب التصوّف " میں خود اپنی سند سے سب سے
پہلے یہی قول نقل کیا ہے، اس قول کا حاصل یہ ہے کہ ہر بلند اخلاق سے آراستگی اور
ہر پست اخلاق سے پاکی وصفائی ہی حقیقی تصوّف ہے۔

عمرو بن عثمان مکی رح سے تصوّف کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے
کہا:

" تصوّف یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اسی کام میں مشغول ہو جو اللہ تعالیٰ
کے نزدیک اس وقت کے لیے بہترین اور مناسب ترین ہو۔"

شارحین نے اس جملے کی تشریح میں لکھا ہے کہ صوفی کی شان یہ ہے کہ وہ مختلف
اوقات میں اعمال، اخلاق، احوال اور ہر عمل خیر میں سے اسی کو اختیار کرتا ہے
جو اس وقت کے لحاظ سے افضل ترین واکمل ترین شے ہو اور جس کے ذریعہ
زیادہ سے زیادہ اللہ کی رضا حاصل کی جا سکتی ہو۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں
میں یہ ہوا کہ ہر وقت، اس کے عمل کی بنیاد کتاب وسنّت کے احکام پر ہوتی ہے

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ مع شرح ج ۲ ص ۱۳۴

کیونکہ انھیں کے ذریعہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ مختلف اوقات میں کون سی چیز سب سے زیادہ مناسب ہے، افسوس کہ اس زمانے کے اکثر صوفیہ نے تصوّف کی اس حقیقت کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔

حضرت معروف کرخیؒ نے فرمایا ہے کہ:

"تصوّف یہ ہے کہ آدمی حقائق کو اختیار کرے اور مخلوق کے پاس جو کچھ ہے اس سے مایوس ہو جائے"

اس کی تشریح میں شیخ الاسلام زکریا انصاری لکھتے ہیں:

"جسے اللہ کی معرفت حاصل ہو اور وہ یہ جان لے کہ اللہ کے سوا کوئی نافع، ضار اور معطی نہیں ہے، نفع و ضرر اور عطا و بخشش صرف اس کے دست قدرت میں ہے، ایسا شخص یقیناً انھیں اعمال کو اختیار کرے گا جو اللہ سے قریب کرنے والے ہیں اس کی نظر ان چیزوں پر نہ ہوگی جو مخلوق کے قبضہ و تصرف میں ہیں، اس کا اعتماد صرف اللہ پر ہوگا اور کسی پر نہیں"،

حکایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک بادشاہ کے وزیر کو اللہ نے توفیق بخشی اور وہ بادشاہ کے دربار سے کنارہ کش ہو گیا، بادشاہ نے اُسے پکڑ بلوایا اور دھمکی کے انداز میں کہا، کیا تو مجھ سے بھاگتا ہے؟ وزیر نے کہا، ہاں اس لیے کہ میں نے تم سے بہتر بادشاہ کو پالیا ہے۔ بادشاہ کا غصّہ اور بڑھا اس نے پوچھا مجھ سے بہتر بادشاہ کون ہے؟ وزیر نے جواب دیا وہ بادشاہ تم سے بہتر ہے جو مجھے کھلاتا ہے مگر اسے خود کھانے کی ضرورت نہیں اور تمہارا حال یہ ہے کہ جب تک تمہیں کھلایا نہ جائے تم مجھے کھلا نہیں سکتے، تم سے بہتر وہ بادشاہ ہے جو مجھے سُلاتا ہے لیکن خود اُسے نیند نہیں آتی اور تمہارا حال یہ ہے کہ جب تک تم سو نہ جاؤ میں سو نہیں سکتا،

تم سے بہتر وہ بادشاہ ہے کہ میری خطائیں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں وہ مجھے معاف فرما دیتا ہے لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ معمولی قصور پر بھی مواخذہ کرتے ہو، تم سے بہتر وہ بادشاہ ہے کہ جب میں اس کی خدمت میں لگا تو سارا عالم وجود میری خدمت کرنے لگا اور تمہاری خدمت کا حال یہ تھا کہ میں مجبور تھا کہ تمہارے ہر مقرب کی خدمت کروں تاکہ وہ تمہارے پاس مجھے اذیت نہ پہنچائے۔ یہ سن کر بادشاہ نے جواب دیا۔ تم نے سچ کہا۔ بے شک وہ مجھ سے بہتر ہے اس کی چوکھٹ سے چمٹ جاؤ اور اس کی اطاعت کو غنیمت سمجھو۔ (۱)

شیخ الاسلام کی یہ تشریح اور یہ حکایت کتنی مؤثر اور دل نشین ہے۔
ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا:

"التصوف ذکر مع اجتماع ووجد مع استماع وعمل مع اتباع	تصوف اجتماع کے ساتھ ذکر، استماع کے ساتھ وجد اور اتباع کے ساتھ عمل کا نام ہے۔

شارحین اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "اجتماع" سے مراد اجتماع ہمت ہے، ذکر مع اجتماع کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا ذکر پورے حضور قلب اور حسن نیت کے ساتھ کیا جائے کیونکہ غفلت مذموم ہے اور عمل، حسن نیت ہی سے صحیح ہوتا ہے، "وجد" تصوف کی اصطلاح میں جذبۂ اشتیاق و محبت کی زیادتی کو کہتے ہیں اور استماع سے مراد کسی ایسی چیز کا سننا ہے جو اس جذبے میں تحریک پیدا

---

(۱) شرح رسالہ باب التصوف۔

کرتی ہے۔ وجد مع استماع کا مطلب یہ ہوا کہ مؤثر مواعظ یا ایسی باتیں سُن کر جن کی سند کتاب و سنّت میں موجود ہو، جذبۂ شوق میں زیادتی اور تحریک پیدا کی جائے۔ "عمل مع اتباع" میں اتباع سے مراد اتباعِ سنّت ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر عمل سنّت کے مطابق ہو، کیونکہ ہر وہ عمل، یا حال یا مقام جو اتباعِ سنّت سے خالی ہو، بدعت ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے صحبت یافتہ ابوبکر کتانی نے کہا ہے:

"تصوّف اخلاق جمیلہ سے آراستگی کا نام ہے جو شخص تم سے اخلاق حسنہ میں بڑھا ہوا ہے وہ تم سے صفائے قلب اور تصوّف میں بڑھا ہوا ہے۔" (۱)

ذوالنّون مصریؒ سے اہلِ تصوّف کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب میں کہا:

"یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ عزّ و جل کو ہر دوسری شے پر ترجیح دی تو اس کے صلہ میں اللہ تعالےٰ نے انھیں ہر دوسری شے پر ترجیح عطا فرمائی۔"

محشّیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ کو ہر دوسری شے پر ترجیح دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مرضیات اور پسندیدہ چیزوں کو اس کی نامرضیات اور ناپسندیدہ چیزوں پر ترجیح دی جائے اور انھیں دوسری چیزوں پر ترجیح دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ان کے عمل کے مطابق ان کا درجہ مقرر فرماتا ہے۔

یہ ہے اسلامی تصوّف کی حقیقت جسے فلسفیانہ تصوّف نے انتہائی پیچیدہ اور ناقابلِ قبول بنا دیا ہے۔

---

(۱) شرح رسالہ باب التصوف۔

کشف و کرامت و الہام محتاج دلیل ہیں

اب تک جو تفصیل پیش کی جا چکی، اس سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سلوکِ باطن کی راہ بھی دین ہی کی روشنی میں طے کی جا سکتی ہے، اس روشنی کے بغیر یہ راہ خطرات سے بھری ہوئی ہے، اگر اللہ و رسولؐ کے احکام، دینی حقیقتیں اور اس کے مسلّمات نظر سے اوجھل ہوں یا اوجھل کر دیے جائیں تو اسلامی تصوف، ملحدانہ تصوف کا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ جب جاہل اور مکار صوفیوں نے کشف و کرامت، وارداتِ قلبی اور الہامات، غیر شرعی حقائق اور خدا رسیدگی کے دعوے کر کے لوگوں کو گمراہ کرنا شروع کیا تو علمائے حق اور صوفیۂ صدق کو پوری قوت سے یہ بتانا پڑا کہ اصل شے شریعت، احکامِ الٰہی کی تعمیل اور اس پر استقامت ہے، یہ نہ ہو تو تمام دعوے غلط اور گمراہ کن ہیں۔ اصل کسوٹی کتاب و سنت ہے، اس پر جانچے اور پرکھے بغیر کوئی چیز قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس طرح کی صراحتیں پہلے بھی گزر چکی ہیں اور ہم یہاں خاص طور سے اس سلسلے کی چند صراحتیں نقل کر رہے ہیں۔

ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی (م ۲۶۱ھ)

> اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے کرامتیں دی گئی ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگا ہے تو اس سے دھوکا نہ کھاؤ جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ امر و نہی، حدود کے تحفظ اور ادائے شریعت کے معاملہ میں تم اس کو کیسا پاتے ہو۔ (۱)

اس قول کی شرح کرتے ہوئے، شیخ الاسلام لکھتے ہیں:

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ

بسطامیؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ کرامت تو وہ شے ہے جو
صاحبِ کرامت کے ان کاموں میں مددگار ہوتی ہے جو اللہ سے
قریب کرنے والے ہیں وہ اس کے یقین کو قوی کرتی اور اللہ کی محبت
ورضا پر اسے ثابت قدم رکھتی ہے لہذا جب کوئی خارقِ عادت شے
کسی بندے سے ظاہر ہو لیکن شریعت اس کی استقامت پر گواہ
نہ ہو تو ایسا شخص مکروفریب اور دھوکے میں مبتلا ہے (۱)

ابوسلیمان عبدالرحمٰن بن عطیۃ الدارانی (م ۲۱۵) کا ارشاد:

میں نے جنید بغدادیؒ کو کہتے ہوئے سنا کہ ابوسلیمان دارانیؒ
فرماتے ہیں: بسا اوقات صوفیہ کے لطائف و نکات میں سے کوئی
نکتہ کئی دنوں تک میرے دل میں آتا رہتا ہے لیکن میں اس وقت
تک اس کو قبول نہیں کرتا جب تک دو شاہدِ عدل کتاب وسنّت،
اس کی صحت پر گواہی نہ دیں۔ (۲)

ابوالحسن احمد بن محمد النوری (م ۲۹۵ھ) کہتے ہیں:

جس شخص کو تم دیکھو کہ وہ اللہ کے ساتھ اپنی کسی ایسی حالت کا
دعویٰ کررہا ہے جو اسے علمِ شرعی کی حد سے باہر نکالنے والی ہے تو
اس کے قریب بھی نہ پھٹکو کیونکہ وہ بدعتی ہے۔ شریعت جس کے افعال
واقوال کی صحت پر گواہ نہ ہو وہ مبتدع ہے اگرچہ اس سے خارقِ عادات
باتیں صادر ہو رہی ہوں کیونکہ یہ اس کے ساتھ ایک طرح کا مکر ہے (۳)

ابومحمد رویم بن احمد (م ۳۰۲ھ) کہتے ہیں:

---

(۱) احکام الدلالۃ شرح الرسالۃ ج۱ ص ۱۰۹ (۲) رسالہ قشیریہ مع شرح ج۱ ص ۱۱۴ (۳) ایضاً ۱۵۰

"صوفیہ کا علم روح کو صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہوتا" روح کو صرف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ طاعات کی تعمیل اور شہوات سے اعراض میں اپنی پوری کوشش لگا دی جائے، رویم نے کہا: اگر تم اس وصف کے ساتھ اس راہ میں آنا چاہو تو ٹھیک ہے ورنہ اپنے آپ کو صوفیہ کی یاوہ گوئی میں مشغول نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عمل کے بغیر محض صوفیہ کے اقوال اور ان کے واقعات یاد کرنے اور ان کے باطل طریقوں اور اعمال سے خالی بکواس میں مشغول ہونے سے حقیقی تصوف حاصل نہیں ہوتا۔ (۱)

حضرت رویم کا یہ قول دیکھیے اور آج کل کے "صوفیہ" کو دیکھیے۔ نوے فیصد ایسے ہی لوگ ہیں جو صوفیہ کے اقوال اور ان کے واقعات یاد کر کے اور ان کی لایعنی باتوں میں مشغول ہو کر "صوفی" اور "صحیح العقیدہ" مسلمان بنے ہوئے ہیں اور ان کے مقابلے میں جو لوگ فرائض و واجبات کے پابند اور معاصی سے پرہیز کرنے والے ہیں انھیں تصوف کا منکر اور بدعقیدہ قرار دیا جا رہا ہے۔

ابوسعید احمد بن عیسیٰ الخراز (م ۲۷۷) کہتے ہیں:

"ہر باطن، جس کا ظاہر مخالف ہے باطل ہے"۔ باطن سے مراد وہ بات ہے جو دل میں آتی ہے اور ظاہر سے مراد شریعت ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ دل کی جس بات کو شریعت صحیح قرار نہ دے وہ باطل ہے۔ (۲)

اس کے قریب سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانی کا یہ قول بہت مشہور ہے:

---

(۱) العناصر ۱۵۳ (۲) ایضاً ۱۶

وکل حقیقۃ ردتہا شریعۃ فہی زندقۃ۔ (۱)

اور ہر حقیقت، جسے شریعت رد کر دے وہ بے دینی ہے۔

اس جامع اور بلیغ جملے کی شرح میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے:

"اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر حکم شریعت کے خلاف کسی پر کوئی کشف ہوا اور وہ دعویٰ کرے کہ اسے اس کا حکم دیا گیا ہے تو یہ دعویٰ باطل ہے اور اگر وہ اس کے صحیح ہونے کا اعتقاد کرے تو کافر اور بے دین ہو جائے گا، نعوذ باللہ من ذٰلک۔ (۲)

شیخ جیلانیؒ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

فان خطر خاطر او وجد الہام فاعرضہما علی الکتاب والسنۃ۔ (۳)

اگر دل میں کوئی خیال آئے یا کسی بات کا الہام ہو تو انھیں کتاب و سنت پر پیش کرو۔

یہ قاعدۂ کلیہ بیان کر کے شیخ جیلانی قدس سرہٗ نے اس کی کچھ مثالیں پیش کی ہیں، سب کا حاصل یہ ہے کہ غیر نبی کا الہام دلیلِ شرعی نہیں ہے، دلیلِ شرعی کتاب و سنت ہی ہیں یہی دونوں فیصلہ کریں گے کہ وہ الہام قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہے یا نہیں۔

ان عبارتوں سے واضح ہوا کہ کرامت ہو یا کشف یا الہام یا کوئی بھی خواب و خیال، جب تک کتاب و سنت ان کے صحیح ہونے پر گواہی نہ دیں وہ لائق اعتبار بھی نہیں ہیں، ان کا قابلِ عمل ہونا تو دور کی بات ہے۔

---

(۱) فتوح الغیب مع شرح ص ۷۶ (۲) شرح فتوح الغیب ص ۷۶ (۳) فتوح الغیب ص ۷۲

اولیاء اللہ کون لوگ ہیں

چونکہ اولیاء اللہ کے بارے میں مبالغہ آمیز عقیدے ذہنوں میں موجود ہیں اس لیے دیکھ لینا چاہیے کہ خود اللہ تعالٰے کے نزدیک اس کے ولی کون لوگ ہیں۔

عربی زبان میں وَلِیَ یَلِیُ کے معنی ہیں کسی شے سے قریب ہونا، مثلاً جب بولتے ہیں " ہذا یلی ہذا " تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ شے اس شے کے قریب ہے، اسی سے ولایت ہے جس کی اصل محبت و قرب ہے۔ ولایت کی ضد عداوت ہے جس کے اصل معنی بغض اور دوری کے ہیں لفظ ولی اسم فاعل ہے اس کے معنی ہیں قریب اور دوست، اولیاء، ولی کی جمع ہے۔ عربی کے مشہور لغت قاموس میں ہے:

" وَلِیٌ " کے معنی قرب اور نزدیکی کے ہیں۔ پے در پے بارش بھی اس کے معنی میں داخل ہے۔ وَلِیٌ اسی مصدر کا اسم ہے ولی کے معنی مُحب، دوست اور مددگار کے بھی ہیں " تَوَلّاہُ " کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس کو اپنا دوست بنا لیا، " دارہ ولی داری " کے معنی یہ ہیں کہ اس کا گھر میرے گھر کے قریب ہے "

مصباح منیر میں اس لفظ کی لغوی تشریح یہ کی گئی ہے:

" ابن الاعرابی نے کہا ولی کے معنی محبت کرنے والے اطاعت گزار کے ہیں، موالات، معادات کی ضد ہے اور ولی، عدو کی ضد ہے اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے معنی بیان کرتے ہوئے ابو اسحاق نے کہا اللہ مومنوں کا ولی ہے ان کی طرف سے دشمن کو جواب دیتے ہیں، ان کو ہدایت دینے میں ! ان کے لیے دلیل قائم

کرنے میں اس لیے کہ اللہ ایمان کی زیادتی کے ساتھ ہدایت میں بھی اضافہ کرتا جاتا ہے جیسا کہ خود ہی فرمایا ہے: "جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے" نیز یہ کہ اللہ، مومنوں کا ولی ہے ان کے دشمنوں پر مدد کرنے میں اور ان کے مخالفوں کے دین پر ان کے دین کو غالب کرنے میں"۔

ولایت کے معنی نصرت اور محبت دونوں ہی آتے ہیں۔ مُغرِب میں ہے:

"وِلایت اور وَلایت کے معنی نصرت اور محبت ہیں"

عربی لغت اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وَلی کا لفظ حسبِ ذیل معانی میں استعمال کیا جاتا ہے:

(۱) قریب (۲) دوست (۳) بااختیار نگرانِ کار (۴) کارساز، (۵) مددگار (۶) تابع و مطیع (۷) ساتھی (۸) وارث۔

ان تمام معانی پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ محبت اور قرب لفظ ولی کا اساسی معنی و مفہوم ہے اور اسی مناسبت سے دوسرے معانی بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ان الگ الگ معانی کے لیے ولی اور اولیاء کا لفظ قرآن میں کم استعمال ہوا ہے البتہ یہ لفظ ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے قرآن میں زیادہ آیا ہے اور اس کا استعمال چار صورتوں میں ہوا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کا ولی ہے (۲) اللہ کے مومن بندے اس کے اولیاء ہیں (۳) شیطان کافروں اور مشرکوں کا ولی ہے (۴) کافر و مشرک شیطان کے اولیاء ہیں۔

اللہ تعالیٰ جب اپنے آپ کو مومنوں کا ولی کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ ان کا دوست ہے، اس کی رحمت ان سے قریب ہے۔

وہی ان کا کارساز و مددگار، وہی ان کا رفیق اعلیٰ اور اسی کی بااختیار نگرانی ان کی محافظ ہے اور وہ جب مومنوں کو اولیاء اللہ قرار دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مومن بندے اس کی محبت کے متوالے، اس کی رحمت و نظرِ عنایت کے آرزومند، اس کی نصرت و کارسازی پر بھروسہ کرنے والے، اس کے اشاروں پر چلنے والے، اس کی رفاقت کے جویاں اور اس کی مرضیات میں اپنی مرضیات گم کر دینے والے ہیں۔

شیطان کافروں کا ولی ہے اور کافر اس کے اولیاء ہیں، اس کا مفہوم یہ ہے کہ شیطان اللہ کے بندوں کو بہکا کر اپنا بندہ بناتا ہے، انھیں خدا سے کاٹ کر اپنے ساتھ جوڑ لیتا ہے اور پھر یہ نافرمان اور باغی بندے اسی کو اپنا دوست اور اپنا حاکم سمجھتے اور اسی کی اطاعت میں لگے رہتے ہیں۔

اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان، یہی دو گروہ ہیں جن کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے اور یہ دنیا انھیں دو گروہوں کی معرکہ آرائیوں کا میدان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جس گروہ کو پسند کریں اس میں داخل ہو جائیں۔ اس سلسلے کی چند آیتوں کے ترجمے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

۱۔ "اللہ ایمان والوں کا ولی ہے، انھیں اندھیروں سے روشنی میں نکال لاتا ہے۔" (البقرہ: ع ۳۴)

۲۔ "ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو جنھوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس کے زیادہ حق دار ہیں اور اللہ صرف انھیں کا ولی ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔" (آلِ عمران ۷ع)

۳۔ "اللہ کے سامنے وہ ہرگز تیرے کام نہ آئیں گے اور ظالم ایک دوسرے کے ولی ہیں اور اللہ متقیوں کا ولی ہے۔"
(الجاثیہ ۲)

۴۔ "اگر تمہارا گمان ہے کہ تمام دوسرے لوگوں کے مقابلے میں تم اللہ کے اولیاء ہو تو موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو۔"
(الجمعہ ۱۶)

۵۔ "جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے ان کے اولیاء طاغوت ہیں انھیں روشنی سے اندھیروں میں نکال لیجاتے ہیں۔"
(البقرہ ۲۴۶)

۶۔ "ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا دوست بنادیا ہے جو ایمان نہیں لائے۔"
(اعراف ۳۶)

۷۔ "مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں پس شیطان کے اولیاء سے لڑو، اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔"
(النساء ۱۰۶)

ان آیتوں میں ولی اور اولیاء کے الفاظ ایک جامع اصطلاح کی طرح استعمال ہوئے ہیں۔ اولیاء کا لفظ سورۂ یونس میں بھی استعمال ہوا ہے اور ہمارے موضوع کے لیے وہی سب سے زیادہ اہم ہے:

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ۝ لَھُمُ الْبُشْرٰی	سنو، اللہ کے اولیاء کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کا رویہ اختیار کیا،

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۭ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ۭ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ؀ (یونس ۶۴)

دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں یہی بڑی کامیابی ہے۔

کتب تصوف میں ان آیتوں کو اولیائے امت رحمہم اللہ کی ولایتِ خاصہ کے لیے بجا طور پر، بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ ان آیتوں نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ اللہ کے ولی کون لوگ ہیں۔ ان میں اولیاء کی تعریف بھی ہے اور ان کے دنیوی و اُخروی اجر کا ذکر بھی۔ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ" اولیائے خاص کی تعریف ہے۔ اس میں دو جز ہیں ایمان اور تقویٰ۔ ایمان کے بغیر کوئی شخص اللہ کا ولی نہیں ہو سکتا اور تقوی کے بغیر لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ کے مژدۂ جاں بخش کا استحقاق پیدا نہیں کرتا۔ اللہ کا تقرب اور اس کے نزدیک عزت حاصل کرنے کا ذریعہ تقویٰ ہے، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے) حاصل یہ نکلا کہ متقی مومن ہی اللہ تعالیٰ کے اولیائے خاص ہیں۔ جن لوگوں نے تصوف کو طریقِ تقویٰ کہا ہے غالباً ان کے سامنے یہی آیتیں رہی ہیں — یہاں اجمالاً یہ لکھنا کافی ہے کہ قرآن نے جس تقوی کا مطالبہ کیا ہے اور جو دعوتِ انبیاء کا مدار کار ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر رکھے اور ہمیشہ اس بات سے ڈرتا رہے کہ اگر اس نے اللہ کی قائم کی ہوئی کسی حد کو توڑا یا اس کی مقرر کی ہوئی کسی سرحد کو پھاندا تو اس کو خدا کی سزا سے بچانے والا کوئی نہیں ہو سکتا الا یہ کہ خود خدا ہی رحم کرے۔

مومنین متقین کی صفات قرآن مجید میں تفصیل سے موجود ہیں۔ یہاں چند آیتوں کے ترجمہ پیش کیے جاتے ہیں۔ اصل آیتیں قرآن میں مطالعہ کی جائیں۔ سورۂ بقرہ رکوع ۲۲ آیت ۱۷۷ کا مطالعہ کیجئے اس کا ترجمہ یہ ہے:

"نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخرت کو اور ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اُسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں، یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔"

اس آیت نے پرہیزگاروں کو ناپرہیزگاروں سے بالکل الگ کر دیا ہے اور تقویٰ کی حقیقت پر دن کی روشنی پھیلادی ہے، سب سے پہلے اس نے اس غلط فہمی کو دُور کیا ہے جو تقویٰ کے متعلق اہلِ کتاب میں پیدا ہوگئی تھی انھوں نے مذہب کی چند آسان اور سہل رسموں کی پابندی اور چند خود ساختہ ظاہر دین داری کو اصل تقویٰ سمجھ رکھا تھا، قرآن نے مثال کے طور پر کہا کہ نیکی اور اعلیٰ درجہ کی نیکی یہ نہیں ہے کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھ لو اور اپنے آپ کو متقی سمجھنے لگو۔ بلکہ اصل نیکی یہ ہے اور حقیقی متقی یہ لوگ ہیں۔ اس آیت میں پہلے ان بنیادی عقائد پر یقین و اذعان کو نیکی قرار دیا گیا ہے جن کے بغیر کبھی کو تقویٰ کی [illegible] ابھی نہیں لگ سکتی اور پھر مثال کے طور پر چند بنیادی اعمال [illegible]نات کا

ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ کے بتائے ہوئے مصارف میں انفاقِ مال، اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، ایفائے عہد، مشکلات اور حق و باطل کی جنگ میں صبر۔ یہ ہیں وہ بنیادی اعمال و صفات جن کے بغیر راست بازی اور تقویٰ کا خیال بھی لغو ہے۔ حق و باطل کی جنگ میں صبر کی حقیقت یہ ہے کہ حق کو قائم رکھنے، حق کی حمایت کرنے اور حق کو قائم و نافذ کرنے میں انسان ہر مصیبت برداشت کرے اور باطل کی ہر چوٹ سہ لے مگر اپنے مقصد اور نصب العین میں سستی اور بزدلی نہ دکھائے اگر یہ صفت اس میں نہیں ہے تو وہ راست باز اور متقی نہیں ہے چاہے اپنے آپ کو یہودیوں کی طرح متقیوں کا امام ہی کیوں نہ سمجھتا رہے ——————

سورۂ زمر ع ۴ میں فرمایا:

"اور جو سچی بات لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی لوگ متقی ہیں ان کے لیے وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہیں، اپنے رب کے پاس یہ بدلا ہے محسنوں کا۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ متقی اور محسن وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دعوئے اسلام میں سچے اور اپنے ایمان میں پختہ ہوں۔ سچے اسلام اور پختہ ایمان کے بغیر تقویٰ اور احسان کا درجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ان دو مقامات پر قرآن نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ یہی لوگ متقی ہیں۔ اب چند ایسے مقامات پیش کیے جاتے ہیں جن میں متقیوں کی کچھ اور مزید صفتوں کا ذکر ہے:

"یہ (متقین) وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ مالک ہم ایمان لائے پس ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچالے۔ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں، راست باز فرماں بردار اور خدا کے راستے

میں خرچ کرنے والے ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے
مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔" (آل عمران ع ۲)

اللہ پر سچا ایمان، قول و عمل میں سچائی، مصائب و مشکلات میں صبر، اللہ کی فرماں برداری اور اپنے مال میں فیاضی، ان تمام صفات کے باوجود ان کے تواضع و انکسار اور ان کے عجز و نیاز کا حال یہ ہے کہ رات کے پچھلے پہر، اطاعت و فرماں برداری میں تقصیر کی معافی مانگا کرتے ہیں، یہ ہے اصل تقویٰ اور یہ ہیں حقیقی متقی ــــــــ سورۃ الاعراف میں ہے:

"خدا نے فرمایا میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے پس میں ان لوگوں کے لیے رحمت لکھ دوں گا جو تقویٰ کی روش اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے، وہ اس رسول کی پیروی کریں گے جو نبیِ اُمّی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے، وہ انھیں نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھیرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ اس پر ایمان لائے، اس کی تقویت کا باعث ہوئے (دشمنان حق کے مقابلہ میں اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے تو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں۔" (الاعراف ۱۹ع)

ان آیتوں میں ایمان اور تقویٰ کو ان لوگوں کے اندر محصور کر دیا گیا ہے

جو اللہ کے آخری نبی، نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والے ہیں اللہ کی رحمت اور فلاح انھیں لوگوں کے لیے ہے جو آپؐ پر ایمان لائیں، آپؐ کی تقویت کا باعث ہوں، آپؐ کی مدد کریں اور قرآن کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں، نزولِ قرآن اور آخری نبی کی بعثت کے بعد ایمان اور تقویٰ کا وجود ممکن ہی نہیں جب تک یہ باتیں نہ پائی جائیں اور جس میں یہ باتیں پائی جائیں اس کو اپنے اندر اس سے الگ نہ کوئی اور صفت پیدا کرنے کی ضرورت اور نہ اُسے کسی دوسری طرف رُخ کرنے کی حاجت۔ اللہ کی ولایتِ خاصہ اس کے حصے میں ہے، چاہے اس کے اندر وہ مظاہر تقویٰ نہ پائے جاتے ہوں جنھیں بہت بعد کو لوگوں نے مظاہر تقویٰ قرار دے لیا ہے۔ نبیٔ امی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو ان پھندوں سے نجات دلائی جنھیں خود انھوں نے اپنے گرد تن لیا تھا اب اگر پھر وہ ان پھندوں کو اپنے گرد ڈال رہے ہیں تو یہ ان کی خطا ہے اور اگر وہ انھیں پھندوں کو تقویٰ اور ولایت سمجھ رہے ہیں تو یہ خود ان کا اپنا قصورِ فہم ہے۔

یہودیوں نے جو بوجھ اپنے سروں پر لاد لیا تھا اور جو پھندے اپنے گرد کس لیے تھے وہ کیا تھے؟ مولانا ابوالکلام تحریر فرماتے ہیں:

> یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کون سے تھے جن سے قرآن نے رہائی دلائی؟ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے۔ مذہبی احکام کی بے جا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل پابندیاں، ناقابلِ فہم عقیدتوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں، یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں جنھوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے دل و دماغ مقید کر دیے تھے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی دعوت نے ان سب سے نجات

دلائی، اس نے سچائی کی ایسی سہل اور آسان راہ دکھادی جس میں
عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں، عمل کے لیے کوئی سختی نہیں؛
حنیفیۃ السمحۃ لیلہا کنہارہا۔
افسوس جن پھندوں سے قرآن نے اہلِ کتاب کو نجات دلائی
تھی، مسلمانوں نے وہی پھندے پھر اپنے گلوں میں ڈال لیے (۱)

متقین کی صفات اور تقویٰ کے بیان سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ نمونے کے طور پر چند آیتوں کے ترجمے پیش کیے گئے، اسی نوع کی دوسری آیتیں بھی آپ کو ملیں گی۔ کتاب و سنّت میں "اولیاء اللہ" کی نہ کوئی خاص ہیئت بیان کی گئی ہے اور نہ ان کا کوئی خاص لباس پیش کیا گیا ہے؛ نہ ان کے اندر مافوق البشر کسی طاقت کی نشان دہی کی گئی ہے اور نہ "اولیاء اللہ" کے نام کو کسی خاص طبقے کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔

اب یہ بھی دیکھ لیں کہ درجات کے اعتبار سے "اولیاء اللہ" کی تقسیم کیا ہے؟۔ قرآن کریم میں اللہ ورسولؐ کے فرماں بردار مومنوں کے لیے کئی تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ اس گروہ کو مجرمین کے گروہ سے علیحدہ کرنے کے لیے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے) کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی اجمال میں درجات کی ساری تفصیل بند ہے۔ اس میں ادنیٰ درجہ کے نیکوکار مسلمان بھی داخل ہیں اور اعلیٰ درجہ کے مومنین متقین بھی۔ انھیں لوگوں کے لیے کہیں اولیاء اللہ، کہیں حزب اللہ، اور کہیں اصحاب الجنّۃ کی تعبیریں بھی اختیار کی گئی ہیں، مومنین صالحین کے گروہ کی اصلاً دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

---

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن ج۲

مقربین[1]، ابرار[2] ۔ مقربین کی تعبیر کہیں "السابقون" اور کہیں "سابقون بالخیرات" سے بھی کی گئی ہے ۔ اسی طرح ابرار کو اصحاب الیمین اور مقتصد کے الفاظ سے بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ ان دونوں قسموں کی صفات اور آخرت میں ان کی جزا کا علم حاصل کرنے کے لیے فاطر، واقعہ، دہر اور مطففین کی سورتیں مطالعہ کرنی چاہئیں ۔ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" ہی کی ایک اور تقسیم قرآن میں پائی جاتی ہے ۔ انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین ۔ لیکن درحقیقت یہ چار قسمیں بھی انھیں دو قسموں میں داخل ہیں ۔ اللہ کی کتاب نے مقربین و ابرار کی صفات و خصوصیات کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے اور کوئی قابل ذکر بات چھوڑی نہیں ہے ۔ " اولیاء اللہ " کی صفات و خصوصیات اور ان کا مرتبہ جاننے کے لیے، قرآن کریم بالکل کافی ہے اور نہ صرف یہ کہ بالکل کافی ہے بلکہ وہی آخری سند بھی ہے اور وہی کامل معیار بھی ہے، جس کے پاس قرآن کی سند نہیں اور جو اس معیار پر کھرا نہیں وہ کچھ اور ہو تو ہو اللہ کا ولی نہیں ہے ۔ "کَرَامَاتُ الْاَوْلِیَاءِ حَقٌّ" کے تحت عقائد کی کتابوں میں بھی ولایت اور ولی کی تعریفیں لکھی گئی ہیں ۔ مثلاً شرح عقائد نسفی میں ہے :

"ولی وہ ہے جو بقدر امکان اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کا عارف ہو، طاعتوں پر مواظبت کر رہا ہو، معاصی سے بچ رہا ہو اور لذات و شہوات میں انہماک سے روگرداں ہو ۔"

اس تعریف میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کتاب و سنت کے خلاف ہو، اسی طرح بعض مقامات پر بعض صوفیہ نے بھی ولی کے متعلق صحیح اور صاف بات لکھی ہے ۔ علامہ شعرانی تحریر فرماتے ہیں :

" کرامات کا ظاہر ہونا ولایت کی شرط نہیں ہے، ولی ہونے کی شرط تو

صرف اللہ کے احکام کی تعمیل اور اس کے نواہی سے اجتناب ہے۔ اس کا معاملہ کتاب و سنت کے دلائل سے مضبوط ہونا چاہیئے، جو شخص ایسا ہو گا اس کی ولایت پر قرآن شاہد ہے اگرچہ کوئی ایک شخص بھی اس کا معتقد نہ ہو اور نہ اس کے پاس مریدوں کی جماعت ہو"۔ (۱)

علامہ عبدالوہاب شعرانی دسویں صدی ہجری کے مشہور، مستند اور اعلیٰ درجہ کے صوفی و عالم ہیں، ولی کے متعلق ان کی یہ صراحت صد فی صد صحیح ہے۔ ولی کے متعلق کتب تصوف میں جو مبالغہ آمیز باتیں لکھی گئی ہیں ہم یہاں ان سے صرفِ نظر کرتے ہیں اس لیے کہ ہماری اس کتاب کا موضوع مثبت طور پر اسلامی تصوف پیش کرنا ہے۔ غلط باتوں پر تنقید ہم نے دانستہ ترک کر دی ہے۔ (۲)

آخر میں رسالہ قشیریہ کی ایک عبارت پر یہ گفتگو ختم کرتا ہوں:

وبناء هذا الامر وملاكه على حفظ آداب الشريعة وصون اليد عن المد الى الحرام والشبهة وحفظ الحواس عن المحظورات وعد الانفاس مع الله سبحانه عن الغفلات (۳)	اس امر یعنی تصوف کی اساس اور دار و مدار حسب ذیل چیزوں پر ہے، آداب[۱] شریعت کی محافظت، حرام اور مشتبہ[۲] چیزوں سے پرہیز، ممنوعات[۳] سے اپنے حواس کی حفاظت، غفلتوں[۴] سے بچنے کے لیے ہر سانس میں خدا کی یاد۔

سید مصطفیٰ عروسی اپنی شرح "نتائج الافکار القدسیہ" میں لکھتے ہیں کہ ان چند الفاظ میں جو کچھ کہہ دیا گیا ہے وہ اس موضوع پر ضخیم کتابوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ ان الفاظ میں تصوف کے بلند سے بلند مقامات کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

---

(۱) الانوار القدسیہ فی بیان آداب العبودیۃ (۲) میں نے اپنی کتاب "اولیاء اللہ" میں اس پر مفصل گفتگو کی ہے۔

احوال ومقامات

تصوف کی کتابوں میں "حال" اور "مقام" کا ذکر آتا ہے اس لیے مناسب ہے کہ چند سطریں اس کے بارے میں بھی لکھی جائیں۔

کتب تصوف میں "مقام" اور "حال" کی متعدد تعریفیں اور تشریحیں کی گئی ہیں، ان سب کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ "مقام" اس مستقل کیفیت کو کہتے ہیں جو بندگیٔ رب میں سرگرمی اور جدوجہد کی وجہ سے انسان کی صفت راسخہ بن جاتی ہے۔ پھر وہ اس سے کسی اونچے مقام پر ترقی کرتا ہے اور "حال" اس غیر مستقل کیفیت کا نام ہے جو مختلف اوقات میں انسان پر طاری ہوا کرتی ہے۔ مثلاً "توکّل" مقام ہے اور "گریہ و بکا" حال ہے، توکّل ایسی کیفیت ہے جو ہمیشہ قائم رہتی ہے اور گریہ ایسی کیفیت ہے جو کبھی کبھی طاری ہوتی ہے اور بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ "حال" "مقام" کی ابتدائی کیفیت نام ہے وہی کیفیت جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو "مقام" بن جاتی ہے۔ صوفیہ نے اپنے اپنے علم وفہم اور ذوق کے مطابق "احوال ومقامات" کی تعیّن کی ہے۔ اور انھیں ترتیب کے ساتھ بیان کرکے اس کی تشریحیں کی ہیں، اسی لیے تعیّن وترتیب میں بھی فرق ہوا ہے اور ان کی تعداد میں بھی۔ اس معاملے میں بھی امام قشیری کے رسالے کو اہم ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ میں نے اصلاً اسی کو اپنے سامنے رکھا ہے اور دوسری کتابوں سے بھی مدد لی ہے۔

نیّت

امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں اخلاص سے پہلے ایک مستقل باب میں نیت پر مفصل گفتگو کی ہے، اس لیے کہ اخلاص کا تعلق نیت ہی سے ہے اور نیت کا محل قلب ہے۔ مناسب معلوم ہوا کہ ہم بھی پہلے نیت ہی پر گفتگو کریں۔ امام نوویؒ نے بھی ریاض الصالحین کی ابتدا نیت اور اخلاص ہی کے باب سے کی ہے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے:

"نیت، ارادہ، قصد۔ یہ تین الفاظ ایک ہی معنی کے لیے بولے جاتے ہیں۔ ہر عمل یعنی ہر اختیاری حرکت و سکون، تین چیزوں سے پورے ہوتے ہیں۔ علم، ارادہ اور قدرت۔ انسان اسی چیز کا ارادہ کر سکتا ہے جس کا اسے علم ہو، کسی چیز کو جانے بغیر اس کا ارادہ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح انسان کسی چیز پر عمل نہیں کر سکتا جب تک اس کا ارادہ نہ کرے۔ علم اور ارادے کے باوجود کوئی عمل وجود میں نہیں آسکتا جب تک انسان کو اس کی قدرت نہ ہو۔ مثلاً جس کے ہاتھ پاؤں مفلوج ہوں وہ علم و ارادہ کے باوجود نہ کسی چیز کو اٹھا سکتا ہے اور نہ کہیں جا سکتا ہے

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کسی چیز پر عمل کرنے کے لیے پہلے اس کا علم ضروری ہے، اس کے بعد اس کا ارادہ پیدا ہوتا ہے پھر اسے وجود میں لانے کی قدرت حاصل ہو تو وجود میں آتی ہے ـــــــــ یہیں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی چیز پر عمل کرنے کی نیت یا ارادہ و قصد کی غرض اور اس کا مقصد کیا ہے۔ نیت کا ایک تعلق تو اس کام سے ہوتا ہے جو کوئی شخص کرنا چاہتا ہے مثلاً نماز، روزہ، صدقہ و خیرات اور دوسرا تعلق اس غرض اور مقصد سے ہوتا ہے جس کے لیے انسان وہ کام کرنا چاہتا ہے۔ نماز پڑھنے کی غرض یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگ نمازی کہیں اور احترام کریں اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالٰے کے حکم کی تعمیل کی جائے اور وہ اس سے خوش ہو۔ باب اخلاص میں نیت کا لفظ اسی دوسرے تعلق کے لیے بولا جاتا ہے۔ نماز نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتی اور نماز نیت کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ پہلا جملہ لفظ نیت کے پہلے معنی کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرا جملہ اس کے دوسرے معنی کو۔

قرآن کریم میں ارادہ کا لفظ غرض اور مقصد کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ۔ (الانعام: ۵۲)	اور مت دور کر ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام چاہتے ہیں اسی کی رضا۔
اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ۔ (المائدہ: ۹۱)	شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں دشمنی اور بیر شراب اور جوا کے ذریعہ۔

ان دونوں آیتوں میں "ارادہ" غرض اور مقصد ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور یہی وہ نیت ہے جو کسی عمل کو عند اللہ مقبول یا مردود بناتی ہے۔

نیت پر اعمال کے ــــ مدار ہونے کا ثبوت حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

کی درج ذیل حدیث میں ہے جس کو احیاء العلوم اور تصوّف کی دوسری کتابوں میں بھی بطور دلیل پیش کیا گیا ہے :

"امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ اعمال کا اعتبار نیتوں سے ہوتا ہے اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی تو جس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے اس کی ہجرت اللہ و رسول ہی کی طرف ہوگی اور جس کی ہجرت کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہے تو وہ اسی کے لیے ہوگی جس کی طرف اس نے ہجرت کی (۱)

بخاری و مسلم کی یہ حدیث جس کی صحت پر تمام محدثین و علماء کا اتفاق ہے اہم ترین احادیث میں سے ایک ایسی حدیث ہے جس کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہیئے۔

اس حدیث کا سبب یا پس منظر یہ ہے کہ ایک شخص نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی اور اس کی غرض یہ تھی کہ وہاں ایک عورت سے شادی کرے۔ اسی موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ارشاد فرمائی تھی۔ اس عورت کا نام امّ قیس تھا۔ چنانچہ اس شخص کو "مہاجر امّ قیس" کہا جانے لگا (نووی)

اس حدیث شریف کی روشنی میں اختصار کے ساتھ میں نیت کے اہم اور ضروری پہلو پیش کرتا ہوں۔

---

(۱) ریاض الصالحین باب الاخلاص۔

۱۔ سب سے پہلی بات جان لینے کی یہ ہے کہ اس حدیث میں اعمال سے کون سے اعمال مراد ہیں۔ اعمال کی تین قسمیں ہیں۔ عبادات[1] وطاعات، مباحات[2]، سیئات[3]۔

عبادات وطاعات میں نیکی کے تمام کام داخل ہیں۔ مباحات میں ہر جائز کام شامل ہے اور سیئات میں تمام برائیاں داخل ہیں ـــــــ یہاں اعمال سے مراد پہلی دو قسموں کے اعمال ہیں۔ سیئات، یعنی معاصی اور برے اعمال یہاں مراد نہیں ہیں، کیونکہ کوئی برا عمل کسی اچھی نیت سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ فرض کیجئے کوئی ڈاکو، اس نیت سے لوگوں کے اموال پر ڈاکے ڈالے کہ جو مال حاصل ہوگا وہ غریبوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دے گا تو اس اچھی نیت کی وجہ سے اس کا عمل نیک اور اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس پہلو کی طرف امام غزالیؒ نے بھی توجہ دلائی ہے:

"برائیاں نیت کی وجہ سے اچھائیوں میں تبدیل نہیں ہو سکتیں، لہذا " اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ " کے عموم کی بنا پر کسی جاہل کو گمان نہیں ہونا چاہیئے کہ اچھی نیت کی وجہ سے معصیت، طاعت بن سکتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو خوش اور راضی کرنے کے لیے کسی کی غیبت کرے یا کسی دوسرے کا مال لے کر کسی فقیر کو کھلا دے یا کوئی مدرسہ، کوئی مسجد، کوئی مسافر خانہ، حرام سے بنائے اور نیت خیر کی کرے تو یہ سب جہل و نادانی کی بات ہوگی، ان کاموں کو اچھی نیت، ظلم، زیادتی اور معصیت ہونے سے خارج نہیں کر سکتی بلکہ جو چیزیں شرعاً ممنوع ہوں ان کو خیر کی نیت سے کرنا ایک دوسرا شر ہوگا۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے تو

وہ شریعت کا معاند (دشمن) ہے اور اگر نہیں جانتا تو اپنے جہل کی وجہ سے گنہگار ہے کیونکہ خیر و شر کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے" (۱)

۲۔ اچھی اور بُری نیت کا سوال طاعات و عبادات اور مباحات ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ طاعات و عبادات کی صحت اور عنداللہ مقبولیت ، دو چیزوں پر موقوف ہے۔ حُسنِ نیت، مطابقت شریعت۔ یعنی نیت اچھی ہو اور عبادت، شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کی جائے۔ اگر ان دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی غائب ہو گی تو عبادت، عبادت باقی نہیں رہے گی۔ البتہ جن عبادات و طاعات میں کوئی خاص طریقہ شریعت نے مقرر نہیں کیا ہے ان میں صرف حسن نیت کافی ہے۔ مثلاً دعاء، عبادت بلکہ عبادت کا مغز ہے۔ لیکن نماز سے باہر شریعت نے اس کے لیے خاص الفاظ یا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا ہے۔ وہ زبان ہلائے بغیر دل میں بھی کی جا سکتی ہے۔ زبان سے ہاتھ اُٹھا کر بھی کی جا سکتی ہے اور ہاتھ اُٹھائے بغیر بھی کی جا سکتی ہے، اُردو میں بھی کی جا سکتی ہے اور ہر زبان میں کی جا سکتی ہے۔

۳۔ اچھی نیت کیا ہے؟ اس کی سب سے بہتر تعبیر یہ ہے کہ عبادت اور ہر نیک کام اللہ کی رضا اور اس کا تقرب حاصل کرنے کی غرض سے کیا جائے۔ عبادت، اور اس میں حُسنِ نیت کی ایک مثال زیرِ گفتگو حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اس وقت کا ہے جب مکہ سے مدینہ، ہجرت فرض اور بہترین عبادت تھی "جس کی ہجرت اللہ و رسولؐ کی طرف ہے، اس کی ہجرت اللہ و رسولؐ ہی کی طرف ہو گی" اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کی ہجرت اللہ کی رضا

---

(۱) احیاء العلوم ج۴

کے لیے اور رسول ؐ کے حکم کی تعمیل میں ہو اس کا اجر ثابت ہو گیا۔ اس کی شرح میں علامہ نووی نے لکھا ہے:

معناہ من قصد بھجرتہ وجہ اللہ وقع اجرہ علی اللہ۔ (۱)	اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنی ہجرت سے اللہ کی رضا کا قصد کیا اس کا اجر اللہ کے ذمّہ ثابت ہو گیا۔

۴۔ رضائے الٰہی کی طلب کے لیے متعدد تعبیریں خود قرآن مجید میں آئی ہوئی ہیں کہیں اس کے لیے " وجہ اللہ " استعمال ہوا ہے ، کہیں " رضوان اللہ " کہیں " مرضات اللہ " کہیں اس کے لیے جہنم سے استعاذہ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے اور کہیں حصول جنّت کی ترغیب دی گئی ہے۔ کہیں عذاب الٰہی کا خوف اس کی تعبیر ہے اور کہیں رحمت الٰہی کی امید اور کہیں اس کے فضل کی طلب ــــــــ حاصل کلام یہ ہے کہ ہر وہ کام جو آخرت کی کامیابی حاصل کرنے اور وہاں کی ناکامی سے بچنے کی غرض سے کیا جائے وہ سب حُسن نیت میں داخل ہے۔

صوفیہ کے کلام میں یہ بات ملتی ہے کہ جنّت کی طلب کے لیے کوئی کام کرنا اعلیٰ درجہ کی نیت سے نیچے اتر آنا ہے ان کی یہ بات اتنی مشہور ہو گئی کہ غالب جیسا شاعر بھی یہ کہہ گزرا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

صوفیہ کی اس بات کے لیے صرف یہی نہیں کہ کتاب و سنّت میں کوئی

---

(۱) نووی : شرح مسلم ۱۲۔

دلیل موجود نہیں ہے بلکہ یہ کتاب وسنت کی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن میں حصول جنت کے لیے عمل کرنے کی ترغیب بھی موجود ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی دعاؤں میں بھی جنت کی طلب موجود ہے۔ انبیاء سے بڑھ کر کون اللہ کا مقرب ہو سکتا اور ان سے بڑھ کر کس کی نیت اعلیٰ درجہ کی ہو سکتی ہے۔

سورہ والصّٰفّٰت میں جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○	بے شک یہی ہے بڑی مراد ملنی، ایسی
لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ○	چیزوں کے واسطے چاہیے محنت کریں،
(رکوع ۲)	محنت کرنے والے۔

سورہ التطفیف میں جنت کی نعمت اور وہاں کی شراب کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ	جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے
الْمُتَنٰفِسُوْنَ ○	ہیں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔

موحدوں کے امام وسردار سیدنا ابراہیم علیہم السلام کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے:

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ	اور مجھے جنت کے وارثوں میں
جَنَّةِ النَّعِيْمِ ○ (الشعراء رکوع ۵)	شامل کرنا۔

یہاں محض ضمنی طور پر اتنا اشارہ کیا گیا ہے ورنہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کے لیے ایک مستقل مقالے کی ضخامت چاہیئے۔

۵۔ اس عظیم حدیث میں جس پر گفتگو ہو رہی ہے کہا گیا ہے " اور جس

کی ہجرت کوئی دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہے تو وہ اسی کے لیے ہوگی جس کی طرف اس نے ہجرت کی"۔ امام نودی نے اس کی شرح میں لکھا۔

ومن قصد بها دنیا او امرءة فهی حظه ولا نصیب له فی الآخرة بسبب هذه الهجرة۔

اور جس نے ہجرت سے دنیا یا کسی عورت کا قصد کیا تو وہی اس کا حصہ ہے اور اس ہجرت کی وجہ سے آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

حدیث کے اس ٹکڑے نے نیت کے اخلاص کو عدم اخلاص سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ عبادت یا کسی نیک کام کے پردے میں دنیا کے کسی فائدے کو مقصد بنانا بدترین نیت ہے کیونکہ یہ منافقت ہے۔ آدمی دوسروں کو یہ دکھائے کہ وہ عبادت یا کوئی نیک کام اللہ کے لیے کر رہا ہے لیکن اصل غرض دنیا کا حصول ہو۔ علماء سوء، مکار صوفیہ اور دوسرے دین فروش لوگوں نے اس پردے میں نہ جانے اللہ کے کتنے بندوں کو لوٹا اور انھیں گمراہ کیا ہے ——— آج کل کتنے ہی لوگ بظاہر حج کے ارادے سے مکہ جاتے ہیں لیکن اصل غرض دنیا کا حصول ہوتا ہے۔

مثلاً مختلف قسم کے ارزاں سامانِ تجارت خرید کر چوری چھپے اور رشوت دے کر ہندوستان لانا اور یہاں کثیر منافع پر اس کو فروخت کرنا۔ یہ دنیا پرست لوگ اتنے مدہوش ہیں کہ حج کی عبادت کو بھی بدنام کر رہے ہیں۔

۶۔ دوسری صحیح احادیث سے کسی اچھے کام کی نیت اور کسی برے کام کی نیت کا ایک پہلو سامنے آتا ہے کہ اچھے اور نیک کاموں کی صرف نیتوں کو بھی

نیکیوں میں شمار کیا گیا ہے جن پر اجر ملے گا اور بُرے کاموں کی نیتوں کو اس وقت تک برائیوں میں شمار نہیں کیا جاتا جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے بلکہ بعض صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی بُرے کام کا ارادہ کیا گیا ہو مگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو اس ارادے (نیت) کو بھی ایک نیکی شمار کیا جائے گا:

ہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور یہ ان حدیثوں میں ہے جو آپؐ نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے بیان کی ہے آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حسنات وسیّات لکھ دیئے ہیں اور پھر ان کو بیان کر دیا ہے تو جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا پھر اس پر عمل نہیں کیا، اللہ اس کو اپنے پاس ایک کامل نیکی لکھے گا اور اگر اس کا ارادہ کیا اور اس پر عمل بھی کیا تو اللہ اپنے پاس اس کو دس نیکیاں سات سو گونہ تک بلکہ اس سے بھی زیادہ لکھے گا اور اگر کسی بُرائی کا ارادہ کیا پھر اس پر عمل نہیں کیا تو اللہ اس کو اپنے پاس ایک کامل نیکی لکھے گا اور اگر اس کا ارادہ کیا اور اس پر عمل بھی کیا تو اللہ اپنے پاس اس کو ایک بُرائی لکھے گا۔ (۱)

اسی مضمون کی حدیث امام مسلم نے کتاب الایمان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر کسی نے بُرے کام کے ارادے پر عمل نہیں کیا تو وہ اس کے نامۂ اعمال میں درج نہیں کیا جائے گا۔

---

(۱) ریاض الصالحین بحوالہ بخاری ومسلم

یہ دونوں حدیثیں اللہ تعالیٰ کے قانون فضل اور قانون عدل کو پوری طرح واضح کرتی ہیں۔ اس کا قانونِ عدل یہ ہے کہ جب تک کوئی بُرا کام، کیا نہ جائے محض اس کے ارادے پر کوئی سزا نہیں دیتا اور یہ کہ کسی ایک بُرے عمل کی ایک ہی سزا دیتا ہے ن سے ذرہ برابر بھی زیادہ نہیں۔ اور اس کا قانونِ فضل یہ ہے کہ اچھے کام کی نیت وارادہ پر بھی اجر عطا فرماتا ہے اور کسی ایک اچھے عمل پر کم سے کم دس گونہ اجر عطا فرماتا ہے ـــــــــ ان دونوں حدیثوں سے دو سبق ملتے ہیں ایک یہ کہ کسی اچھے کام کی نیت یعنی قصد وارادہ میں ہرگز بخل نہ کیا جائے خواہ اس نیک کام کو انجام دینے کا موقع ملے یا نہ ملے اور دوسرا سبق یہ ملتا ہے کہ اگر نفس وشیطان کے اغواء سے کسی بُرے کام کا ارادہ پیدا بھی ہو تو اس پر عمل ہرگز نہ کیا جائے اس طرح وہ بُرا ارادہ بھی نیکی بن جائے گا یا کم سے کم یہ کہ اس پر کوئی سزا نہیں ملے گی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نیت اور صفت میں فرق ہے مثال کے طور پر حسد قلب کی ایک صفت ہے نیت نہیں ہے ان حدیثوں میں نیک و بد اعمال کی نیتوں کے بارے میں احکام بیان کیے گئے ہیں باقی رہے قلب کے صفات وجذبات تو ان کے احکام دوسری حدیثوں میں بیان کیے گئے ہیں مثال کے طور پر حسد کے بارے میں ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ وہ نیکیوں کو اس طرح جلا دیتا ہے جس طرح آگ، لکڑی کو جلا دیتی ہے۔

۷۔ حسنِ نیت کے ساتھ کسی اچھے کام کا اجر ثابت ہو جاتا ہے خواہ اس کا تعلق کسی ایسے شخص سے ہو جائے جس کا ارادہ نہ کیا گیا ہو۔ اس کا ثبوت ذیل کی دو حدیثوں سے ملتا ہے:

ابو یزید معن بن یزید بن اخنس رضی اللہ عنہم نے کہا کہ میرے

والد یزید رضؓ نے چند دینار صدقہ کی نیت سے نکالے اور مسجد میں ایک شخص کے پاس رکھ دیئے، وہ کہتے ہیں کہ میں ان صاحب کے پاس گیا اور وہ دینار لے کر اپنے والد کے پاس آیا ان کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا، خدا کی قسم میں نے تمہارا ارادہ نہیں کیا تھا، میں یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا آپؐ نے فیصلہ دیتے ہوئے فرمایا اے یزیدؓ تم نے جو نیت کی اس کا اجر تمہارے لیے ہے اور اے معنؓ تم نے جو دینار لیے وہ تمہارے ہو گئے

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت یزید بن اخنس کا صدقہ خود ان کے لڑکے نے لے لیا جو ان کے ارادے کے خلاف تھا وہ چاہتے تھے کہ ان کا صدقہ کسی دوسرے حاجت مند کو ملے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں تمہاری نیت کا اجر مل گیا کیونکہ انھوں نے اللہ کی رضا کے لیے صدقہ نکالا تھا اور کسی خاص حاجت مند کی تعیین بھی نہیں کی تھی۔

حضرت معنؓ سے حضورؐ نے یہ فرمایا کہ تم نے جو دینار لیے وہ تمہارے ہیں، وہ حاجت مند اور مستحق صدقہ تھے اس لیے دینار کسی غلط جگہ نہیں پہنچے تھے۔

دوسری حدیث یہ ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص نے نذر مانی کہ آج رات میں صدقہ کروں گا وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور ایک بدکار عورت کو دے دیا، صبح کو لوگوں میں چرچا ہوا کہ رات ایک بدکار عورت کو صدقہ دیا گیا ہے اس شخص نے کہا اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ (اے اللہ تمام حمد و ثنا تیرے ہی لیے ہے) افسوس میرا صدقہ ایک بدکار عورت کو مل گیا۔ اس نے

پھر نذرمانی اور اپنا صدقہ لے کر نکلا اور ایک مال دار آدمی کے ہاتھ پر رکھ آیا۔ صبح کو چرچا ہوا کہ رات ایک مالدار کو صدقہ دیا گیا ہے اس شخص نے کہا اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ، میرا صدقہ ایک مالدار کے ہاتھ میں گیا۔ اچھا آج رات میں پھر صدقہ کروں گا وہ اپنا صدقہ لے کر نکلا اور ایک چور کو دے آیا، صبح کو چرچا ہوا کہ رات ایک چور کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اب اس نے تعجب اور حسرت سے کہا اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ افسوس میرا صدقہ بدکار، مالدار اور چور کو مل گیا (اس نے سمجھا کہ اس کا مال ضائع ہوا اس کا اجر نہیں ملے گا) اس کے پاس کوئی آنے والا آیا اور اس نے کہا، تمہارا صدقہ قبول کر لیا گیا، رہی بدکار عورت تو شاید وہ اس صدقہ کی وجہ سے اپنی بدکاری سے باز آجائے اور مالدار آدمی عبرت حاصل کرے اور جو کچھ اللہ نے اسے دیا ہے اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنے لگے اور چور تو شاید آئندہ وہ اپنی چوری کی عادت ترک کر دے۔ (۱)

یہ حدیث امام نسائی نے بھی کتاب الزکوٰۃ "باب اذا اعطاہا غنیا وھو لا یشعر" میں روایت کی ہے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ہے۔ اس حدیث میں اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کا جو جملہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بدکار عورت یا مال دار یا چور کو صدقہ مل جانا میرے ارادے سے نہیں ہوا۔ تیری مشیت اور ارادے سے ہوا اور تیرے تمام ارادے اچھے اور قابلِ تعریف ہیں ——— اس حدیث میں "اس کے پاس کوئی آنے والا آیا اور کہا" اس جملے کا مطلب

---

(۱) مسلم کتاب الزکوٰۃ باب اجر المتصدق وان وقعت الصدقۃ فی ید فاسق ونحوہ

یہ ہے کہ اس شخص کو خواب میں خبر دی گئی یا اس نے کسی ہاتف کی آواز سُنی یا وقت کے کسی نبی نے اُسے بتایا، یا بنی اسرائیل کے کسی عالم دین نے اس کو یہ فتویٰ دیا کہ تیرا صدقہ قبول ہو گیا ——— اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تین بار صدقہ ایسے لوگوں کو مل گیا جو اس کے مستحق نہ تھے اور نہ انھیں صدقہ دینے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ تینوں کو ناواقفیت میں صدقے دیئے گئے تھے لیکن وہ صدقات عنداللہ مقبول ہو گئے۔ کیونکہ صدقہ دینے والے کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔
دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ نیت میں خلوص ہو تو صدقہ لاعلمی میں کسی غیر مستحق یا ایسے شخص کو مل جائے جس کا ارادہ نہ کیا گیا ہو تو صدقہ دینے والے کے اجر میں کوئی خلل واقع نہ ہوگا اور وہ صدقہ عنداللہ قبول ہوگا۔

۸۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ کسی ایک طاعت میں متعدد نیکیوں کی نیتیں کی جاسکتی ہیں اور ہر نیت پر ثواب مل سکتا ہے کیونکہ ہر نیکی کی نیت خود ایک حَسَنَة ہے اور ہر حَسَنَة پر کم سے کم دس گونہ اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مثلاً مسجد میں بیٹھنا ایک طاعت ہے اور اس میں متعدد نیتیں کی جاسکتی ہیں۔ امام غزالیؒ نے بہت سی نیتوں کا ذکر کیا ہے میں یہاں چند نیتوں کا ذکر کرتا ہوں:

۱۔ کسی نماز با جماعت کے بعد دوسری نماز با جماعت کا انتظار۔ نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھنا بھی نماز ہی کے حکم میں ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت میں "رابطوا" سے مراد یہ ہے کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کیا جائے۔

۲۔ اعتکاف کی نیت (نفلی اعتکاف تھوڑی دیر کا بھی ہو سکتا ہے)

۳۔ یہ نیت کہ جب تک مسجد میں بیٹھے گا ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ اور آخرت کے انجام پر غور و فکر کرتا رہے گا اور تمام دنیوی خیالات سے اپنے دماغ

کو پاک رکھے گا۔

۴۔ یہ نیت کہ دین کے بارے میں اسے جو علم ہے وہ دوسروں کو سکھائے گا، معروف کی تلقین کرے گا اور منکر سے روکے گا۔ مثلاً بہت سے لوگ نماز صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔ نرمی سے انھیں تعدیلِ ارکان کی تعلیم دے گا اور نماز میں جلدبازی سے انھیں منع کرے گا۔

۵۔ اللہ کے ذکر میں مشغول رہے گا اور اگر وہاں اللہ کا ذکر ہو رہا ہو تو اسے دھیان سے سُنے گا اور اس سے نصیحت حاصل کرے گا۔

اس طرح طاعت تو ایک ہوگی یعنی مسجد میں بیٹھنا لیکن ان متعدّد نیکیوں کی نیتوں کی وجہ سے اجر میں بہت اضافہ ہوسکتا ہے۔

۶۔ پہلے اس کی وضاحت کی جاچکی ہے کہ حدیثِ نبوی "الاعمال بالنیۃ" میں اعمال سے طاعات و مباحات مراد ہیں ان سے گناہ کے کام مراد نہیں ہیں، کیونکہ کوئی معصیت، اچھی نیت سے طاعت نہیں بن سکتی۔ اب یہاں یہ ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ نیت وہ چیز ہے کہ اس کی وجہ سے طاعات و عبادات، سیّئات میں اور مباحات، طاعات و عبادات میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص صدقات و خیرات میں نیت یہ کرے کہ لوگ اس کو سخی کہیں تو ایسا شخص خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق ہوگا۔ دنیا کا نقصان تو یہ ہوگا کہ پیسے جیب سے نکل جائیں گے اور آخرت کا نقصان یہ ہوگا کہ وہ ثواب کے بجائے عذاب کا مستحق ہوجائے گا۔

مباحات (جائز چیزیں) کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ان سے نیت محض حظِّ نفس اور آرام و عافیت کی ہو تو نہ عقاب ہے نہ ثواب لیکن مباح چیزیں بھی بُری نیت سے معصیت اور اچھی نیت سے طاعت بن سکتی ہیں۔ امام غزالی نے لکھا ہے:

"ہر مباح کام میں کسی ایک نیت یا متعدد ایسی نیتوں کا احتمال

ہوتا ہے جن کی وجہ سے، وہ بہترین نیکیوں میں تبدیل ہو سکتا اور ان کے ذریعہ بلند درجات حاصل کیے جا سکتے ہیں یہ کتنا بڑا نقصان ہے کہ انسان اس سے غافل ہو اور مباحات کا استعمال اس طرح کرے جیسے جانور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوشبو لگانا ایک امر مباح ہے جس سے انسان کی طبیعت خوش ہوتی ہے لیکن یہی کام قیامت میں سڑی ہوئی لاش سے زیادہ بدبو یا مشک سے زیادہ خوشبو میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ کوئی پوچھے کہ کیس طرح ہو سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خوشبو کا استعمال ان مقاصد سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اپنے تمول پر فخر کا اظہار کیا جائے یا یہ کہ لوگ اس کے بارے میں چرچا کریں کہ فلاں صاحب بہت خوشبو مہکتے ہیں یا یہ کہ اجنبی عورتوں کے دل اس کی طرف مائل ہوں یا اسی طرح کی دوسری نیتیں اس مباح کام کو معصیت بنا دیں گی اور قیامت میں ایسے شخص کے جسم سے مُردار سے زیادہ بدبو پھوٹے گی اور یہی مباح کام ان نیتوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جمعہ کے دن اتباع سنّت کی نیت یا مسجد کی تعظیم اور بیت اللہ کے احترام کی نیت یا اپنے قریب نماز پڑھنے والوں کو راحت پہنچانے اور ان کے دلوں کو خوش کرنے کی نیت یا اس بات کا قصد و ارادہ کہ خوشبو کے استعمال سے دل و دماغ میں فرحت و انبساط کی کیفیت پیدا ہو تا کہ وہ دین کے اہم امور و مسائل پر اچھی طرح غور کر سکے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ خوشبو سے عقل بڑھ جاتی ہے ــــــ یہ تمام نیتیں اس مباح کام کو طاعت بنا دیں گی اور قیامت میں ایسے شخص کے جسم سے مُشک سے بہتر خوشبو پھیلے گی ــــــ ان نیتوں اور مقاصد کا استحضار اسی شخص کو

ہوتا ہے جس کے ذہن و دماغ پر آخرت کی تجارت اور طلبِ خیر کا خیال غالب ہو۔ اسی مثال پر ہر مباح کام کی تفصیل کی جا سکتی ہے (۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مباحات بھی حسنِ نیت کی وجہ سے طاعات و عبادات میں تبدیل ہو جاتے ہیں اس طرح ایک مسلمان اگر چاہے تو اس کے چوبیس گھنٹے اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت میں بسر ہو سکتے ہیں اور وہ بے حد و شمار اجر حاصل کر سکتا ہے۔

۱۰۔ اسلامی تصوف میں احضارِ نیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر نیک کام اور ہر جائز کام سے پہلے اس مقصد کو اپنے قلب و ذہن میں حاضر کر لیا جائے جسے حاصل کرنے کے لیے وہ کام کیا جا رہا ہو، حسنِ نیت میں کون کون سے مقاصد داخل ہیں ان کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ میں احضارِ نیت کا ایک واقعہ یہاں نقل کرتا ہوں:

> امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ ایک مسکین نے حضرت عائشہ ام المومنینؓ سے کھانا مانگا۔ ان کے سامنے انگور کا ایک گچھا رکھا ہوا تھا، انھوں نے ایک شخص سے کہا کہ اس میں سے ایک دانہ لے لو اور اس مسکین کو دے دو، وہ تعجب سے انھیں دیکھنے لگے، حضرت عائشہ نے فرمایا کیا تمہیں اس پر تعجب ہو رہا ہے تمہارا کیا خیال ہے انگور کے اس ایک دانے میں کتنے ذرات کے برابر وزن ہوگا؟ (۲)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس سوال سے اس شخص کو قرآن کی اس آیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھیں:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (الزلزال) — پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

(۱) ایضاً (۲) موطا امام مالک باب الصدقۃ بالشئ القلیل

حضرت عائشہ رض کا ایک انگور صدقہ کرنا اس بات کی عملی دلیل ہے کہ بہت قلیل شے بھی صدقہ کی جاسکتی ہے اور ان کا سوال اس بات کی دلیل ہے کہ جس وقت انھوں نے ایک انگور صدقہ کرنے کا حکم دیا تھا اس وقت قرآن کی آیت اور اجر آخرت کی طلب ان کے دل میں حاضر تھی ۔

اخلاص

عربی لغت میں اخلاص کسی چیز کو دوسری ایسی تمام چیزوں سے جو اس کو مکدر اور خراب کرنے والی ہوں، پاک صاف کرنے کو کہتے ہیں۔ پاک صاف ہونے کے بعد وہ چیز خالص کہی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں بھی خالص کا لفظ لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ النحل آیت ۶۶ میں ہے:

ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے
تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں، پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ٥

یعنی گوبر اور خون کے ہر شائبے اور ہر آمیزش سے پاک صاف دودھ پلاتے ہیں ــــــــ خالص کا لفظ "خاص" کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ قرآن میں ہے:

اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے
مردوں کے لیے خالص (خاص) ہے اور ہماری عورتوں پر حرام۔
(الانعام: ۱۳۹)

قرآن میں استخلاص کا لفظ بھی خاص اور مخصوص کے معنی میں آیا ہے:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي۔ (یوسف: ۵۴)	بادشاہ نے کہا انھیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کرلوں۔

یعنی اجعلہ لنفسی (تفسیر مظہری) یعنی میں ان کو اپنے لیے خاص کرلوں۔

اپنے لیے خاص کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ملک مصر میں جو کام در اصل میرے کرنے کا ہے وہ میں ان کے سپرد کر دوں۔

شرعی اصطلاح میں اخلاص، تمام عقائد اور عبادات و طاعات کو شرک و کفر و نفاق اور ہر طرح کی دنیوی اغراض کی آمیزشوں، ملاوٹوں اور کھوٹ سے پاک صاف کرنے کا نام ہے۔ تمام عقائد و اعمال کے عند اللہ مقبولیت کا دارومدار اخلاص ہی پر ہے۔ اخلاص کی ضد، اشراک (شریک کرنا) اور منافقت ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان مخلصانہ نہ ہو تو وہ کسی کام کا نہیں اور اگر کوئی عمل صالح دنیوی اغراض سے پاک نہ ہو تو وہ عند اللہ مقبول نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایمان اور کسی عمل خیر کا شرعاً اعتبار ہی نہ ہو تو تصوف میں کسی "مقام و حال" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تصوف میں اخلاص کو وہی اہمیت حاصل ہے جو قرآن و احادیث میں اسے دی گئی ہے۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری شرح رسالۂ قشیریہ میں لکھتے ہیں:

> "اخلاص کا سبب، بندے کا یہ علم ہے کہ وہ ہر ایسے عمل میں جو دنیا اور آخرت دونوں جگہ نفع بخش ہو، اللہ کا محتاج ہے اور اخلاص کا ثمرہ اللہ کے عذاب و عتاب سے سلامتی اور جنتوں میں بلند درجات کا حصول ہے۔"

اس شرح کے محشی استاذ مصطفےٰ عروسی نے لکھا ہے:

> "اخلاص مقبولیتِ ایمان کی روح ہے۔ یہ مقصد تک پہنچنے کے سب سے بڑے اسباب میں سے ایک سبب اور سعادتِ ابدی کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے کیونکہ اسی سے ربِّ کائنات کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کا جو بندہ اخلاص سے متصف

ہے وہ اہل عنایات میں ہے اور اسے سب سے بڑی کرامت عطا کر دی گئی ہے۔

ایک اور بزرگ نے کہا ہے " اعمال صورتیں ہیں اور ان کی رُوح اخلاص ہے"۔

امام قشیری اور شیخ الاسلام زکریا انصاری، نیز امام غزالی نے اخلاص کی فضیلت و اہمیت کے ثبوت میں چند آیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میں یہاں آیتوں کے حوالوں کے ساتھ ان کے ترجمے نقل کرتا ہوں :

۱۔ یقین جانوں کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے ٥ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں۔ ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ (النساء: ۱۴۶،۱۴۵)

۲۔ (اے محمدؐ) یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے ٥ خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے۔

(الزمر: ۳،۲)

۳۔ پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔ (الکہف آخری آیت)

۴۔ اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، یہی نہایت صحیح و درست دین ہے۔ (البینۃ)

سورۂ النساء کی آیت ۱۴۵ میں منافقین کی سخت ترین سزا بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ سزا سے ان میں کے وہی لوگ بچ سکیں گے اور مومنین مخلصین کی جماعت میں شامل ہو سکتے ہیں جن میں چار باتیں پائی جائیں:
توبہ[1]، اصلاح[2]، اعتصام باللہ[3]، اخلاص[4]۔ نفاق اور تمام برے اعمال سے توبہ کرلیں۔ دین اسلام کی ڈوری مضبوطی سے تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کردیں۔ ان چار باتوں میں آخری بات 'اخلاص'، اسلامی تصوف کا حاصل اور آخرت میں بلند درجات کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔
سورۂ زمر کی آیت ۲ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی بندگی، دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے کریں۔ یہی حکم تمام انبیاء کرام، ان پر ایمان لانے والوں اور تمام فرماں بردار بندوں کو دیا گیا ہے، یہی بات سورہ البینۃ میں کہی گئی ہے۔

دین کو اللہ کے لیے خالص کرکے اس کی بندگی کرنے کا مفہوم کیا ہے؟
اس حکم میں " دین " کے معنی اللہ کی اطاعت، فرماں برداری اور غلامی کے ہیں۔ دین کو اللہ کے لیے خالص کرکے اس کی عبادت (بندگی) کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شا[illegible]ے بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے اور یہ سب کچھ شائبہ شرک وریا سے پاک ہو، اللہ کی تمام عبادتوں اور اطاعتوں کا مقصد صرف اس کی رضا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنا ہو۔

سورہ الکہف کی آخری آیت کی شان نزول یہ ہے:
طاؤس، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں میدانِ جہاد میں کھڑا ہوتا ہوں، اس سے اللہ کی

رضا چاہتا ہوں، ساتھ ہی یہ بھی پسند کرتا ہوں کہ میدان جہاد میں میرے مقام اور میری جدو جہد کو لوگ دیکھیں۔ آپؐ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ یہ آیت فمن کان یرجو لقاء ربہ نازل ہوئی۔

(تفسیر مظہری ج ۶ ص ۷۰ بحوالہ حاکم فی المستدرک وصححہ علی شرط الشیخین)

اس حدیث سے اُس حدیث قدسی کی تائید ہوتی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے میرے لیے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ دوسرے کو شریک کیا تو میں اس کو اس کے شرک کے ساتھ چھوڑ دوں گا۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ میں اس سے بری ہوں وہ عمل اسی کے لیے ہے جس کے لیے وہ کیا گیا۔ (مشکوٰۃ کتاب الرقاق بحوالہ مسلم)

کسی نیک کام میں اگر یہ غرض بھی شامل کر دی جائے کہ لوگ اُسے دیکھیں اور تعریف کریں تو وہ مخلصانہ باقی نہیں رہتا، اس میں ریاء داخل ہو جاتی ہے جسے اس صحیح حدیث میں شرک قرار دیا گیا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے:

حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا، یا روح اللہ، اللہ کے لیے مخلص کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا جو صرف اللہ کے لیے عمل کرے یہاں تک کہ وہ یہ بھی پسند نہ کرے کہ لوگ اس عمل پر اس کی تعریف کریں۔ (تفسیر مظہری بحوالہ ابن ابی شیبہ واحمد ج ۶ ص ۵۰)

مُخلِص اور مُخلَص

لام کے زیر کے ساتھ مخلص اس شخص کو کہتے ہیں جس نے اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیا ہو، اس کی تمام عبادتوں اور اطاعتوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کے احکام

کی تعمیل، اس کی رضا کی طلب اور آخرت کی کامرانی کا حصول ہو، اس کے قصد وارادہ میں دنیا طلبی کی آمیزش نہ ہو۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۳۶ سے ۱۳۹ تک کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان آیتوں میں ترتیب کے ساتھ نحن مسلمون، نحن عابدون، نحن مخلصون۔ کہا گیا ہے۔ ان میں پہلے اسلام کا ذکر ہے پھر عبادت کا اور آخر میں اخلاص کا۔ اسلام، عبادت کے بغیر بے معنی ہے اور عبادت اخلاص کے بغیر بے حقیقت ہے۔ اللہ کے مومن بندے جب اخلاص میں کامل ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالٰے انھیں شیطان کی تسلیط سے محفوظ کر کے اپنی نصرت اور فضل وکرم کے لیے مخصوص کر لیتا ہے اور اب وہ مخلَص ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کو مخلَص کہا گیا ہے۔ ایک جگہ سیدنا ابراہیمؑ واسحاقؑ ویعقوبؑ کے تذکرہ کے بعد کہا گیا ہے:

اِنَّآ اَخۡلَصۡنٰہُمۡ بِخَالِصَۃٍ ذِکۡرَی الدَّارِ۔	ہم نے ان کو ایک خالص صفت کی بناء پر برگزیدہ کیا تھا اور وہ دار آخرت کی یاد تھی۔
(ص: ۴۶)	

ثناء اللہؒ پانی پتی لکھتے ہیں:-

> یعنی ہم نے انھیں اپنے لیے خالص کر لیا ہے ایک خالص صفت کی بنا پر جو ان کے اندر پائی جاتی تھی اور وہ آخرت کی یاد ہے ..... وہ ہمیشہ خود آخرت کو یاد رکھتے اور دوسروں کو اس کی یاد دلاتے رہتے جیسا کہ تمام انبیاء کا طریقہ اور ان کی روش یہی رہی ہے۔ یہ آخرت کی یاد ہی طاعت میں ان کے خلوص کا سبب تھی، آخرت کو ہمیشہ یاد رکھنے اور یاد دلانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ جو کچھ کرتے اور جو کچھ چھوڑتے

اس میں ان کا مطمح نظر اللہ کی رفاقت اور اس کی ملاقات ہوتا جس کا حقیقی محل آخرت ہے۔ یہاں "الدار" آخرت کے گھر کے لیے استعمال ہوا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ حقیقی گھر آخرت ہی ہے۔ دنیا تو محض گزرگاہ ہے جو انسان کا مستقر نہیں ہے اور جو مقام مستقر نہ ہو وہ حقیقی گھر نہیں ہوتا ——— مالکؒ بن دینار نے اس آیت کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت اور اس کا ذکر نکال لیا اور انھیں آخرت کی محبت اور اس کی یاد کے لیے خاص کر لیا۔ (تفسیر مظہری ج ۸ ص ۱۸۵)

سورۂ مریم میں حضرت موسیٰؑ کے بارے میں فرمایا گیا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا ۝ (مریم: ۵۱)

اور ذکر کرو اس کتاب میں موسیٰ کا، وہ ایک چیدہ شخص تھے اور رسول نبی تھے۔

یعنی اخلصہ للہ واختارہ لنفسہ ونزھہ عن الدنس بالتوجہ الیٰ غیرہ۔ (مظہری ج ۶ ص ۱۰۱)

یعنی اللہ نے ان کو اپنے لیے مخصوص کر لیا اور چن لیا اور ان کو غیر اللہ کی طرف توجہ کرنے کی گندگی سے پاک صاف کر دیا۔

سورۂ یوسفؑ میں حضرت یوسفؑ کو اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ (وہ میرے منتخب بندوں میں ہے) کہا گیا ہے۔

کسی غیر نبی کے لیے صراحت کے ساتھ مُخْلَص کا لفظ قرآن میں استعمال نہیں ہوا ہے اور یقین و ایمان کے ساتھ صرف انبیاء ہی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خاص، خالص اور منتخب بندے تھے۔ البتہ

اجمالی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام بندے جو اپنے ایمان و عمل میں مُخلِص تھے اور مُخلِص ہیں وہ سب کے سب مُخلَص بھی ہیں۔

من قال لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنّۃ۔ (جس نے لا الٰہ الا اللّٰہ کہا وہ جنّت میں داخل ہوا)۔

مخلصانہ ایمان نہ صرف بلند درجات کے حصول کا بے بدل ذریعہ ہے بلکہ یہی نجات کی ضمانت ہے یہ نہ ہو تو نجات بھی ممکن نہیں ہے۔

بعض واعظین اپنے عوام فریب وعظ میں من قال لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنّۃ کی حدیث سُناتے ہیں نہ وہ اس قول کی قیدیں بیان کرتے ہیں جو دوسری احادیث میں لگی ہوئی ہیں اور نہ اس کی ایسی ضروری تشریح کرتے ہیں، جس سے یہ معلوم ہو کہ ایمان و اسلام کے تقاضے پورے کرنے بھی ضروری ہیں، کیونکہ اس کے بغیر محض زبان سے کلمہ پڑھ لینا جنّت میں داخلے کا پروانہ نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کلمہ منافقین بھی پڑھتے تھے۔ اس قسم کے واعظین اور بنے ہوئے صوفی عوام کو انبیاء و اولیاء کی غالیانہ عقیدت اور جھوٹی سچّی روایتوں پر مشتمل "میلاد شریف" کے سبق پڑھا کر ان کو مطمئن کر دیتے ہیں کہ جنّت تمہارے لیے وقف ہو چکی۔ اس وعظ اور سبق کے بدلے میں وہ ان کی جیبوں سے چند سکّے اور ان کی نظروں میں اپنے لیے عزّت و احترام حاصل کرتے ہیں۔ اس قسم کے واعظین اور مکّار صوفیہ بقول امام غزالی اپنے وقت کے دجّال ہوتے ہیں۔

میں یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی آیات ہوں یا احادیثِ نبوی، ان سے استفادہ کرنے اور احکام اخذ کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی حکم کے بارے میں پورے قرآن کے اندر جہاں جہاں کوئی بات بیان کی گئی ہے ان سب

کو سامنے رکھ کر صحیح مفہوم یا صحیح حکم اخذ کیا جائے اور یہی طریقہ احادیث سے استفادہ اور ان سے صحیح احکام اخذ کرنے کا ہے۔ احادیث میں ایک اور چیز کا اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ احادیث کے بارے میں یہ معلوم کر لیا جائے کہ جن سے کوئی شرعی حکم اخذ کیا جا رہا ہے وہ صحیح ہیں یا ضعیف یا موضوع (گھڑی ہوئی)۔ اب میں "من قال لاالٰہ الااللہ دخل الجنۃ" کے سلسلے میں ان احادیث کے ترجمے پیش کرتا ہوں جن سے اس کا صحیح مفہوم سامنے آتا ہے:

۱۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دی اس حال میں کہ وہ اس گواہی میں سچا ہو، وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (جمع الفوائد بحوالہ مسند احمد)

۲۔ حضرت عثمانؓ بن عفان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اس علم و یقین کے ساتھ مرا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (مسلم کتاب الایمان)

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ (ایک موقع پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں اللہ کا رسولؐ ہوں اور جو بندہ بھی ان دو گواہیوں (اشہد ان لاالٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً رسول اللہ) کے ساتھ اللہ سے ملاقات کرے گا بایں حال کہ ان دو گواہیوں میں اسے کوئی شک نہ ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (ایضاً)

۴۔ حضرت ابوہریرہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نعلین دے کر فرمایا کہ جاؤ اور جو شخص بھی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اس حال میں کہ اس کلمہ پر اس کا دل یقین رکھتا ہو تو اس کو جنت کی بشارت سنا دو۔ (ایضاً)

۵۔ عتبان بن مالک رضؓ انصاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اس کو دوزخ پر حرام کردے گا جس نے لاالٰہ الااللہ کہا، بایں حال کہ وہ اس سے اللہ کی رضا چاہتا ہو۔

(جمع الفوائد کتاب الایمان بحوالہ بخاری و مسلم)

۶۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میری شفاعت سے سب سے زیادہ سعادت مند وہ شخص ہوگا جس نے "لاالٰہ الااللہ خالصاً مخلصاً من قلبہ" کہا ہوگا۔ (ایضاً بحوالہ بخاری)

۷۔ وہب بن منبہ سے کہا گیا "کیا لاالٰہ الااللہ جنّت کی کنجی نہیں ہے؟ انھوں نے کہا ہاں، لیکن ہر کنجی میں دندانے ہوتے ہیں تو اگر تم ایسی کنجی لے کر آئے جس میں دندانے ہوں تو جنّت کا دروازہ تمہارے لیے کھول دیا جائے گا ورنہ تمہارے لیے نہیں کھولا جائے گا۔ (ایضاً بحوالہ بخاری معلقاً)

۸۔ رفاعہ جہنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں اللہ کا رسولؐ ہوں سچے دل سے، پھر وہ اپنے اعمال درست کرلیتا ہے ایسا بندہ مرنے کے بعد جنّت میں داخل ہوگا۔ (ایضاً بحوالہ مسند احمد)

ان تمام احادیث کا بغور مطالعہ کیجیے۔ سب سے پہلی بات غور کرنے کی یہ ہے کہ زیادہ تر احادیث میں "شہادت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ "جو اس کی شہادت (گواہی) دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں"۔ شہادت، قول سے اونچے درجے کی چیز ہے۔ کیونکہ خود لفظ شہادت میں علم و یقین کا مفہوم موجود ہے۔ سچّی شہادت وہی ہوتی ہے جو محض ظن و تخمین کی بنا پر نہیں بلکہ علم و یقین کے ساتھ دی جاتی ہے۔ دنیا کی عدالتوں میں بھی

سچّی شہادت وہی سمجھی جاتی ہے جو علم ویقین کے ساتھ دی جائے۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس لفظ پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ مختلف الفاظ میں قیدیں لگاکر یہ بات واضح کردی کہ ایمان کی شہادت سچی اور یقینی ہونی چاہیئے۔ جس میں کسی طرح کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔ حدیث ۳ میں صاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ گواہی ایسی ہو کہ گواہی دینے والے کو شک وشبہ نہ ہو۔ حدیث ۶ میں "خالصا مخلصا من قلبہ" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یعنی شہادت خالص بھی اور مخلصانہ بھی ہو اور دل کی گہرائی سے بھی ہو۔ تیسری بات قابلِ غور ہے کہ دل کی گہرائی سے خالص اور مخلصانہ شہادت دینے کے بعد کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اللہ اور اس کے رسول ؐ کی فرماں برداری اور ان کے احکام پر عمل کرنے سے اتنا غافل ہو کہ فرائض وواجبات بھی ادا نہ کرے اور اس کی عملی زندگی ویسی ہی ہو جیسی ان لوگوں کی جو ایمان نہیں لائے ہیں؟

اوپر جو حدیثیں پیش کی گئی ہیں ان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ محض شہادت کافی نہیں ہے۔ حدیث ۷ میں کنجی کے دندانے کی جو بات کہی گئی ہے اس سے مراد اعمال ہیں اور حدیث ۸ میں فرمایا گیا ہے "پھر وہ اپنے اعمال درست کرلیتا ہے"۔ اس طرح کی احادیث کے بارے میں محدثین اور علمائے امّت نے جو گفتگو کی ہے یہاں اسے پیش کرنا ضروری نہیں البتہ صرف حضرت حسن بصریؒ کا قول نقل کردینا مناسب ہے کیونکہ وہ نہ صرف اپنے زمانے کے ایک بڑے مفسّر، محدّث، عالمِ دین اور فقیہہ تھے بلکہ بہت بڑے صوفی بھی تھے اور تصوّف کے اکثر سلسلے تابعین کی جماعت میں سے انھیں پر ختم ہوتے ہیں۔ اس طرح کی حدیثوں پر گفتگو کرتے ہوئے مسلم شریف کی شرح میں امام نوویؒ نے لکھا ہے:

وقال بعضهم هي مجملة يحتاج الى شرح ومعناه من قال الكلمة وادى حقها وفريضتها۔

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیثیں مجمل ہیں اور شرح کی محتاج ہیں اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو کلمہ پڑھے اور اس کا حق اور اس کا عائد کردہ فریضہ ادا کرے۔

یعنی محض کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ کلمہ پڑھنے والے پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ کلمہ طیبہ تو وہ بیج ہے جس سے اسلامی شریعت کا پورا درخت پیدا ہوتا ہے۔

ریاء و سُمعة مخلصانہ ایمان کے بعد ہی اعمال صالحہ کا سوال پیدا ہوتا ہے اور اعمال خیر کو ریاء و سمعۃ سے بچائے بغیر اخلاص کا وجود ممکن نہیں ہے۔ اخلاص کو خراب کرنے والی چیزوں میں سب سے تباہ کن چیز ریاء و سمعۃ ہے۔ ریاء کی حقیقت اور مفہوم یہ ہے کہ آدمی کام تو نیکی کا کرے لیکن مقصد یہ ہو کہ لوگ اسے دیکھیں، کام کی تعریف اور اس شخص کا احترام کریں اور سُمعۃ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی نیکی کے کام اس ارادے سے کرے کہ لوگوں کے درمیان اُسے نیک نامی، شہرت اور جاہ و منزلت حاصل ہوگی۔ ریاء کبھی تو حقیقی نفاق سے پیدا ہوتی ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی ان آیتوں میں ہے:

> پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے گریز کرتے ہیں۔ (الماعون ۴ تا ۷)

ان آیتوں میں عہد رسالت کے منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ نماز میں غفلت کرتے ہیں بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ نماز سے غفلت

برتتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے نزدیک نماز کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ پڑھیں یا نہ پڑھیں ان کے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ وہ پڑھتے بھی ہیں تو دکھاوے کے لیے تاکہ لوگ ان کو مسلمان سمجھیں اور ان کا نفاق لوگوں سے مخفی رہے اور اسی بے ایمانی کی وجہ سے وہ اتنے بخیل ہیں کہ لوگوں کو ڈول، رسی، نمک، آگ جیسی معمولی چیزیں دینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ " جو ریاکاری کرتے ہیں " اس کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ وہ نمازیں محض دکھاوے کی پڑھتے ہیں اور دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ ان کے تمام نیکی کے کام محض دکھاوے کے ہیں خواہ وہ نماز ہو یا کوئی دوسرا نیک کام۔

منافقین کا یہ حال سورہ النساء آیت ۱۴۲ میں بھی بیان کیا گیا ہے:

" یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ جب یہ نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔"

اخلاص کے باب میں جس ریاء و سمعہ کی گفتگو ہوتی ہے وہ یہ ریاء و سمعہ نہیں ہے کیونکہ اس کا تو ایمان سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ اس باب میں جس ریاء و سمعہ کی گفتگو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عبادت و اطاعت تو اللہ ہی کے لیے کی جائے لیکن اپنے قصد و ارادہ بیں ریاء و سمعہ کو بھی داخل کر دیا جائے۔ مقصود صرف رضائے الٰہی اور آخرت کی کامیابی نہ ہو بلکہ یہ بھی ہو کہ لوگ دنیا میں تعریف کریں اور نیک نامی و شہرت اور جاہ و منزلت حاصل ہو۔ یہی وہ ریاء ہے جو اخلاص کے لیے تباہ کن ہے۔ اس سے عبادت و اطاعت باعث ثواب ہونے کے بجائے موجب عذاب ہو جاتی ہے۔ اسی ریاء و سمعہ کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ ارشاد ہے:

جندبؓ بن عبداللہ البجلی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص (نیکی میں) شہرت چاہے گا اللہ اس کو رسوا کن تشہیر سے دوچار کرے گا اور جو دکھاوے کے لیے نیکی کرے گا، اللہ اس کی نیت لوگوں کے سامنے کھول دے گا۔ (متفق علیہ)

امام بخاریؒ نے یہ حدیث کتاب الرقاق باب الریاء والسمعۃ میں اور امام مسلمؒ نے کتاب الزہد باب تحریم الریاء میں روایت کی ہے۔ دوسرے محدثین نے بھی اپنی کتابوں میں یہ حدیث لکھی ہے۔ اس حدیث میں ریاء وسمعہ کی جو سزا بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ریاء کار کی نیت اور ارادے کا پردہ فاش کر دیا جائیگا اور وہ لوگوں کے درمیان بہت ذلیل ہوگا۔ دنیا میں اگر اس کے قصد وارادہ کا پردہ چاک نہ بھی ہو تو قیامت کے بھرے میدان میں ضرور فاش ہوگا۔ لوگ جان لیں گے اور دیکھ لیں گے کہ نیک اعمال کے لبادے میں ایک دنیادار ریاکار آدمی چھپا ہوا تھا۔ غیرت مند آدمی کے لیے بھرے مجمع میں رسوائی وذلت بہت بڑی سزا ہے ——— ریاء کی قباحت بہت سی حدیثوں میں بیان کی گئی ہے میں یہاں چند اور حدیثوں کے ترجمے پیش کرتا ہوں:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ فرمایا:

اللہ فرماتا ہے کہ جس نے میرے لیے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ دوسرے کو بھی شریک کیا تو میں اس کو اس کے شرک کے ساتھ چھوڑ دوں گا اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بری ہوں، اور وہ عمل اسی کے لیے ہے جس کے لیے وہ کیا گیا ہے۔
(مشکوٰۃ کتاب الرقاق بحوالہ مسلم)

دوسرے کو اللہ کے ساتھ شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ عمل کرنیوالے کی غرض یہ بھی ہو کہ لوگ اس کو دیکھیں اور اس کی مدح وثنا کریں۔

۲۔ شدّادؓ بن اوس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا:

> جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔ (ایضاً بحوالہ مسند احمد)

۳۔ ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ ہم لوگ دجّال کا تذکرہ کر رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا کیا میں تمہیں وہ بات نہ بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے دجّال سے زیادہ خوفناک ہے؟ ہم نے کہا ہاں یارسول اللہ! آپؐ نے فرمایا:

> وہ شرک خفی ہے، کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہو اور محض اس بنا پر کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے اپنی نماز میں اضافہ کردے
>
> (ایضاً بحوالہ ابن ماجہ)

نماز میں اضافہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو رکعت نفل پڑھنی چاہتا تھا تو چار رکعتیں یا اس سے زیادہ پڑھے۔ شرک خفی کا مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک مخفی، چھپا ہوا شرک ہے۔ اس سے مومن مخلص کو ہوشیار رہنا چاہیے۔ بعض لوگ شرکِ خفی کو شرکِ خفیف یعنی ہلکا شرک سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ شرکِ جلی، کھلے ہوئے شرک سے بچنا آسان ہے لیکن "شرکِ خفی" چھپے ہوئے شرک سے بچنا مشکل ہے۔

۴۔ عمرؓ بن الخطاب، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

کہ آپؐ نے فرمایا:

"اس امت کے بارے میں مجھے ہر ایسے منافق سے اندیشہ ہے جس کی باتیں حکیمانہ اور عمل ظالمانہ ہوگا۔"

(ایضاً بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان)

۵ ۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کی پناہ مانگو جُبّ حزن سے، صحابہؓ نے پوچھا یارسول اللہؐ جُبّ حزن کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

"جہنم کی ایک وادی ہے جس سے خود جہنم روزانہ ایک سو بار پناہ مانگتی ہے، دریافت کیا گیا یارسول اللہؐ کون لوگ اس میں داخل ہونگے آپؐ نے فرمایا وہ علماء جن کے اعمال دکھاوے کے ہوں گے۔

(ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ)

حقیقت اخلاص کی توضیح قرآن مجید میں سورۃ البقرہ کے آخری حصے میں

انفاق فی سبیل اللہ کا حکم اور اس کی ترغیب دے کر یہ اچھی طرح واضح کردیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے اور جو صدقہ دیا جاتا ہے اس میں اخلاص کو ختم کرنے والی چیزیں کیا ہیں۔ اخلاص کی حقیقت جاننے کے لیے سورہ البقرہ رکوع ۳۶ اور ۳۷ کا مطالعہ کرنا چاہیئے ان دو رکوعوں میں مسلسل جو ہدایات دی گئی ہیں اور تمثیلات کے ذریعہ جو کچھ سمجھایا گیا ہے ان سے حقیقت اخلاص روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ہم یہاں ان تمام آیات کی تشریح نہیں کریں گے بلکہ صرف ان آیتوں کو پیش کریں گے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اخلاص کو ختم کرنے والی چیزیں کیا ہیں۔

اخلاص کو ختم کرنے والی چیزوں میں دو کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ مَنّ اور اَذیٰ۔ مَنّ، کسی کو کچھ دے کر یا اس کے ساتھ کوئی حُسنِ سلوک کر کے اس پر احسان جتانے کو اور اَذیٰ اس شخص کو تکلیف پہنچانے اور اس کی دل آزاری کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ عام طور پر یہ دونوں چیزیں یکے بعد دیگرے یا بیک وقت ظہور میں آتی ہیں اس لیے قرآن میں ان دونوں کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی آیات کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا اجر انھیں لوگوں کے لیے ہے جن کا صدقہ احسان جتانے اور دل آزاری کرنے کی آفت سے پاک ہو۔ فرمایا گیا:

"جو لوگ اپنے مال، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ تکلیف پہنچاتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔" (البقرہ: ۲۶۲)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کو صدقہ دینے کا اجر اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس شخص پر نہ احسان جتایا جائے اور نہ اس کی دل آزاری کی جائے لیکن اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ آگے فرمایا گیا:

ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی درگزر، اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ایذا رسانی ہو، اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔ (ایضاً ۲۶۳)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی سائل کو ایک میٹھے بول، مثلاً یہ کہہ کر کہ بھائی اس وقت معاف کرو، واپس کر دینا اور اس کی کسی غصہ دلانے والی بات سے چشم پوشی کر لینا اس صدقہ و خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد اس پر احسان داری

اور اس کی دل آزاری ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان دو آفتوں کے ساتھ خیرات بے کار ہے۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی دو صفتوں پر ختم ہوئی ہے۔ اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔ یہاں ان دو صفتوں کا ذکر یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ اللہ تمہارے صدقہ و خیرات کا محتاج نہیں ہے کہ وہ تمہارے غیر مخلصانہ صدقے کو قبول کرلے وہ بے نیاز ہے اور تم اپنی ہر چیز میں اس کے نیاز مند اور حاجت مند ہو، نیز یہ کہ وہ حلیم اور بردبار ہے جو تمہاری بے شمار خطاؤں کو معاف کرتا رہتا ہے، وہ ایسے کم ظرف لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اس کے دیئے ہوئے مال میں سے اس کے کسی بندے کو کچھ دیں اور پھر اس پر احسان جتائیں، اپنی باتوں سے اُسے تکلیف پہنچائیں اور کسی سائل کی ذرا سی تکلیف دہ بات کو بھی برداشت نہ کرسکیں ـــــ اس آیت میں بہت کچھ کہہ کر بھی اس پر اکتفا نہیں کیا گیا اور آگے صاف صاف یہ فرمایا گیا:

> اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔
>
> (ایضاً ۲۶۴)

یہاں باطل کر دینے کے معنی اکارت کرنے اور خاک میں ملا دینے کے ہیں۔ اس آیت میں اخلاص کو ختم کر دینے والی ان دونوں چیزوں کو ریاء کے مماثل قرار دیا گیا ہے جس طرح ریاء سے اخلاص تباہ ہو جاتا ہے اسی طرح صدقہ دیکر احسان جتانے اور دل آزاری کرنے سے بھی اخلاص کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ریاء سے اور منّ و اذیٰ سے صدقات کس طرح برباد ہو جاتے ہیں اس کو

دو بہترین تمثیلوں سے واضح کیا گیا ہے:

پہلی تمثیل ایسے شخص کی تمثیل یوں ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش ہو اور وہ اس کو بالکل سپاٹ پتھر چھوڑ جائے۔ ان کی کمائی میں سے کچھ بھی ان کے پلّے نہیں پڑے گا اور اللہ ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا۔ (ایضاً ۲۶۴)

یہ احسان جتانے والے، دُکھ دینے والے اور ریاکاری کرنے والے شخص کی تمثیل ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

ایسے شخص کی تمثیل اس کسان سے دی ہے جس نے اپنی فصل ایک ایسی زمین پر بوئی جس کے نیچے سخت اور چکنی چٹان تھی۔ بارش کا جو ایک زور کا دونگڑا پڑا تو اوپر کی ساری مٹی فصل سمیت وادی میں بہہ گئی اور نیچے سے گنجے سر کے مانند چٹان نکل آئی۔ فرمایا کہ جس طرح اس محروم القسمت کسان کی ساری محنت رائیگاں چلی جاتی ہے اسی طرح اس خیرات کرنے والے کی خیرات برباد ہو کر رہ جاتی ہے جو خیرات کرنے کے بعد احسان جتاتا اور دل آزاری کرتا ہے، فرمایا کہ ایسے لوگ اپنی ساری خیر خیرات ضائع کر بیٹھتے ہیں، اس کا کوئی حصہ بھی وہ بچا نہیں پاتے۔ (تدبر قرآن ج ۱ ص ۵۷۲)

صدقہ دینے کے بعد احسان جتانا اور دل آزاری کرنا اس بات کی دلیل ہے صدقہ دینے کا مقصد صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا نہ تھا بلکہ یہ تھا یا یہ بھی تھا کہ جس کو صدقہ دیا جا رہا ہے وہ صدقہ دینے والے کا احسان مند ہو، اُسے جُھک کر سلام کرے اور موقع پر صدقہ دینے والے کی خدمت سے بھی دریغ نہ کرے، لیکن جب اس کا یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تو لوگوں کے سامنے اس پر اپنے صدقے

کا احسان جتا کر اور اُسے ناشکرا کہہ کر اس کو تکلیف پہنچاتا، اس کی دل آزاری کرتا اور اس طرح اس پر اپنی مال داری اور برتری کی دھونس جماتا ہے۔

دوسری تمثیل کیا تم میں سے کوئی بھی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، نیچے اس کے نہریں بہہ رہی ہوں، اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی ناتواں ہوں اور باغ پر سموم کا ایک بگولا پھر جائے اور وہ جل کر خاک ہو جائے۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تم پر واضح کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔

(ایضاً ۲۶۶)

کتنی واضح، کتنی مؤثر اور کتنی دل آویز ہے یہ تمثیل، اگر اب بھی کوئی مسلمان اپنے نیک اعمال میں اخلاص پیدا نہیں کرتا تو اسے آخرت میں دیوالیہ ہونے سے کون بچا سکتا ہے۔ اوپر جو تمثیل پیش کی گئی تھی یہ اس کی مزید وضاحت ہے۔ احادیث نبویؐ میں بھی احسان جتانے والوں کے لیے سخت وعید آئی ہوئی ہے:

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں احسان جتانے والا اور ماں باپ کا نافرمان داخل نہیں ہوگا۔ (مظہری بحوالہ نسائی و دارمی)

اخلاص کو ختم کرنے والی تیسری چیز تیسری چیز یہ ہے کہ آدمی اچھا اور عمدہ مال موجود ہونے کے باوجود اللہ کی راہ میں بالقصد ردّی اور خراب مال خرچ کرے:

اے ایمان والو! اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو
اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا
کی ہیں اور اس میں سے وہ مال خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو، جس کو
خدا کی راہ میں خرچ کرنے پر تو آمادہ ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تم کو لینا
پڑ جائے تو بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو اور اس بات کو خوب یاد
رکھو کہ اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ (ایضاً، ۲۶۷)

اس آیت میں "خبیث" کا لفظ ردی اور گھٹیا مال کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا گھٹیا مال جو تمہیں لینا پڑے تو دل پر جبر کیے بغیر تم اس کو قبول نہ کرو اسے اللہ کی راہ میں نہ دو، اللہ کی راہ میں ایسا مال دینا حد درجہ کی دنارت اور کم ظرفی ہے۔ تمہیں بڑی گائے برہمن کو دان کرنے کی روش اختیار نہیں کرنی چاہئے۔ البتہ اگر کسی کے پاس حلال کمائی کا گھٹیا مال ہی ہو اور اچھا مال موجود نہ ہو تو اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا درست ہے۔ یہاں جس بات کو اخلاص کے خلاف قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اچھے مال کو اپنے لیے بچا کر رکھے اور اللہ کی راہ میں دینے کے لیے گھٹیا اور ردی مال ہی منتخب کرے۔

اخلاص کا اعلیٰ درجہ

سورۃ الدہر میں ابرار یعنی اللہ کے فرماں بردار، وفادار اور نیکوکار بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے
ہیں ○ ہم تمہیں خالص اللہ کی رضا کے لیے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے
نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے
عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن

ہوگا۔"   (الدہر: ۸ تا ۱۰)

یہ اخلاص کا وہ درجہ ہے جو ابرار یعنی اللہ کے وفادار اور اس کی محبت میں سرشار بندوں کو نصیب ہوتا ہے۔

"قیدی" عام ہے مسلم ہو یا کافر۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں یہ حکم دیا تھا کہ جس کے پاس کوئی قیدی رہے وہ اس سے اچھا برتاؤ کرے، اس حکم کی تعمیل میں صحابۂ کرام میں سے جن لوگوں کے پاس قیدی تھے وہ ان کو اپنے سے بہتر کھانا کھلاتے تھے۔

یہ بات جو کہی گئی کہ "ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے" اس پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے یہ حاشیہ لکھا ہے:

> "ہم تو اخلاص کے ساتھ کھلانے پلانے کے بعد بھی ڈرتے ہیں کہ دیکھئے ہمارا عمل مقبول ہوا یا نہیں، مبادا اخلاص میں کمی رہ گئی ہو اور اُلٹا مُنہ پر مارا جائے۔"

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حاجت مندوں کی مدد کر کے ان سے شکریہ چاہنا بھی اخلاص کے منافی ہے۔

حقیقت اخلاص کی توضیح احادیث نبوی میں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی اخلاص کی حقیقت پوری طرح واضح ہوگئی ہے۔ ریاء و سمعہ کے بارے میں چند احادیث کے ترجمے اوپر پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہاں چند اور حدیثوں کے ترجمے پیش کرتا ہوں:

۱۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھوڑے تین قسم کے لوگوں کے لیے ہیں، ایک شخص کے لیے وہ باعثِ اجر، ایک

شخص کے لیے وہ ستر (حجاب) اور ایک شخص کے لیے وہ موجب عذاب ہوتے ہیں۔ وہ باعثِ اجر اس شخص کے لیے ہیں جس نے انھیں جہاد فی سبیل اللہ کے قصد سے پالا ہے، اس نے انھیں کسی چراگاہ یا باغ میں لمبی ڈوری سے باندھا، اپنی لمبی رسّی میں وہ جو کچھ کرتے ہیں (کھانا پینا، چلنا پھرنا) وہ سب اس شخص کے لیے حسنات (نیکیاں) بن جاتے ہیں اور اگر وہ اپنی رسّیاں توڑ ڈالیں اور اس مقام سے کچھ دُور تک دوڑ لگائیں تو ان کے قدموں کے نشانات اور ان کی لیدیں اس شخص کے لیے نیکیوں میں شمار کی جائیں گی اور اگر وہ کسی نہر پر جاکر۔ جب کہ ان کے مالک نے اس کا ارادہ بھی نہ کیا ہو۔ پانی پئیں تو پانی کے گھونٹ بھی اس شخص کے لیے نیکیاں بن جائیں گے۔ اور ایک وہ شخص ہے جس نے انھیں استغناء حاصل کرنے اور اس ارادے سے پال رکھا ہے کہ لوگوں سے کچھ مانگنا نہ پڑے پھر یہ کہ وہ ان کی گردنوں اور پیٹھوں کا حق ادا کرنا بھی نہ بھولا ہو (یعنی ان کی زکوٰۃ ادا کی ہو اور لوگوں کو عاریۃً سواری کے لیے دیا ہو) تو وہ گھوڑے اس شخص کے لیے ستر (پردہ) ہیں ——— اور ایک وہ شخص ہے جس نے انھیں، فخر، ریاء اور اہلِ اسلام کی دشمنی کی نیت سے باندھ رکھا ہے، تو وہ گھوڑے اس کے لیے گناہ اور موجب سزا ہیں ——— یہ حدیث بخاری کی کتاب الجہاد اور کتاب التفسیر میں اور موطا امام مالک کی کتاب الرقاق میں ہے۔ اس نے اخلاص کو غیر اخلاص سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ جہادِ فی سبیل اللہ کے قصد اور ارادے سے جو تیاری بھی کی جائے گی خواہ وہ گھوڑے پالنے کی شکل میں ہو یا اس زمانے میں جدید آلاتِ جنگ اور سامانِ حمل و نقل کی شکل میں، وہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخلصانہ شمار ہوگی اور اس کا اجر اس وسعت کے ساتھ ملے گا جس کا ایک نقشہ اس حدیث میں کھینچا گیا ہے ———

دوسرے شخص کی نیت چونکہ محض اپنے فقر کو مخفی رکھنا اور لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچنا ہے جو ایک مباح کام ہے اس پر نہ ثواب ہے نہ عذاب۔ ستر کے معنی یہ ہیں کہ وہ گھوڑے اس شخص کی اصل حالت کے لیے پردہ ہیں۔ تیسرے شخص نے ایسی چیزوں کا ارادہ کیا ہے جو گناہ ہیں اس لیے وہ مستحقِ سزا ہے۔ تین شخصوں کی الگ الگ نیتیں بیان کر کے حضورؐ نے اللہ کے لیے مخلصانہ نیت کو بالکل ممتاز کر دیا ہے۔ اس حدیث کا مطالعہ قرآن کی آیتِ ذیل کی روشنی میں کرنا چاہیے۔

> "اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہو گا۔" (الانفال: ۶۰)

۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہؐ کوئی آدمی ایسا ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کے ذریعہ متاعِ دنیا میں سے کوئی متاع (سامان) حاصل کرنا چاہتا ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔

(مشکوٰۃ کتاب الجہاد بحوالہ ابوداؤد)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کے قصد سے جہاد لڑنا مخلصانہ نہیں ہے۔ یہ ارادہ اخلاص کے خلاف ہے۔

۳۔ ایک مرتبہ شفیا اصبحی مدینہ آئے، دیکھا کہ ایک شخص کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے، پوچھا کون ہیں؟ لوگوں نے کہا، ابوہریرہؓ! یہ سُن کر شفیا اصبحی ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت ابوہریرہؓ لوگوں سے حدیث بیان کر رہے تھے، جب حدیث سُنا چکے اور مجمع چھٹ گیا، تو شفیا نے ان سے کہا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی حدیث سُنایئے جس کو آپ نے اُن سے سُنا ہو، سمجھا ہو، جانا ہو، ابوہریرہؓ نے کہا ایسی ہی حدیث سُناؤں گا یہ کہا اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے، تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو کہا میں تم سے ایک ایسی حدیث بیان کروں گا جو آپؐ نے اس گھر میں بیان فرمائی تھی اور اس وقت میرے اور آپؐ کے سوا کوئی تیسرا شخص نہ تھا، اتنا کہہ کر زور سے چلّائے اور پھر بے ہوش ہو گئے، افاقہ ہوا تو مُنہ پر ہاتھ پھیر کر کہا میں تم سے ایسی حدیث بیان کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گھر میں بیان فرمائی تھی اور وہاں میرے اور آپؐ کے سوا کوئی شخص نہ تھا، یہ کہا اور پھر چیخ مار کر، غش کھا کر، مُنہ کے بل گر پڑے، شفیا اصبحی نے تھام لیا اور دیر تک سنبھالے رہے، ہوش آیا تو کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قیامت کے دن جب خدا بندوں کے فیصلہ کے لیے اُترے گا تو سب سے پہلے تین آدمی طلب کیے جائیں گے، عالمِ قرآن، راہِ خدا میں مقتول، اور دولت مند، پھر خدا عالم سے پوچھے گا کیا میں نے تجھ کو قرآن کی تعلیم نہیں دی، وہ کہے گا "ہاں خدایا" فرمائے گا تو نے اس پر عمل کیا، وہ کہے گا "رات دن اس کی تلاوت کرتا تھا" خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے، تو اس لیے تلاوت کرتا تھا کہ لوگ تجھ کو قاری کا خطاب دیں، چنانچہ خطاب دیا۔ پھر دولت مند سے پوچھے گا کیا میں نے تجھ کو صاحب مقدرت کر کے لوگوں کی احتیاج سے بے نیاز نہیں کر دیا؟ وہ کہے گا "ہاں خدایا"

فرمائے گا "تو نے کیا کیا" وہ کہے گا میں صلہ رحمی کرتا تھا، صدقہ دیتا تھا، خدا فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے، بلکہ اس سے تیرا مقصد یہ تھا کہ تو فیاض اور سخی کہلائے اور کہلایا۔ پھر وہ جسے راہ خدا میں جان دینے کا دعویٰ تھا، پیش ہوگا، اس سے سوال ہوگا تو کیوں مارڈالا گیا، وہ کہے گا تو نے اپنی راہ میں جہاد کرنے کا حکم دیا تھا، میں تیری راہ میں لڑا اور مارا گیا، خدا فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے، چاہتا تھا کہ تو دنیا میں جری اور بہادر کہلائے تو یہ کہا جاچکا، یہ حدیث بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے زانو پر ہاتھ مار کر فرمایا، ابوہریرہؓ پہلے انھیں تینوں سے جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی، امیر معاویہؓ نے یہ حدیث سنی تو کہا جب ان لوگوں کے ساتھ ایسا کیا گیا تو اور لوگوں کا کیا حال ہوگا یہ کہہ کر ایسا زار وقطار روئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ مر جائیں گے، جب ذرا سنبھلے تو منہ پر ہاتھ پھیر کے پُرموعظت آیتیں پڑھیں۔ (سیر الصحابہ ج ۶ مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ بحوالہ ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ)

ہمارے پاس ترمذی کا جو مطبوعہ نسخہ ہے اس میں یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے منہ پر ہاتھ پھیر کر یہ کہا تھا کہ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا اور اس کے بعد دو آیتیں پڑھی تھیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

جو لوگ بس اسی دنیا کی زندگی اور اس کی خوش نمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی، مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے اور جو کچھ انھوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہوگیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔ (ہود: ۱۵، ۱۶)

یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ امام مسلم نے بھی کتاب الامارۃ باب من قاتل للریاء والسمعۃ میں روایت کی ہے۔ یہ لرزہ انگیز حدیث اتنی واضح ہے کہ کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔

دنیا میں مومن کے لیے بشارت

ریاء وسمعہ چونکہ اخلاق کو تباہ کردیتے ہیں اس لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بعض ایسی باتوں سے بھی ڈرنے لگے کہ کہیں یہ بھی ریا میں داخل نہ ہو، انھوں نے حضورؐ سے دریافت کرکے اس کے بارے میں اطمینان حاصل کیا۔ اس سلسلے کی دو حدیثیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا، آپؐ کا کیا خیال ہے کوئی آدمی کوئی عملِ خیر کرتا ہے پھر لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا مومن کے لیے وہ بشارت ہے جو دنیا میں اُسے ملتی ہے۔

(مسلم کتاب البر والصلۃ والادب آخری باب)

۲۔ ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہؐ ایک شخص عملِ خیر لوگوں سے چُھپا کر کرتا ہے لیکن جب کسی طرح لوگوں کو اس کی خبر ہو جاتی ہے تو اس کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔ ابوہریرہؓ نے کہا کہ اس کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیا کہ اس کے لیے دو اجر ہیں، ایک مخفی رکھنے کا اجر اور دوسرا اعلانیہ عملِ خیر کا اجر۔ بعض اہل علم نے اس حدیث کی یہ تشریح کی ہے کہ ... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "تم لوگ زمین میں اللہ کے گواہ ہو" اس بنا پر لوگوں کی تعریف سے اُسے خوشی ہوتی ہے کہ وہ اس کے عملِ خیر کے گواہ ہو گئے اور بعض نے یہ توضیح کی

ہے کہ اس کو خوشی اس لیے حاصل ہوتی ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی اس عمل خیر کی ترغیب ہوگی، لیکن اگر وہ اس لیے خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم اور احترام کریں تو یہ ریا ہے۔

(ترمذی ابواب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ)

خوشی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نیکی سے خوش ہونا اور بدی سے ناخوش ہونا، ایمان کی علامت ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جس کو کوئی نیکی خوش کرے اور کوئی بدی ناخوش کرے، وہ مومن ہے۔

اوپر کی دو حدیثوں سے واضح ہوا کہ لوگوں کو خوش کرنے اور ان کی تعریف حاصل کرنے کے لیے عمل کرنا ریا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے مطلع ہو جانے کے بعد اس لیے خوش ہونا کہ اب لوگ اس کی تعظیم کریں گے ریا میں داخل ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص لوگوں سے چھپا کر خالصاً مخلصاً اللہ کی رضا کے لیے عمل خیر کرتا ہے اور لوگوں کے مطلع ہو جانے کے بعد وہ شخص اس لیے خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس کے گواہ ہو گئے یا یہ کہ دوسروں کو اس عمل صالح کی ترغیب ہوگی یا یہ کہ طبعاً مومن اپنی اچھی حالت سے خوش ہوتا ہے تو یہ ریا نہیں بلکہ مومن کے لیے بشارت ہے۔

صوفیۂ کرام کے اقوال

اوپر قرآن اور احادیث سے جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں مخلص صوفیہ کے چند اقوال کا مطالعہ بھی کر لینا چاہیے۔

۱۔ استاذ ابو علی دقاق نے کہا کہ اخلاص کامل یہ ہے کہ اللہ کی طاعت و عبادت سے صرف اس کا تقرب مقصود ہو، اس کے علاوہ کچھ اور مقصود نہ ہو۔

۲۔ "ابوعثمان نے کہا، اخلاص یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام اعمال خیر میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر نظر رکھے اور یہ بھول جائے کہ مخلوق اس کو دیکھ رہی ہے۔"
ہمیشہ اللہ کے فضل پر نظر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ یہ ملحوظ رکھے کہ جو عمل خیر وہ کر رہا ہے وہ محض اللہ کے فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے۔

۳۔ " حذیفۃ المرعشی نے کہا، اخلاص یہ ہے کہ بندے کے افعال ظاہر و باطن ہر جگہ یکساں ہوں، کسی انسان کے وجود و عدم وجود سے ان میں کوئی تغیر واقع نہ ہو۔"

یہاں ظاہر سے جلوت اور باطن سے خلوت مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جس طرح اور جس کیفیت کے ساتھ تنہائی میں عمل خیر کرتا ہے اسی انداز سے لوگوں کے سامنے بھی کرے۔ مثال کے طور پر ایسا نہ ہو کہ تنہائی میں تو نماز جلدی جلدی ادا کرے اور لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرے، کیونکہ ایسا کرنا کھلی ہوئی ریا ہے۔

۴۔ فضیل بن عیاض نے کہا، لوگوں کی وجہ سے عمل ترک کرنا ریا ہے اور لوگوں کے لیے عمل کرنا شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تمہیں ریا اور شرک دونوں سے بچائے۔"

لوگوں کی وجہ سے ترکِ عمل کو ریا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عملِ خیر کو اس خوف سے ترک کرنا کہ کہیں لوگ اس کو ریاکار نہ سمجھ لیں یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ لوگوں کی نگاہ میں مخلص بنے رہنے کی خواہش سے مغلوب ہے تاکہ لوگ اس کا احترام کرتے رہیں۔ یہ ریا کی وہ قسم ہے جو عمل میں نہیں بلکہ ترکِ عمل میں رونما ہوتی ہے۔ حضرت فضیلؒ کے پورے قول کا مطلب یہ ہے کہ عمل یا ترک عمل میں مخلوق کی تعریف یا مذمت کو پیشِ نظر رکھنا اخلاص کے خلاف

آدمی کو اچھا عمل صرف اللہ کی خوشنودی اور اس کے امتثالِ امر کی نیت سے کرنا چاہئے، اس کے بارے میں لوگوں کا خیال کچھ بھی ہو۔

۵۔ سہل بن عبداللہؒ سے پوچھا گیا کہ نفس پر سب سے زیادہ سخت چیز کیا ہے، انھوں نے جواب دیا کہ اخلاص، کیونکہ اس میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

۶۔ یوسف بن حسینؒ نے کہا کہ دنیا میں سب سے نادر شئے اخلاص ہے۔ میں اپنے دل سے ریار کو دُور کرنے کی جدوجہد کرتا رہتا ہوں، لیکن وہ رنگ بدل بدل کر سامنے آتی رہتی ہے (۱)

امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں ان میں کے اکثر اقوال نقل کیے ہیں میں ان کی کتاب سے چند مزید باتیں یہاں پیش کرتا ہوں:

۱۔ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے کہا، قلتِ عمل کی فکر نہ کرو، قبولِ عمل کی فکر کرو اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل سے فرمایا تھا کہ عمل میں اخلاص پیدا کرو، قلیل عمل بھی تمہارے لیے کافی ہوگا (۲) یہ روایت نوافل کے لیے ہے، فرائض تو متعین ہیں ان میں کمی بیشی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ معروف کرخیؒ اپنے آپ کو مارتے اور کہتے یا نفس اخلصی تخلصی

---

(۱) یہ تمام اقوال رسالہ قشیریہ باب الاخلاص سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔

(۲) معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن بھیجا تو انھوں نے کہا، مجھے وصیت فرمایئے، آپؐ نے فرمایا اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرو، تمہارے لیے قلیل عمل بھی کافی ہوگا۔ (حاکم و بیہقی فی شعب ۱/۱۰)

(اے نفس مخلص بن، نجات پائے گا)۔

۳۔ ایوب السجستانیؒ نے کہا، نیتوں میں اخلاص پیدا کرنا، عمل کرنے والوں پر تمام اعمال سے زیادہ سخت ہے۔

۴۔ یحییٰ بن معاذ نے کہا، اخلاص، عمل کو تمام عیوب سے اس طرح الگ کر دینے کو کہتے ہیں جس طرح دودھ، گوبر اور خون سے الگ کر دیا جاتا ہے۔

۵۔ صوفیہ کا ایک قول یہ ہے: علم بیج ہے، عمل کھیت ہے اور اخلاص اس کا پانی ہے۔

۶۔ بنی اسرائیل کے ایک عابد کی حکایت ہے کہ وہ ایک طویل مدت سے عبادت میں مشغول تھے، کچھ لوگ ان کے پاس آئے اور کہا کہ یہاں کے کچھ لوگوں نے ایک درخت کی پوجا شروع کر دی ہے یہ سن کر ان کو غصہ آیا، کلہاڑی اپنے کندھے پر رکھی اور اس درخت کو کاٹنے کے ارادے سے روانہ ہوئے، راستے میں شیطان، ایک بوڑھے آدمی کی شکل میں ملا۔ اس نے کہا اللہ تم پر رحم کرے، کہاں چلے؟ انھوں نے کہا میں اس درخت کو کاٹنے جا رہا ہوں، اس نے کہا بھلا آپ کو اس سے کیا تعلق؟ آپ نے کیوں اپنی عبادت ریاضت ترک کی اور کسی دوسرے کام کے لیے اپنے کو فارغ کیا۔ انھوں نے کہا یہ کام بھی میری عبادت ہی کا حصہ ہے، اس جواب کے بعد اس نے کہا میں تمھیں یہ درخت نہیں کاٹنے دوں گا، وہ لڑنے پر تیار ہو گیا، عابد نے اس کو پکڑ کر پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر بیٹھ گئے، تب اس نے کہا مجھے چھوڑ دو میں تم سے کچھ اور گفتگو کرنا چاہتا ہوں، عابد نے اُسے چھوڑ دیا، ابلیس نے کہا، اے جناب، اللہ نے اس درخت کو کاٹ ڈالنا آپ پر فرض نہیں کیا ہے، آپ خود اس درخت کی عبادت نہیں کر رہے ہیں، دوسروں کے عمل کی آپ پر کوئی ذمہ داری

نہیں ہے، اللہ اپنے انبیاء بھیجتا رہتا ہے اگر وہ چاہے تو یہاں ایک نبی بھیج دے اور انھیں اسے کاٹنے کا حکم دے۔ اس کے بعد پھر عابد نے کہا، میں اس کو ضرور کاٹوں گا۔ ابلیس پھر جنگ پر آمادہ ہو گیا اور عابد نے اسے پھر پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر جا بیٹھا۔ اب ابلیس عاجز ہو گیا۔ اور اس نے کہا، کیا آپ ایک فیصلہ کن بات نہ سنیں گے جو آپ کے لیے بہت نفع بخش ہے، عابد نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا مجھے چھوڑ دیجیے تو بتاؤں، عابد اس کے سینے سے نیچے اتر آئے، اس نے کہا (یہی ابلیس کا آخری حربہ تھا) آپ ایک محتاج آدمی ہیں، آپ کے پاس کچھ نہیں ہے، آپ ان دوسرے لوگوں پر بوجھ بنے ہوئے ہیں جو آپ کی کفالت کرتے ہیں اور شاید آپ یہ پسند کرتے ہیں کہ آپ کو اپنے احباب پر فضیلت حاصل ہو، اپنے پڑوسیوں کی مدد کریں، خود آسودہ ہوں اور دوسرے لوگوں سے بے نیاز ہو جائیں، یہ سن کر عابد نے کہا ہاں، ابلیس نے کہا تو آپ اس کام سے باز آجائیں، اس کے بدلے میں مجھ پر آپ کا یہ دین ہوگا کہ روزانہ رات کے وقت آپ کے سر کے پاس دینار رکھ دوں، صبح اٹھ کر آپ اسے لے لیں اور ان کو اپنے اوپر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کریں اس کے علاوہ اپنے احباب کو صدقہ دیں، یہ آپ کے لیے اور دوسرے مسلمانوں کے لیے اس درخت کو کاٹنے سے بہتر ہے کہ آپ ایک درخت کاٹیں گے تو اس کی جگہ لوگ دوسرا درخت لگا دیں گے اور اس درخت کو کاٹ ڈالنے سے ان کو نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ اس سے دوسرے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا۔ ابلیس کا یہ تیر نشانے پر بیٹھا، عابد سوچنے لگا اور دل میں کہا کہ نبی نہیں ہوں کہ مجھ پر اس درخت کو کاٹ ڈالنا لازم ہو، نہ اللہ نے مجھے اسے کاٹنے کا حکم دیا ہے کہ میں نہ کاٹوں تو گنہگار ہو جاؤں گا اور اس بوڑھے نے جو بات کہی وہ زیادہ فائدہ مند ہے۔ اس

کے بعد ابلیس نے اپنے وعدے کو پورا کرنے کی قسم کھائی اور عابد اپنے گھر لوٹ گیا۔ صبح کو اس نے اپنے سر کے پاس دو دینار دیکھے، اس نے اس کو اٹھالیا، دوسری اور تیسری صبح کو بھی دینار رکھے ہوئے ملے، لیکن اس کے بعد دینار رکھے ہوئے نہیں ملے، اب تو اس کو بہت غصہ آیا اور کلہاڑی اپنے کندھے پر رکھ کر نکلا، ایک بوڑھے کی شکل میں شیطان پھر ملا۔ اس نے پوچھا، کہاں چلے؟.. جواب ملا اس درخت کو کاٹنے جا رہا ہوں، اس نے کہا، تم جھوٹے ہو، بخدا تم اسے کاٹنے پر قادر نہیں ہو اور نہ تم اس تک پہنچ سکتے ہو، یہ سن کر عابد نے پہلے کی طرح اس کو پکڑ کر پچھاڑنا چاہا، ابلیس نے کہا اب تم نہیں پچھاڑ سکتے یہ کہہ کر ابلیس نے اس کو پکڑا اور پچھاڑ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا عابد اس کے قدموں کے درمیان ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گوریا چڑیا۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر تم درخت کو کاٹنے سے باز نہ آئے تو میں تم کو ذبح کر دوں گا۔ عابد نے محسوس کیا کہ اس میں مقابلے کی طاقت نہیں ہے، کہا تم مجھ پر غالب آگئے، مجھے چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ پہلے میں کیوں تم پر غالب آگیا تھا اور اب تم کیوں مجھ پر غالب آگئے، ابلیس نے کہا پہلی دفعہ تمہارا غصہ خالصۃً اللہ کے لیے تھا اور تمہاری نیت آخرت میں ثواب حاصل کرنے کی تھی اس لیے اللہ نے تمہارے مقابلے میں مجھے مغلوب کر دیا اور اس دفعہ تمہارا غصہ اپنے نفس اور دینار کے لیے ہے اس لیے میں نے تم کو پچھاڑ دیا ——— واقعہ یہ ہے کہ آدمی اخلاص کے بغیر شیطان سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ (۱)

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴ باب الاخلاص

اخلاص کی نعمت کن لوگوں کو ملتی ہے؟

امام غزالیؒ نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ اخلاص کی نعمت انھیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کے قلب و دماغ پر آخرت کی فکر غالب آجائے اور یہی ان کے تمام دنیوی نفع و نقصان کا پیمانہ بن جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ چیز نفس سے جہاد کیے بغیر حاصل نہیں ہوتی، آدمی کا نفس اس کو دنیا اور مرغوبات دنیا کی طرف نہ صرف مائل بلکہ اسی کو نفع و نقصان کا معیار بنا دینے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ اس سرکش گھوڑے کے منہ میں تقویٰ کی خاردار لگام ڈال کر اس کو رام کیے بغیر اخلاص کا حصول ممکن نہیں ہے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ عبادت و اطاعت میں بھی دنیا گھس آتی ہے اسی لیے بزرگانِ دین نے اخلاص کو مشکل ترین کام قرار دیا ہے۔

توبہ

صوفیہ کرام نے توبہ کو ہر "مقام" کی اصل اور ہر "حال" کی کلید قرار دیا ہے، توبہ ان کے نزدیک منازل سالکین کی سب سے پہلی منزل اور مقاماتِ طالبین کا سب سے پہلا مقام ہے، اس کے بغیر نہ کسی کو کوئی مقام حاصل ہو سکتا ہے اور نہ کوئی "حال" نصیب ہو سکتا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے توبہ کو وہی اہمیت دی ہے جو دینِ اسلام میں اُسے حاصل ہے۔

توبہ کے لغوی معنی کسی شئے سے کسی دوسری شئے کی طرف رجوع کرنے کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں توبہ کے معنی یہ ہیں کہ بندہ ان تمام چیزوں سے جو شرعاً مذموم ہیں ان چیزوں کی طرف رجوع کرے جو شرعاً محمود ہیں، مختصر لفظوں میں توبہ، معصیت اور سرکشی سے اطاعت و بندگی کی طرف پلٹنے کا نام ہے۔ سب سے بڑی معصیت اور سرکشی کفر و شرک ہے اس لیے جب تک کوئی شخص اس سے پلٹ کر ایمان و اسلام کے دائرے میں نہ آجائے، آگے کی کسی منزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن میں کفر و شرک سے رجوع کرنے کے لیے بھی توبہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ — پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور

وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ   زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

(التوبہ ع ۲)

توبہ کے لیے استغفار کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر کفر وشرک سے استغفار کا حکم دیا جائے تو اس کا مطلب اسلام قبول کرنا ہوگا۔ سورۂ نوحؑ میں ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ   تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے

اِنَّہٗ کَانَ غَفَّارًا ۝   بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو کفر وشرک ہی سے استغفار کا حکم دیا تھا۔

مسلمانوں کو توبہ واستغفار کا حکم قرآن کی متعدد آیتوں میں دیا گیا ہے۔ امام قشیریؒ نے اپنے رسالے میں اور امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں یہ دو آیتیں پیش کی ہیں:

(۱) وَتُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا   اے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو،

اَیُّھَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝   توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

(النور ع ۴)

(۲) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا   اے ایمان والو! اللہ سے توبہ کرو، صاف

اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا۔ (التحریم ۱۶)   دل کی توبہ۔

ان آیتوں کے علاوہ متعدد آیتوں میں مسلمانوں کو استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ المزمل میں فرمایا گیا:

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ   اور اللہ سے مغفرت طلب کرو بے شک

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝   اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

"توبۂ نصوح" اس توبہ کو کہتے ہیں جو تمام آمیزشوں سے پاک ہو اور

خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے گناہ بخشوانے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کی گئی ہو۔

شریعت اسلامی میں ہر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے اور اس کی فرضیت پر کتاب و سنت اور اجماع امت کے دلائل اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کو سمیٹنا بھی آسان نہیں ہے۔ کسی بھی گناہ سے توبہ کرنا ہو تو اس کے صحیح ہونے کے لیے تین شرطیں ہیں :

۱۔ اس معصیت سے فوراً باز آجائے اور ترک کردے۔

۲۔ اس پر نادم ہو۔

۳۔ عزم کرے کہ اب کبھی اس گناہ کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی غائب ہوگی تو، توبہ صحیح نہیں ہوگی۔ اس میں چوتھی شرط کا اضافہ اس وقت ہو جاتا ہے جب کسی ایسے گناہ سے توبہ کرنا ہو جس کا تعلق حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق سے ہو، مثلاً اگر کسی شخص نے کسی کا مال ہڑپ کر لیا تھا اور اب اس گناہ سے توبہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے صحیح ہونے کی چوتھی شرط یہ ہوگی کہ وہ اس شخص کو یا اس کے وارثوں کو واپس کرے یا اگر کسی کی غیبت کی تھی تو اس سے معافی چاہے یا اگر کسی کو جسمانی تکلیف پہنچائی تھی تو اس کو موقع دے کہ وہ بھی اسے تکلیف پہنچا لے یا اس سے معافی طلب کرے۔

احادیث میں بھی توبہ و استغفار کا بکثرت حکم دیا گیا ہے، امام نووی رح نے ریاض الصالحین میں توبہ کے وجوب اور اس کی فضیلت سے متعلق بارہ احادیث نقل کی ہیں، ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اسوہ پیش کر کے توبہ و استغفار کا حکم دیا ہے۔ اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

اغر بن یسار المزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو، اللہ سے توبہ کرو اور اس سے مغفرت طلب کرو کیونکہ میں ہر روز سو بار توبہ کرتا ہوں۔ (مسلم شریف)

ایک حدیث قدسی(۱) میں حضورؐ نے اللہ کی طرف سے اس کا یہ حکم پہنچایا ہے:

اے میرے بندو، تم رات دن خطائیں کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو معاف کرتا ہوں، پس تم مجھ سے مغفرت چاہو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

گناہ کی دو قسمیں ہیں: کبیرہ اور صغیرہ

قرآن اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں، بڑے گناہ جنھیں کبائر کہا جاتا ہے اور چھوٹے گناہ جنھیں صغائر کہا جاتا ہے۔

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا ۝ (النساء ع ۵)

اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔

سورہ النجم رکوع ۲ میں اسی طرح کی آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"جو لوگ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے مگر کچھ آلودگی، بیشک تیرا رب بڑی وسیع بخشش والا ہے۔"

ان دونوں آیتوں میں صراحت کے ساتھ بعض گناہوں کو بڑے گناہ (کبائر) قرار دیا گیا ہے اور انھیں آیتوں سے کبیرہ گناہ کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے۔ جب بعض گناہوں کو کبائر کہا گیا تو بعض دوسرے یقیناً صغائر یعنی چھوٹے گناہ

---

(۱) حدیث قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں حضورؐ نے صراحۃً یہ کہا ہو کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے۔

ہوں گے۔ جن احادیث میں "کبائر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ان میں دو حدیثوں کے ترجمے یہ ہیں:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پنج وقتہ نمازیں اور جمعہ سے جمعہ تک کفارہ ہیں ان خطاؤں کے لیے جو ان کے درمیان صادر ہوں اگر بڑے گناہوں کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو۔ (۱)

(۲) حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ کسی فرض نماز کا وقت آنے کے بعد کوئی مسلمان اس کے لیے اچھی طرح وضو کرتا ہے اور اس نماز کو عمدہ خشوع اور تعدیلِ ارکان کے ساتھ ادا کرتا ہے تو وہ نماز اس کے سابقہ گناہوں کے لیے کفّارہ بن جاتی ہے جب تک کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ ہو اور یہ بات ہمیشہ کے لیے ہے۔ (۲)

ان دونوں حدیثوں میں حضرت ذی النورین رضؓ کی حدیث مفصّل ہے۔ ان حدیثوں سے بھی صراحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ بعض گناہ بڑے اور بعض چھوٹے ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل وکرم سے چھوٹے گناہوں کو بندے کی نیکیوں کے صلے میں محو فرماتا رہتا ہے، رہے بڑے گناہ تو دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ ان کے لیے توبہ کرنا ضروری ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کی تعریف کیا ہے۔ کس کو کبیرہ کہا جائے اور کس کو صغیرہ قرار دیا جائے ؟ امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ اس کے بارہ

---

(۱) ریاض الصالحین باب فضل الصلوات بحوالہ مسلم (۲) ایضاً

میں علماء کے اقوال بہت مختلف ہیں۔ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کوئی گناہ چھوٹا ہوتا ہی نہیں ہے بلکہ سب کے سب کبائر ہی ہیں لیکن جو آیتیں اور حدیثیں اوپر نقل کی گئیں ان کی روشنی میں یہ رائے بداہۃً غلط ہے۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے کسی میں چار، کسی میں سات، کسی میں نو اور کسی میں اس سے بھی زیادہ کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص تعداد کی تعیین نہیں فرمائی ہے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ جس گناہ پر قرآن یا کسی صحیح حدیث میں کوئی وعید آئی ہو وہ گناہ کبیرہ ہے۔ بعض سلف کا خیال یہ ہے کہ جس گناہ پر دنیا میں کوئی حد واجب کی گئی ہے وہ کبیرہ ہے۔ تصوف کے امام، ابو طالب مکیؒ نے لکھا ہے کہ میں نے تمام احادیث اور اقوالِ صحابہؓ کو جمع کیا تو گناہ کبیرہ کی تعداد ۱۷ تک پہنچی۔ چار بڑے گناہوں کا تعلق قلب سے ہے:

۱۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینا۔

۲۔ معصیت پر اصرار کرنا۔

۳۔ اللہ کی رحمت سے مایوسی۔

۴۔ اللہ کے مکر (خفیہ تدبیر) سے بے خوفی۔

چار کا تعلق زبان سے ہے:

۱۔ جھوٹی گواہی۔

۲۔ باعصمت مرد یا عورت پر اتہامِ زنا۔

۳۔ یمین غموس۔ اس کی دو تعریفیں کی گئی ہیں ایک یہ کہ یمین غموس ہر وہ جھوٹی قسم ہے جس کے ذریعہ کسی حق کو باطل یا کسی باطل کو حق ثابت کیا جائے۔ دوسری یہ کہ یمین غموس ہر وہ جھوٹی قسم ہے جس کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال ہڑپ

کرلیا جائے۔ اس کو غموس اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ قسم کھانے والے کو جہنّم کی آگ میں غوطہ دے گی۔

۴۔ سحر ——— بڑے گناہوں میں سے تین کا تعلق پیٹ سے ہے: ۱۔ شراب نوشی۔ ۲۔ یتیم کے مال پر ظلماً قبضہ کرلینا۔ ۳۔ جانتے بوجھتے سود کھانا ——— دو بڑے گناہوں کا تعلق شرمگاہ سے ہے: ۱۔ زنا۔ ۲۔ لواطت ——— دو بڑے گناہوں کا تعلق ہاتھ سے ہے: ۱۔ چوری۔ ۲۔ قتل ——— ایک کا تعلق پاؤں سے ہے: فرار من الزحف، یعنی میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہونا۔ جیسے دو کافروں کے مقابلے میں ایک مسلمان کا بھاگ جانا یا بیس کافروں کے مقابلے میں دس مسلمانوں کا راہ فرار اختیار کرنا ——— ایک گناہ کبیرہ کا تعلق تمام بدن سے ہے: عقوق الوالدین، یعنی ماں باپ کی نافرمانی، ان کے حقوق ادا نہ کرنا یا انھیں سخت بات کہنا یا مارنا اور اس طرح کی دوسری بدسلوکی۔ ان سب کا مجموعہ ۱۷ ہوا۔ (۱)

ابوطالب مکیؒ کا قول نقل کرنے کے بعد امام غزالیؒ نے ثابت کیا ہے کہ گناہ کبیرہ کی کوئی ایسی تعریف ممکن نہیں ہے جو تمام کبائر کی جامع اور اس پر حاوی ہو اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی کوئی ایسی تعریف یا تعیین ثابت نہیں ہے۔ شارع نے اس کو مبہم رکھا ہے تاکہ اللہ کے بندے ہر گناہ سے بچنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد انھوں نے ایک قاعدۂ کلیہ مرتب کرکے کبائر کو صغائر سے الگ کرنے کے لیے ایک لمبی گفتگو کی ہے۔

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴ ص ۱۲ مطبع مجتبائی میرٹھ۔

اس مسئلے میں راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ شیخ ابو طالب مکی رح نے احادیث اور اقوالِ صحابہ سے بڑے بڑے گناہوں کی جو تعداد جمع کی ہے ان کے کبائر ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے اس کے بعد ایک قاعدہ کے طور پر ان لوگوں کی رائے دل کو لگتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہر وہ گناہ، گناہ کبیرہ ہے جس پر قرآن یا صحیح احادیث میں عذابِ آخرت کی کوئی وعید ہو یا دنیا میں اس کی کوئی سزا مقرر کی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ جو گناہ ایسا ہو اس کو صغیرہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ چھوٹے گناہ پر عذاب آخرت کی وعید نہیں دی گئی ہے اور نہ دنیا میں اس کے لیے حد و تعزیر مقرر کی گئی ہے۔ عذابِ آخرت کی وعید یا حد و تعزیر اس کے کبیرہ ہونے کی دلیل ہے اب اگر ایسے گناہوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے تو یہ فہرست خاصی لمبی ہو گی ——

گناہِ کبیرہ و صغیرہ کی بحث کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ہر مومن کو بالعموم اور ان مومنوں کو بالخصوص جو بارگاہِ الٰہی میں تقرب اور اللہ تعالیٰ کی بیش از بیش خوشنودی کے آرزو مند ہوں، ہر گناہ سے بچنے کی پوری سعی کرنی چاہیے اور تمام کبائر و صغائر سے استغفار کرتے رہنا چاہیے۔

گناہوں کی تقسیم حق اللہ اور حق العباد کی نسبت سے

حقوق کی اصلاً دو ہی قسمیں ہیں۔ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق۔ ان کی نسبت سے گناہوں کی بھی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک جس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو اور دوسری وہ جس کا تعلق حقوق العباد سے ہو، گناہ کوئی بھی ہو اس میں کسی نہ کسی کی حق تلفی یا اس پر زیادتی ضرور ہوتی ہے اسی لیے گناہ کے لیے ظلم کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اسی لیے سب سے بڑے گناہ، شرک کو قرآن میں ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو سب سے پہلی نصیحت یہ کی تھی:

يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۗ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝ (لقمان ۱۳)

اے بیٹے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا بے شک شرک بڑا ظلم ہے۔

توحید یعنی اللہ تعالیٰ کو لاشریک لہ ماننا صرف اسی کا حق ہے اس لیے کوئی شخص اگر گناہِ شرک میں مبتلا ہے تو وہ اللہ کی حق تلفی اور اس کی شان میں گستاخی کر رہا ہے اور یہ حق تلفی و گستاخی وہ گناہ ہے جس کے بارے میں اس نے اعلان کر دیا ہے کہ میں اسے معاف نہیں کروں گا اور اگر اس گناہ کے ساتھ کوئی شخص مر گیا تو وہ لازماً ہمیشہ جہنم میں جلتا رہے گا اس طرح نماز اور روزہ خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اب اگر کوئی مسلمان صوم و صلوٰۃ ترک کیے ہوئے ہے تو وہ ایسے گناہ میں مبتلا ہے جس کا تعلق اللہ کے حق سے ہے۔

کسی بندے کی حق تلفی اور اس پر زیادتی کا تعلق یا تو اس کے جسم و جان سے ہوتا ہے یا مال سے یا عزت و آبرو سے یا دین و مذہب سے یا جاہ و مرتبہ سے ______ کسی کو ناحق قتل کر دینا یا اس کے جسم کے کسی حصے کو نقصان پہنچانا یا اس کا مال غصب کر لینا یا اسے گالی دینا یا اس پر ایسا اتہام لگانا جس سے اس کی عزت و آبرو پر حرف آتا ہو یا ایسی کوئی ناجائز تدبیر اختیار کرنا جس سے اس کے جاہ و مرتبہ میں کمی واقع ہوتی ہو ایسے گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے اب ایک ایسا گناہ رہ گیا جس کا تعلق کسی کے دین و مذہب سے ہو۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس کی ایسی مثالیں دی ہیں جو اب تک نظر سے اوجھل تھیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی صحیح العقیدہ اور متبع سنت مسلمان کو گمرہی یا بدعت کی طرف دعوت دے رہا ہے یا اسے گناہوں کی ترغیب دے رہا ہے تو یہ اس کے دین پر حملہ، اس کی حق تلفی اور اس پر زیادتی ہے، اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آج کل بعض واعظین اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس سے

خوف وخشیت کے پہلو کو دبا کر اس کی رحمت و مغفرت کے پہلو کو اُبھار دیتے ہیں جس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر معصیت کی جرأت پیدا ہوتی ہے یہ بھی درحقیقت بندوں کی حق تلفی میں داخل ہے۔

جن گناہوں کا تعلق حق اللہ سے ہے ان میں سے کفر و شرک کے بارے میں اس نے بتا دیا ہے کہ معاف نہیں کرے گا باقی اس سے نیچے درجے کے گناہ اس کی مشیت پر موقوف ہیں وہ چاہے تو انھیں معاف بھی کر سکتا ہے۔ باقی رہے وہ گناہ جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے وہ اس وقت تک معاف نہیں ہو سکتے جب تک وہی لوگ معاف نہ کریں جن کی حق تلفی کی گئی ہو، اس کے بارے میں امام غزالیؒ نے یہ جنچی تلی بات لکھی ہے کہ دفاتر گناہ تین قسم کے ہیں:

دیوان یغفر ودیوان لا یغفر و دیوان لا یترک۔	ایک دفتر ایسا ہے جو بخشا جا سکتا ہے، ایک ایسا ہے جو بخشا نہیں جا سکتا اور ایک ایسا ہے جسے ترک نہیں کیا جا سکتا۔

(احیاء العلوم ج ۴ باب التوبہ ص ۱۱)

کفر و شرک سے نیچے درجے کے گناہوں کا دفتر بخشا جا سکتا ہے اور ناقابلِ معافی کفر و شرک کا دفتر ہے اور بندوں کے حقوق اور ان پر زیادتیوں کا دفتر وہ ہے جسے چھوڑا نہیں جا سکتا، یعنی یہ حقوق اسی وقت معاف ہو سکتے ہیں جب بندے خود معاف کر دیں۔ اس مسئلے سے متعلق متعدد صحیح احادیث پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میں بخوف طوالت صرف ایک حدیث کا ترجمہ یہاں پیش کرتا ہوں:

> حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے جواب دیا ہم میں مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں اور نہ ساز و سامان، تو آپ نے فرمایا میری اُمت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں نماز، روزے اور

زکوٰۃ لے کر آئے گا لیکن اس کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر اتہام لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا تو ان میں سے ہر ایک کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی اور اگر تمام مطالبات پورے ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو ان لوگوں کے گناہ جن کے حقوق اس نے تلف کئے تھے اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ (۱)

یہ حدیث مسلمانوں کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ بندوں کے حقوق تلف کرنے اور ان پر زیادتیاں کرنے سے بچیں اور اگر کوئی حق تلفی و زیادتی ہو گئی ہو تو اسی دنیا میں اسے معاف کرانے اور اس کی تلافی کی کوشش کریں، کیونکہ قیامت کا دن ایسا ہولناک ہوگا کہ کوئی شخص اپنا حق معاف کرنے پر تیار نہ ہوگا۔

توبہ کی ترغیب اور اُس کے فضائل

اب تک جو کچھ لکھا جا چکا اس سے معلوم ہوا کہ توبۂ نصوح کے بغیر آخرت کی نجات ہی خطرے میں ہے، بارگاہِ الٰہی میں تقرب اور درجات کی بلندی کا کیا سوال؟ اس لیے ہر اس شخص کو جسے آخرت پر ایمان اور جنت و دوزخ پر یقین ہو توبہ کرنا ہی چاہیے۔ یہ اس کی اپنی نجات کا مسئلہ ہے لیکن اللہ تعالےٰ کا بے پایاں کرم یہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو مختلف انداز میں توبہ کی ترغیب دی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جو ماں باپ سے زیادہ ہم پر مہربان ہے ہمیں سزا دینا نہیں چاہتا بلکہ ہمیں بخشنا اور اپنی رحمت سے نوازنا چاہتا ہے۔ یہ ہم ہی ہیں جو اس سے بے رخی برت کر اس کے

---

(۱) ریاض الصالحین باب الظلم بحوالہ مسلم شریف

غضب کو دعوت دیتے رہتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں توبہ و استغفار کی ترغیبات و فضائل پر بہت کچھ ہے ہم چند آیات و احادیث پیش کرتے ہیں:

(۱) إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ (البقرہ ۲۲۲)

بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

امام قشیریؒ نے اپنے رسالے میں اور امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اسی آیت پر اکتفا کیا ہے۔ بلاشبہ اس آیت میں توبہ یعنی باطنی طہارت اور تطہر یعنی ظاہری طہارت کی بڑی فضیلت موجود ہے ایک مومن کے لیے اس سے بڑی ترغیب اور کیا ہوگی کہ توبہ کے صلے میں صرف گناہ ہی معاف نہ ہوں گے بلکہ اسے اپنے مالک کی محبت بھی نصیب ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ وضو کے بعد یہ دعا مانگیں: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (اے اللہ مجھے توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی حاصل کرنے والوں کے گروہ میں داخل کر دے)۔

(۲) سورۃ الزمر رکوع ۶ میں ہے:

"اے نبی کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو غفور و رحیم ہے۔"

اس آیت میں پورے زورِ کلام کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں کسی کافر و مشرک کے لیے بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے، اللہ تمام گناہوں کو بخشنے کے لیے تیار ہے اور جب حقیقت یہ ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ ایک مومن کے لیے اس میں کتنی بشارت اور توبہ کی کتنی ترغیب موجود ہے۔

(۳) بندہ جب خلوصِ دل سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے

اور بہت خوش ہوتا ہے اس خوشی کی تمثیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں کا کوئی شخص اپنے اونٹ پر سوار ایک چٹیل ریگستان سے گزر رہا تھا کہ کسی طرح اس کا اونٹ بھاگ گیا، اسی پر اس کا کھانا اور پانی سب کچھ تھا، وہ اونٹ کی واپسی سے مایوس ہو کر ایک درخت کے سائے میں لیٹ گیا، وہ اسی حال میں تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ اونٹ اس کے پاس کھڑا ہے، پھر خوشی کی شدت میں اس کی زبان سے نکلا اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں، خوشی کی بدحواسی میں اس سے غلطی ہوئی کہنا کچھ چاہتا تھا اور زبان سے کچھ اور نکلا۔ اس شخص کو اپنے بھاگے ہوئے اونٹ کی واپسی سے جتنی خوشی ہوئی، اللہ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جب اس کا بندہ اس سے توبہ کرتا ہے (۱)

توبہ کی حقیقت یہی ہے اللہ سے بھاگا ہوا بندہ اپنے مالک کی طرف واپس آئے اور گڑگڑا کر اس سے معافی مانگے۔

(۴) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے کہ دن کا خطاکار توبہ کرے اور وہ دن کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے کہ رات کا خطاکار توبہ کرے اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب آفتاب مغرب سے طلوع کرے (۲)

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ "ہاتھ پھیلانا" طلب توبہ کا کنایہ ہے۔ اس

---

(۱) ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم (۲) ایضاً بحوالہ مسلم

سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی بے نہایت شفقت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے خطاکار بندوں کو معاف کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہے۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ (گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں) (۳)

کھلی بات ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر ہی یہ فرمایا ہوگا۔ اس سے توبہ کی جو فضیلت ظاہر ہو رہی ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اَوْبہ و اِنابت

توبہ کے لیے قرآن مجید میں دو اور لفظ استعمال ہوئے ہیں اوبہ اور انابت

امام قشیری نے اپنے رسالے میں ابو علی دقاق کا یہ قول نقل کیا ہے، وہ کہتے تھے کہ توبہ کی تین قسمیں ہیں: رجوع الی اللہ کا ابتدائی درجہ توبہ ہے اور انتہائی درجہ اَوْبہ ہے اور درمیانی درجے کا نام اِنابت ہے لیکن لغتِ عرب اور قرآن و حدیث میں یہ فرق موجود نہیں ہے۔ قاموس میں ہے:

الاوب والایاب والاوبۃ: الرجوع — وناب الی اللہ: تاب کاناب۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تینوں لفظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن میں جس طرح تُوبُوا اِلَی اللہ کہا گیا ہے اسی طرح سورۂ زمر رکوع ۶ میں وَاَنِیْبُوْا اِلٰی رَبِّکُمْ (اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو) فرمایا گیا ہے سورہ ص رکوع ۲

---

(۳) مشکوٰۃ

میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں کہا گیا ہے فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ (پھر وہ مغفرت چاہنے لگا اور گر پڑا جھک کر اور رجوع ہوا) سورہ ص ہی میں داؤد و سلیمان و ایوب علیہم السلام کو اَوّاب (یعنی اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والا) کہا گیا ہے ایک دوسرے مقام پر فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا (بنی اسرائیل ع ۳) (بے شک وہ رجوع کرنے والوں کو بخشتا ہے) فرمایا گیا ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ یہ تینوں لفظ ایک ہی معنی و مفہوم میں استعمال کیے گئے ہیں۔

شکستِ توبہ سے مایوس نہ ہونا چاہیے

اوپر صحتِ توبہ کی چار شرطیں بیان کی گئی ہیں اگر کسی نے ان شرطوں کے مطابق کسی گناہ سے توبہ کی تو انشاء اللہ اس کی توبہ قبول ہوگی اور وہ اپنی توبہ میں سچا سمجھا جائے گا لیکن شیطان اور نفس انسان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اس لیے عین ممکن ہے کہ اس کی توبہ ٹوٹ جائے اور وہ پھر اس گناہ میں مبتلا ہو جائے جس سے اس نے توبہ کی تھی یا اس گناہ کے علاوہ کسی دوسرے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے ایسی صورت میں اسے مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ از سرِ نو پھر توبہ کرنا چاہیے امام قشیری ایسے شخص کے بارے میں لکھتے ہیں:

فهوالموفق صدقا وان	اس کو سچی توبہ نصیب ہوئی تھی
نقض التوبة مرة او	اگرچہ اس نے ایک بار یا چند بار
مرات (۱)	اسے توڑ ڈالا ہو

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۱۳

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کو توبہ ہی توبہ کے بعد استقامت حاصل ہو جائے، جس شخص کے دل پر غفلت نے قبضہ نہیں کیا ہے وہ توبہ ٹوٹنے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ نادم ہو سکتا ہے اور اس کا تحسر و تاسف اور اس کی دل شکستگی اسے پہلے سے زیادہ بلند مقام تک پہنچا سکتی ہے۔ سچے دل سے استغفار اور گناہ پر اصرار دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، بندۂ خدا کا ہر استغفار شیطان کے منہ پر ایک طمانچہ ہوتا ہے۔ بخاری و مسلم کی ایک حدیث کا ترجمہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

"حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ کسی بندے نے ایک گناہ کیا اور اس نے کہا اے میرے رب میں نے گناہ کیا ہے تو مجھے بخش دے، اس کے رب نے کہا، کیا میرے بندے کو یقین ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا بھی ہے اور اس پر سزا بھی دیتا ہے، میں نے اپنے بندے کو بخش دیا پھر وہ گناہ سے کچھ زمانے تک رکا رہا اس کے بعد اس نے پھر ایک گناہ کیا اور کہا اے میرے رب میں نے گناہ کیا تو مجھے بخش دے، اس کے رب نے کہا، کیا میرے بندے کو یقین ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا بھی ہے اور اس پر سزا بھی دیتا ہے، میں نے اپنے بندے کو بخش دیا پھر کچھ زمانے تک وہ گناہ سے رکا رہا اور اس کے بعد اس سے پھر ایک گناہ ہو گیا۔ تیسری بار بھی اس نے مغفرت چاہی اور اس کے رب نے اس کو بخش دیا۔"

امام بخاری نے یہ حدیث کتاب التوحید میں اور امام مسلم نے کتاب التوبہ میں

روایت کی ہے، میں نے بخاری کے الفاظ کا ترجمہ کیا ہے۔ اس حدیث میں "پھر وہ گناہ سے کچھ زمانے تک رُکا رہا" کا ٹکڑا اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے ہر بار سچے دل سے توبہ کی لیکن اغوائے شیطان یا غلبۂ نفس کی وجہ سے وہ بار بار کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا ہوتا رہا لیکن اس نے اپنے رب کا دامن نہیں چھوڑا، ہر گناہ کے بعد وہ چونکتا رہا اور اپنے مالک کی طرف پلٹتا رہا۔ بعض احادیث میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ جس نے استغفار کیا اُس نے گناہ پر اصرار نہیں کیا مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ (۱)

یہی مضمون ہے جسے شاعر نے اپنے اس شعر میں نظم کیا ہے

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اور شاید یہی بات اقبال نے اپنے اس شعر میں کہی ہے

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ یہاں اس توبہ و استغفار کا ذکر نہیں ہو رہا ہے جس کا تعلق صرف زبان سے ہوتا ہے اس طرح کی توبہ تو درحقیقت ایک مذاق ہے جو توبہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ امام قشیری نے بعض بزرگانِ دین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہمیں اپنی توبہ سے توبہ کرنا چاہیے۔ نظیری نے کس قدر چبھتا ہوا شعر کہا ہے:

توبہ بر لب، سجدہ بر کف، دل پُر از شوقِ گناہ
معصیت را خندہ می آید ز استغفارِ ما

---

(۱) مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی و ابوداؤد۔

یہاں سورۂ آلِ عمران رکوع ۱۴ کی دو آیتوں کا مطالعہ بھی کر لینا چاہیے۔ اللہ کے متقی بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

یہ لوگ جب کسی کھلی بُرائی کا ارتکاب یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہ بخشے۔ اور یہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے (۱۳۵)

یہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کے لیے (۱۳۶)

آیت ۱۳۵ سے چند باتیں معلوم ہوئیں

(۱) اگر کبھی غلبۂ نفس یا اغوائے شیطان کے اثر سے کسی چھوٹے یا بڑے گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو یہ چیز بندے کو متقین کے گروہ سے خارج نہیں کرتی، شرط صرف یہ ہے کہ وہ فوراً اس کی تلافی اور تدارک میں لگ جائے۔

(۲) اللہ کے متقی بندے، دل سے خدا کے فرماں بردار اور اس کی اطاعت میں سرگرم ہوتے ہیں اس لیے گناہ کا ارتکاب ہوتے ہی چوکنّا ہو جاتے ہیں اور ندامت فوراً انھیں خدا کی طرف رجوع کر دیتی ہے، وہ اپنے گناہوں کی دل سے معافی مانگتے ہیں اور پھر اللہ کی اطاعت میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے

(۳) "اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہ بخشے" اس ٹکڑے میں یہ تنبیہ ہے کہ انبیاء، اولیاء، ملائکہ، جنّات اور ارواح غرض کوئی بھی نہیں جس کے ہاتھوں میں گناہوں کی معافی ہو، گناہ معاف کرنا صرف اللہ کے اختیار

میں ہے۔کسی کی سفارش کے بھروسے پر گناہ کیے چلے جانا ایک ایسی حماقت ہے جو انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔

آیت ۱۳۶ میں متقی بندوں کا اجر بیان کیا گیا ہے جس میں سب سے پہلی چیز مغفرت ہے۔

چند مؤثّر واقعات

(۱) بنی اسرائیل میں ایک شخص نے بیس سال تک اللہ کی عبادت کی اور پھر بیس سال تک نافرمانی کرتا رہا۔ ایک دن اس نے آئینہ دیکھا، اس کی داڑھی کے بال سفید ہونے لگے تھے، یہ دیکھ کر وہ غمگین ہوا اور اس نے کہا، الٰہی، میں نے بیس سال تک تیری اطاعت کی اور پھر بیس سال تک تیری نافرمانی کرتا رہا اب اگر میں تیری طرف رجوع کروں تو کیا تو مجھے قبول کرلے گا؟ اُس نے سُنا کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے جسے وہ دیکھ نہیں رہا تھا، تو نے مجھ سے محبت کی تو میں نے تجھ سے محبت کی، تو نے مجھے چھوڑ دیا تو میں نے تجھے چھوڑ دیا، تو نے میری نافرمانی کی تو میں نے تجھے مُہلت دی اور اگر تو میری طرف رجوع کرے گا تو میں تجھے قبول کرلوں گا (۱)

(۲) ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور پوچھا کہ میں نے ایک گناہ کیا ہے تو کیا میرے لیے توبہ ہے۔ یہ سُن کر انھوں نے اس سے منہ پھیر لیا اور پھر اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، انھوں نے کہا اے شخص توبہ کے دروازے پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴

اسے بند نہیں ہونے دیتا تو عمل کیے جا اور مایوس نہ ہو(۱)
غالباً حضرت ابن مسعودؓ نے اس سے اِعراض یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ اُس پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے اور وہ اپنے گناہ پر نادم بھی ہوتا ہے یا نہیں؟

(۳) ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے کہ میں ایک قصّہ گو کی مجلس میں گیا جو قصّے سُنا کر لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے۔ ان کی گفتگو سے میرا قلب متاثر ہوا لیکن جب ان کی مجلس سے باہر آیا تو وہ اثر غائب ہو گیا۔ میں دوبارہ ان کی مجلس میں گیا۔ اس دفعہ ان کے کلام کا اثر راستے بھر باقی رہا پھر غائب ہو گیا، میں تیسری دفعہ پھر ان کی مجلس میں گیا اور اب کے کلام کی تاثیر میرے دل میں قائم رہی یہاں تک، میں گھر واپس ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے تمام آلات توڑ پھوڑ دیئے اور سلوک الی الحق کی راہ اختیار کر لی، اپنا یہ واقعہ انھوں نے یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ کو سُنایا تو اُنھوں نے کہا ایک عصفور نے ایک کُرکی (گوریے سے بڑا ایک پرندہ) کو شکار کر لیا۔ اس جملے میں قصّہ گو کی تحقیر نہیں بلکہ ابو سلیمان کے بلند درجے کا بیان ہے(۲)

(۴) ابو عمرو بن نجید، ابو عثمان حرانی کی مجلس میں جانے لگے اور اتنے متاثر ہوئے کہ تائب ہو گئے لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر اپنی سابق زندگی کی طرف پلٹ گئے، انھوں نے ان کی مجلس میں جانا ہی چھوڑ دیا اور کہیں راستے میں ابو عثمان کو دیکھ لیتے تو اِدھر اُدھر بھاگ جاتے۔ ایک دن راستے میں سامنے سے ابو عثمان کو آتے دیکھا تو وہ راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے کی طرف مُڑ گئے، ابو عثمان نے ان کا پیچھا کیا اور قریب پہنچ کر کہا، بیٹے! تم

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴ (۲) الرسالۃ القشیریہ

اس شخص کی صحبت اختیار نہ کرو جو تمھیں معصوم سمجھ کر تم سے محبت کرے۔ یہ سُن کر ابو عمرو کے قدم رُک گئے، ابو عثمان نے ان کا تاثر دیکھ کر کہا، تم جس حالت میں ہو اس میں ابو عثمان تمھارے لیے مفید ہوگا۔ ابو عمرو پھر تائب ہوئے اور اب ان کی توبہ پائدار ثابت ہوئی (۱)

ابو عثمان رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا یہ انداز کتنا مؤثر اور عالمانہ تھا

ان واقعات کا حاصل بھی یہی ہے کہ نہ توبہ سے غفلت برتنی چاہیے اور نہ شکستِ توبہ کی وجہ سے مایوس ہونا چاہیے۔ توبہ اگر ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کرنی چاہیے۔

توبہ سے کوئی شخص کسی حال میں بھی بے نیاز نہیں ہے

کبائر سے بالکلیہ اجتناب کرنے اور صغائر سے بھی بالقصد دامن بچانے کی کوشش کے باوجود کوئی شخص توبہ و استغفار سے بے نیاز نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس کی بے نیازی کا استحضار اور اپنے نقص، احتیاج، خطا و نسیان اور تقصیر و غفلت کا علم انسان کو ہر آن توبہ و استغفار پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ لفظ ذنب (گناہ) کا اطلاق بشری لغزشوں، کوتاہیوں اور سہو و غفلت پر بھی ہوتا ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کے تعلق سے یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، اس کے باوجود جب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بھی استغفار کا حکم دیا ہے اور وہ بکثرت استغفار کرتے رہے ہیں تو ہمیں اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ توبہ سے کوئی شخص بے نیاز نہیں ہو سکتا، پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز جیسی عبادت

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ

کے بعد بھی استغفار فرماتے تھے تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ کسی حال میں بھی کوئی شخص استغفار سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوتے تو تین بار استغفار فرماتے (۱)

نماز کے بعد استغفار کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اپنی کوتاہی اور تقصیر کی معافی مانگی جائے۔ بارگاہِ احدیت میں جن کا تقرب جس قدر بڑھتا جاتا، اسی قدر وہ اللہ کے جلال سے لرزہ براندام اور اپنی کوتاہی کے معترف ہوتے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں انبیاء کرام علیہم السلام اور اللہ کے دوسرے نیک بندوں کے حالات و کیفیات کی تفصیل اس حقیقت پر شاہد عدل ہے۔ اس کے علاوہ استغفار دعاء کی ایک قسم ہے اور دعاء عبادت بلکہ مغز عبادت ہے اس لیے بھی ہم استغفار سے کسی حال میں بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

توبہ میں تاخیر خطرناک ہے

مسلمان خواہ کسی ایسے گناہ میں مبتلا ہو جس کا تعلق اللہ کے حق سے ہو یا کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جس کا تعلق اللہ کے بندوں سے ہے، اسے فوراً بلا تاخیر اس سے توبہ کرنا چاہیے۔ یہ خیال کرنا کہ توبہ آئندہ کبھی کر لوں گا ابھی تو زندگی بہت باقی ہے ایک شیطانی وسوسہ ہے جو انسان کو تباہ کر سکتا ہے۔ کسی کو اپنی موت کا وقت نہیں معلوم اس لیے توبہ میں ایک لمحے کی تاخیر بھی

---

(۱) مشکوٰۃ بحوالہ مسلم شریف

حماقت ہے۔ سورۃ النساء رکوع ۳ میں کہا گیا ہے

"اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انھیں لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی بُرا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظرِ عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے" (آیت ۱۷)

اس آیت میں ثُمَّ یَتُوبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ (اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں) کا ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ اگرچہ صحابہ و تابعینؓ کے اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مِنْ قَرِیْبٍ کے لفظ میں پوری زندگی داخل ہے نزع سے پہلے اگر توبہ کر لی جائے تو اس پر "قریب" کا اطلاق صحیح ہوگا لیکن خود اس لفظ میں کھلا ہوا اشارہ موجود ہے کہ توبہ میں تاخیر سے قبولیت میں خلل واقع ہوتا ہے اس میں جتنی تاخیر ہوگی اس کی قبولیت اتنی ہی بعید ہوتی جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ توبہ میں تاخیر کی وجہ کیا ہوگی؟ ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آئندہ توبہ کر لینے کا ارادہ ہو لیکن یہ وجہ نامعقول اس لیے ہے کہ موت کا وقت کسی کو نہیں معلوم، وہ اچانک بھی آسکتی ہے اس لیے آئندہ زندگی کی امید پر توبہ میں تاخیر غفلت اور حماقت ہے۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ گناہ کی لذّت یا اس کا کوئی دُنیوی فائدہ اسے تاخیرِ توبہ پر اکساتا ہے اگر وجہ یہ ہو تو یہ بات ایک مومن کے لیے شرمناک بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اگر اچانک موت نہ آئے جب بھی دُنیوی فائدے کا خیال اس کو اس وقت تک توبہ سے باز رکھ سکتا ہے کہ نزع کی کیفیت طاری ہو جائے اور توبہ کا دروازہ اس کے لیے بند ہو جائے چنانچہ

اسی سورۃ النساء کی آیت ۱۸ میں ایسے ہی لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے :

"مگر توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بُرے کام کیے
چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت
کا وقت آجاتا ہے تو اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے
توبہ کی" (آیت ۱۸)

صبر

صبر کے لغوی معنی حبس و منع کے ہیں یعنی کسی کو کسی چیز سے روک دینا، شرعی اصطلاح کے لحاظ سے صبر اس قوت، کیفیت اور حالت کا نام ہے جو انسان کو نفسانی خواہشات پر چلنے اور شیطانی مطالبات کو ماننے سے روک دیتی ہے۔ امام غزالیؒ نے علمی مقدمات کی ترتیب کے ساتھ نہایت عالمانہ و عارفانہ انداز میں صبر کی حقیقت بیان کی ہے۔ ہم یہاں اس کی تلخیص پیش کرتے ہیں:

صبر، مقاماتِ دین میں سے ایک مقام اور رہروانِ راہِ حق کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ دین کے جتنے مقامات ہیں ان کی تنظیم تین امور سے ہوتی ہے۔ ۱۔ معارف۔ ۲۔ احوال۔ ۳۔ اعمال۔ معارف اصول کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے احوال پیدا ہوتے ہیں اور احوال کا ثمرہ اعمال ہوتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھو کہ معارف (علوم) درخت ہیں، احوال شاخیں ہیں اور اعمال پھل ہیں۔ صبر کی تنظیم بھی انھیں تین امور سے ہوتی ہے۔ صبر سے پہلے بہت سی چیزوں کا علم و یقین ضروری ہے۔ اسی سے ایک پائدار حالت پیدا ہوتی ہے اور اسی حالت کا پھل ہے جسے ہم صبر کہتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ کی جاندار مخلوقات میں صبر، صرف انسان کا خاصہ ہے۔ یہ جانوروں میں نہیں

پایا جاتا اور نہ فرشتوں کو اس کی ضرورت ہے۔ جانور مکلف مخلوق نہیں ہیں اس لیے ان کے لیے شرعی اوامر و نواہی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انھیں صبر کی ضرورت پیش آئے، فرشتے اطاعتِ امرِ الٰہی کے مکلف ضرور ہیں لیکن ان پر ایسی کوئی خواہشِ نفس مسلط نہیں کی گئی ہے جو انھیں اطاعت سے روکے اس لیے انھیں بھی صبر کی ضرورت نہیں ہے۔ صبر انسان کی خصوصیت اس لیے ہے کہ اس میں مَلَکِیَّت اور بَہِیمِیَّت جمع کر دی گئی ہے اور اسی لیے یہ اوامر و نواہی دونوں کا مکلف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ دو فرشتے مقرر کیے ہیں ان میں کا ایک اسے راہِ ہدایت دکھاتا رہتا ہے اور دوسرا اس کو تقویت پہنچاتا ہے —— انسان کو اللہ و رسول کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسے ان مصالح کا علم بھی دیا گیا ہے جن کا تعلق نتائج و عواقب سے ہے، اور اسے اپنے ہر فعل کے بلے میں یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی گئی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اسی نورِ ہدایت سے انسان کو یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ خواہشات و شہوات کی پیروی کے نتائج نہایت خراب ہیں لیکن یہ معرفت کافی نہیں ہے جب تک اسے ایسی قوت و قدرت بھی حاصل نہ ہو جس کے ذریعے وہ مضر چیزوں سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ اسی ضرورت کی بنا پر اللہ نے اس کو ایک ایسی قوت دی ہے جس سے وہ مضر خواہشات کے منہ میں لگام ڈال سکتا ہے اور

ان سے لڑ سکتا ہے۔ اللہ نے دوسرا فرشتہ اسی لیے مقرر کیا ہے کہ وہ اس لڑائی میں ایسے لشکروں سے انسان کی مدد کرے جنھیں آنکھیں نہیں دیکھتیں۔ یہ لشکرِ شہوت کے لشکر سے جنگ کرتا ہے اور یہ جنگ مسلسل جاری رہتی ہے۔ ہم اس صفت کا نام باعثِ دینی رکھتے ہیں جس کی وجہ سے انسان خواہشات کی شکست و ریخت میں جانوروں سے ممتاز ہے یعنی ایک ایسا دینی محرک جو انسان کو احکامِ دین کی تعمیل پر اُبھارتا ہے۔ اسی طرح ہم خواہشات اور اُن کے مقتضیات کا نام باعثِ ہوای رکھتے ہیں یعنی ایک ایسا نفسانی محرک جو انسان کو احکامِ دین کی خلاف ورزی پر اُبھارتا ہے۔ اس محرکِ دینی اور محرکِ نفسانی کے درمیان جنگ چھڑی رہتی ہے اور اس جنگ کا میدان انسان کا قلب ہے۔ محرکِ دینی کی مدد فرشتوں کا وہ لشکر کرتا ہے جو حزب اللہ کی مدد کے لیے مقرر کیا گیا ہے اور محرکِ نفسانی کی مدد شیاطین کی فوج کرتی ہے جس کا کام دشمنانِ خدا کی تائید و حمایت ہے۔ اب صبر کی حقیقت بتلانے کا وقت آ گیا تو سمجھ لو کہ صبر نام ہے محرکِ شہوت کے مقابلے میں محرکِ دینی کے ثبات و استقامت کا ـــــ اگر محرکِ دینی، محرکِ شہوت پر غالب آجائے تو انسان صابرین کے گروہ میں داخل ہو جاتا ہے اور اگر مغلوب ہو جائے تو حزب الشیطان میں جا گھستا ہے۔ اب اوپر کی ترتیب کے لحاظ سے یوں سمجھو کہ خواہشِ نفسانی کے مطابق افعال کا ترک کرنا وہ عمل ہے جو حالتِ صبر کا پھل ہے اور یہ حالت اس علم و یقین سے پیدا ہوتی ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کی پیروی انسان کے لیے دنیا

اور آخرت دونوں ہی جگہ مضرت رساں ہے۔ یہ علم و یقین جتنا قوی ہوگا اسی کی نسبت سے وہ حالت قوی ہوگی جسے ہم نے صبر کہا ہے اور پھر اسی کی قوت کے اعتبار سے خواہشاتِ نفسانی کے مقابلے میں کامیابی ہوگی (۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صبر کے بغیر نہ تو انسان راہِ حق میں مجاہدہ کر سکتا نہ اسے حزب الشیطان کے مقابلے میں فتح حاصل ہو سکتی اور نہ اسے تقویٰ کی نعمت مل سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار صبر اور نماز سے استعانت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

صبر کی فضیلت

امام قشیری، امام غزالی، امام نووی، شیخ الاسلام انصاری اور سید مصطفیٰ عروسی نے صبر کی فضیلت میں متعدد آیتیں پیش کی ہیں۔ ہم یہاں احیاء العلوم سے آیتیں پیش کر رہے ہیں۔ امام غزالی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد اوصاف کے ساتھ صابرین کا ذکر کیا ہے اور قرآن میں ستّر سے زیادہ مقامات پر صبر کا ذکر ہے اور اکثر درجات و خیرات کو اللہ تعالیٰ نے صبر کی طرف منسوب کیا ہے اور انھیں اسی کا ثمرہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے کی چند آیتیں یہ ہیں:

(۱) وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ط وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ○ (السجدہ ع ۳)

اور جب انھوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴ بیان حقیقۃ الصبر

(۲) وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا (الاعراف ع ۱۶)

اور بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا کیونکہ انھوں نے صبر سے کام لیا تھا

(۳) وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (النحل ع ۱۳)

اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے

(۴) اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا (القصص ع ۶)

یہ وہ لوگ ہیں جن کا اجر دوبار دیا جائے گا اس صبر کے بدلے جو انھوں نے دکھایا

(۵) اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر ع ۲)

صبر کرنے والوں کو توان کا اجر بے حساب دیا جائے گا

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نیکی کا اجر ایک اندازے اور حساب کے مطابق ملتا ہے صبر کے سوا۔ روزہ چونکہ صبر ہی کی ایک مخصوص قسم ہے اس لئے روزے کے بارے میں بھی حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے الصوم لی وانا اجزی بہ (روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا) اللہ نے روزے کو تمام عبادات کے درمیان اپنی طرف منسوب کیا حالانکہ تمام عبادتیں اسی کے لیے ہیں اسی طرح اس نے اس کے اجر کو بھی اپنی طرف منسوب کیا حالانکہ تمام نیکیوں کا اجر وہی عطا کرے گا۔اسی نسبت سے صبر کی بڑی فضیلت نکلتی ہے —— اسی طرح اللہ نے صابروں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہے:

(۶) وَاصْبِرُوْا، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ٥ (الانفال ع ۶)

اور صبر کرو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

اللہ نے اپنی نصرت اور مدد کو بھی صبر پر معلق کیا ہے، سورۂ آل عمران میں ہے

(۷) بے شک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اس آن تمہارا رب پانچ ہزار صاحبِ نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا (آل عمران ع ۱۳)

اس نے صابروں کے لیے چند انعامات کا ذیل کی آیت میں یکجا ذکر کیا ہے جو دوسروں کے لیے نہیں کیا ہے:

(۸) اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ (البقرہ ع ۱۹)	ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں

ہدایت، رحمت اور صلوات کو یہاں صابرین کے لیے جمع کر دیا گیا ہے ـــــ مقامِ صبر کے بارے میں تمام آیتوں کا استقصاء موجبِ طوالت ہے (۱).

چند احادیث

(۱) ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلۂ انصار کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، آپ نے انھیں عطا فرمایا، پھر سوال کیا اور پھر عطا فرمایا، یہاں تک کہ آپ کے پاس جو کچھ تھا وہ ختم ہو گیا، جب آپ نے اپنے پاس کا سب مال صرف کر دیا تو ان سے فرمایا میرے پاس جو مال آتا ہے وہ میں تم سے بچا کر نہیں رکھتا اور جو شخص اللہ سے عفت چاہتا ہے اللہ اس کو عفیف بنا دیتا ہے اور جو استغنا طلب کرتا ہے اس کو مستغنی بنا دیتا ہے اور جو کوشش کر کے صبر اختیار کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے اور کسی کو صبر سے بہتر اور وسیع تر عطیہ نہیں دیا گیا (۲)

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴ بیان فضیلۃ الصبر (۲) ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم

یہ متفق علیہ حدیث وسیع معانی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اس میں یہ تو ہے ہی کہ صبر اللہ تعالیٰ کا بہترین اور وسیع ترین عطیہ ہے اسی کے ساتھ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عفت، غنائے قلب اور صبر جیسی اعلیٰ صفتیں یوں ہی حاصل نہیں ہوتیں بلکہ ان کے لیے عزم وارادہ، اللہ سے دعا اور مشقت و محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں جب کسی بندے کے مخلص اور جگری دوست کو دنیا سے اٹھا لیتا ہوں اور وہ جزع فزع نہیں کرتا بلکہ اجر و ثواب کا طالب رہتا ہے تو میرے پاس ایسے بندے کا اجر جنت ہے (۱)

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے میں سوال کیا آپؐ نے خبر دی کہ یہ عذاب الٰہی ہے وہ جس پر چاہتا ہے اسے بھیجتا ہے اور اس کو اس نے مومنوں کے لیے رحمت بنا دیا ہے، جو مومن کسی ایسی جگہ ہو جہاں طاعون پھیل گیا اور وہ اس جگہ صبر کے ساتھ اللہ سے اجر طلب کرتا ہوا پڑا رہتا ہے، اسے یقین حاصل ہے کہ اس کو وہی مصیبت پہنچ سکتی ہے جو اللہ نے اس کے لیے لکھ دی ہے تو اس بندے کو ایسا اجر ملتا ہے جیسے ایک شہید کو ملتا ہے (۲)

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

(۱) ریاض الصالحین بحوالہ بخاری (۲) ایضاً بحوالہ بخاری

وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، جب میں اپنے کسی بندے کی دونوں آنکھیں لے کر اسے آزمایش میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ صبر کرتا ہے تو ان آنکھوں کے عوض میں اسے جنّت دوں گا (۱)

(۵) عطا بن رباح کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا میں تمھیں ایک جنّتی عورت نہ دکھاؤں؟ میں نے کہا ہاں، انھوں نے ایک کالی کلوٹی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا کہ مجھ پر مرگی کا دَورہ پڑتا ہے اور میرا ستر کھُل جاتا ہے، آپؐ میرے لیے اللہ سے دُعا فرمادیں، آپؐ نے فرمایا اگر تم چاہو تو صبر کرو، تمھیں جنّت ملے گی اور اگر تم چاہو تو میں اللہ تعالیٰ سے تمھاری صحت و عافیت کے لیے دُعا کروں، انھوں نے (صبر اور جنّت کو اختیار کر کے کہا) کہ آپؐ بس اتنی دُعا فرما دیجیے کہ میرا ستر نہ کھُلا کرے۔ آپؐ نے ان کے لیے یہ دُعا فرمادی (۲)

(٦) ابو ابراہیم عبداللہ بن اوفی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: بعض غزوات میں جس میں دُشمن سے مڈبھیڑ ہوئی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظار فرمایا یہاں تک کہ جب سورج ڈھل گیا تو آپؐ نے لشکر کے درمیان کھڑے ہو کر فرمایا، اے لوگو، دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، اللہ سے عافیت کی دُعا کرو لیکن جب مڈبھیڑ ہو جائے تو صبر کرو اور یقین رکھو کہ جنّت تلواروں کے سایوں تلے ہے (۳)

چند آثار (۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ

---

(۱) ریاض الصالحین بحوالہ بخاری (۲) ایضاً بحوالہ بخاری و مسلم (۳) ایضاً

عنہ کو ایک خط میں لکھا کہ: تم صبر کو اپنے اوپر لازم کر لو اور جان لو کہ صبر دو طرح کے ہوتے ہیں ان میں کا ایک دوسرے سے افضل ہے مصیبتوں پر صبر بہتر ہے لیکن اس سے افضل صبر وہ ہے جو ممنوعات و محرمات سے کیا جاتا ہے اور جان لو کہ صبر وہ چیز ہے جس پر ایمان کا قیام ہے اور یہ اس لیے کہ تقویٰ سب سے افضل نیکی ہے اور تقویٰ صبر ہی سے حاصل ہوتا ہے (۱)

(۲) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہا ہے کہ ایمان کی بنیاد چار ستونوں پر قائم ہے۔ یقین ۱۔ صبر ۲۔ جہاد ۳۔ عدل ۴۔ انھیں نے یہ بھی کہا ہے کہ صبر کو ایمان کی نسبت سے وہی مقام حاصل ہے جو جسم میں سر کو حاصل ہے، جس کا سر نہیں اس کا جسم نہیں اور جس میں صبر نہیں اس میں ایمان نہیں (۲)

(۳) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ایمان کی اونچی چوٹی اللہ کے حکم پر صبر اور قضاء و قدر سے رضامندی ہے (۳)

(۴) حضرت حبیب بن حبیب جب یہ آیت پڑھتے اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ط نِعْمَ الْعَبْدُ ط اِنَّهٗ اَوَّابٌ ○ (ہم نے اسے صابر پایا وہ اچھا بندہ ہے بے شک وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والا ہے) تو رونے لگتے تھے اور کہتے تھے سبحان اللہ، اسی نے صبر دیا اور اسی نے تعریف کی (۴)

ان آیات، اخبار و آثار سے صبر کی فضیلت اور دین میں اس کی اہمیت پوری طرح

---

(۱) احیاء علوم الدین جلد ۴ (۲) ایضا (۳) ایضا (۴) ایضا

واضح ہو جاتی ہے۔

صبر کی متعدد قسمیں

عام طور سے صبر کی تین قسمیں کی جاتی ہیں۔ طاعات و عبادات پر صبر۔ مصائب و آلام پر صبر۔ ممنوعات و محرمات سے صبر پھر انسان کے حالات کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں اور ہوتی ہیں۔ انسان کی ایک حالت تو وہ ہے جو اس کی طبیعت اور خواہش کے موافق ہوتی ہے مثلاً صحت، امن و سلامتی، مال و جاہ، ساز و سامان کی وسعت، اعوان و انصار کی کثرت، افرادِ خاندان کی کثرت اور اسی طرح دُنیا کی دوسری لذتیں اور عافیتیں

اور انسان کی دوسری حالت وہ ہے جو اس کی طبیعت اور خواہش کے ناموافق ہوتی ہے مثلاً بیماری، خوف و خطر، تنگ دستی، بے بسی و بے چارگی اور اسی طرح دنیا کی دوسری تکلیفیں اور مصیبتیں —— پہلی حالت میں طاعات و عبادات پر صبر اور ممنوعات و محرمات سے صبر کا درجہ بہت بلند ہے کیونکہ اس حالت میں نفس پر قابو رکھنا دوسری حالت کے مقابلے میں زیادہ مشکل کام ہے، صحت بھی ہو اور ساتھ ہی مال و دولت اور جاہ و مرتبہ بھی حاصل ہو تو انسان خواہشِ نفس کی پیروی اور خدا کی نافرمانی پر اتر آتا ہے یہاں تک کہ وہ اس حالت کو پہنچ جاتا ہے جس کو دینی اصطلاح میں بطَر اور طُغیان کہتے ہیں اور اس حالت کی طرف سورہ العلق کی اس آیت میں اشارہ ہے: كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ (بے شک انسان اپنی حد سے نکل جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے) اسی وجہ سے صوفیہ و علماء نے کہا ہے الصبر علی العافیۃ اشد من الصبر علی البلاء (عافیت پر صبر بلا پر صبر سے زیادہ دشوار ہے) جب متوکل باللہ نے اپنے دورِ حکومت میں امام احمد بن حنبل کو انعام و اکرام سے نوازنا چاہا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ یہ آزمایش، کوڑوں کی آزمایش سے زیادہ سخت ہے،

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن اور احادیث میں مسلمانوں کو مال اور اولاد کے فتنے سے بار بار ڈرایا گیا ہے کہ کہیں مال کی قوت اور لاٹھی کا زور انھیں سرکش نہ بنا دے۔
امام غزالی لکھتے ہیں کہ مردِ کامل وہ ہے جو عافیت پر صبر کرتا ہے اور اس پر صبر کے معنی یہ ہیں کہ دُنیا کی چیزوں کو دل میں جگہ نہ دے، انھیں اللہ کی امانت جانے اور یہ بھی خیال رکھے کہ دولت چھن بھی جاتی ہے، وہ تنعم و لذت، عیش و عشرت اور لہو و لعب میں منہمک نہ ہو، اللہ نے اس کے مال میں جو حقوق مقرر کیے ہیں مال خرچ کر کے وہ انھیں ادا کرے، اس کے بدن میں جو صحت و قوت دی گئی ہے اسے مخلوق کی مدد میں صرف کرے، اپنی زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کرے، غرض اللہ نے جو نعمت و قوت بھی اسے دے رکھی ہے اسے اس کی اطاعت میں لگائے، یہ وہ صبر ہے جس کا ڈانڈا شکر سے مل جاتا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے —— اس حالت کے صبر کو افضل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ فقر و افلاس اور ضعف و مرض کی حالت کے مقابلے میں اس شخص کو گناہوں اور خدا کی نافرمانیوں پر زیادہ قدرت حاصل ہوتی اور اسی پہلو سے اس حالت کے صبر کو افضل کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عافیت و قوت کا صبر مطلقاً افضل ہے اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ مصائب پر صبر کوئی ادنیٰ درجے کی چیز ہے مصائب پر صبر کی فضیلت میں اوپر چند حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ اور اگر اس ذیل کی تمام حدیثیں جمع کی جائیں تو ان کی تعداد کثیر ہوگی۔

صبر کے مختلف نام

امام غزالی نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ جس چیز پر صبر اور جس چیز سے صبر کرنا ہو ان کی نسبت و اضافت سے صبر کے مختلف نام ہو جاتے ہیں مثلاً پیٹ اور شرمگاہ کو حرام اور مکروہ سے بچانے میں صبر ہو تو اس کا نام عفت ہے اور صحت، قوت اور

فارغ البالی کی حالت میں صبر کا نام ضبطِ نفس ہے اور اس کی مخالف و متضاد حالت کا نام بَطَر ہے۔ اگر صبر، جنگ اور مقاتلہ کی حالت میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے اور اس کی مخالف حالت کا نام بزدلی۔ اگر غیظ و غضب کی حالت میں صبر ہو یعنی انسان غصہ پی جائے تو اس کا نام حلم ہے اور اس کی مخالف حالت کو تَذَمُّر کہتے ہیں۔ اگر آفاتِ سماوی و ارضی کی حالت میں ہو تو اس کا نام سعۃ الصدر (کشادہ دلی) ہے اور اس کی مخالف حالت کا نام ضجر اور ضیقِ صَدَر (تنگ دلی) ہے، اگر کسی کے راز کو مخفی رکھنے میں صبر ہو تو اس کا نام کتمان السر (اخفائے راز) ہے۔ اگر مباحات اور غیر ضروری سامانِ عیش و عافیت سے صبر ہو تو اس کا نام زہد ہے اور اس کی مخالف حالت کا نام حرص و طمع ـــــ اگر کمِ سامانِ زندگی پر صبر ہو تو اس کا نام قناعت ہے اور اس کی مخالف حالت کا نام شرہ ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ اکثر اخلاق ایمانی صبر میں داخل ہیں اسی لیے ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا ہو الصبر (ایمان، صبر ہے) یہ بات ایسی ہے جیسے ایک بار آپؐ نے حج کے بارے میں فرمایا: الحج عرفۃ (حج، وقوفِ عرفات کا نام) یعنی عرفات کا قیام حج کا سب سے بڑا رکن ہے کہ یہ فوت ہو جائے تو حج ہی فوت ہو جائے گا[1]

صبر کو ترقی دینے کی تدابیر

"صبر" کی ان تفصیلات کو سامنے رکھنے کے بعد اس میں تو کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس کے بغیر نہ دوزخ سے نجات مل سکتی ہے نہ رضائے الٰہی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ دین میں کوئی مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس

---

(۱) احیاء العلوم ج ۴

قوت کو کیسے بڑھایا جائے اور اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ اگر یہ سوال محض برائے سوال نہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلی چیز طلب صادق اور اپنا عزم و ارادہ ہے۔ طلبِ صادق اور تمنائے خام میں فرق یہ ہے کہ پہلی چیز انسان کو عمل پر آمادہ کرتی ہے اور دوسری چیز اسے صرف خیالات میں اُلجھائے رکھتی ہے۔ اس طلبِ صادق کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ”جو اللہ سے عفت چاہے گا، اللہ اس کو عفیف بنا دے گا اور جو قلب کا غنا طلب کرے گا اسے اللہ غنائے قلب عطا فرمائے گا اور جو بہ تکلف صبر اختیار کرے گا اللہ اس کو صبر عطا کرے گا“ ——— ہم یہاں صبر کو ترقی دینے کی چند تدابیر کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) اضافۂ علم و یقین کی سعی - جیسا کہ اوپر امام غزالی کے حوالے سے گزرا، صبر جس حالت کا نام ہے وہ علم و یقین سے پیدا ہوتی ہے اس لیے جب تک اس میں اضافہ نہ ہو، صبر کو ترقی نہیں دی جاسکتی، یہاں علم و یقین میں اضافے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی بے نیازی کے تصور کو تازہ اور زندہ کیا جائے گناہوں اور اللہ کی نافرمانیوں کے عظیم نقصانات اور ان کے مہلک نتائج کو ذہن میں حاضر کیا جائے، اسی طرح نیکیوں اور اللہ کی فرماں برداریوں کے عظیم اور بے پایاں اجر کو سامنے رکھا جائے، قیامت کی ہولناکیوں اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی سزاؤں پر یقین کو تازہ کیا جائے اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اپنی بندگی و غلامی کا شعور بیدار کیا جائے۔ دنیائے دوں کی حقارت، اس کی فنا پذیری اور خود اپنی زندگی کی بے ثباتی پر غور کیا جائے۔ یہ تمام باتیں ہر باشعور مومن کے دل و دماغ میں موجود ہوتی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ تنہائیوں میں ان پر غور و فکر کر کے انھیں ابھارا جائے اور مستحضر کیا جائے،

اسی علم و یقین نے انبیاء کرام علیہم السلام کو صبر کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچایا تھا اور اسی نے ان کے ماننے والوں کو صابرین کے گروہ میں داخل کیا اور قیامت تک داخل کرتا رہے گا۔

(۲) قرآن اور احادیث کا مطالعہ۔ یہ مطالعہ سمجھ کر ہونا چاہیے، بالخصوص ان حصوں اور مقامات کا مطالعہ جن میں انبیاء کرام علیہم السلام اور اللہ کے دوسرے نیک بندوں کے حالات و واقعات اور ان کی صفات مذکور ہیں، اس کے علاوہ اُن مقامات کا مطالعہ جن میں قیامت اور آخرت کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں کس چیز نے انھیں بے صبری سے بچایا اور حق و صداقت اور اطاعت پر قائم رکھا۔ میں یہاں چند واقعات کی طرف بطورِ مثال صرف اشارے کرتا ہوں، ان مقامات کو تفصیل کے ساتھ قرآن میں پڑھ لیا جائے۔

(الف) حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیزِ مصر کی بیوی کے درمیان جو واقعہ ہوا تھا اس کی تفصیل سورۂ یوسف میں پڑھ کر یہ دیکھیے کہ کس چیز نے انتہائی نازک حالت میں حضرت یوسفؑ کے دامنِ عفت کو آلودگی سے بچایا اور صبر کا وہ کتنا اعلیٰ مقام تھا جو انھیں حاصل ہوا۔ جس چیز نے انھیں محفوظ رکھا وہ صراحۃً اس جملے میں موجود ہے جو عین موقع پر انھوں نے کہا تھا:

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (یوسف ع ۳)

یوسفؑ نے کہا خدا کی پناہ، میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں!) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ پر جو احسان کیا تھا اس کے بے پناہ جذبۂ شکر نے

ان کو معصیت کے ارتکاب سے بچالیا۔

(ب) فرعون کے ساحر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور فرعون نے انھیں سخت ترین سزا کی دھمکی دی تو اس سخت حالت میں کس چیز نے انھیں حق پر قائم رکھا؟ اور یکایک وہ صبر کے اتنے اونچے مقام پر کس طرح پہنچ گئے؟ وہ چیز بھی صراحۃً ساحروں کے جواب میں موجود ہے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ (طٰہٰ ع ۳)

جادوگروں نے جواب دیا، قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم روشن نشانیاں آجانے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے ترجیح دیں تو جو کچھ کرنا چاہے کرے زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

اُخروی زندگی کے دوام اور دنیوی زندگی کی بے ثباتی کا زندہ شعور تھا جس نے نومسلم ساحروں کو سربکف بنادیا اور وہ صبر کے اونچے مقام تک پہنچ گئے۔

(ج) فرعون کے دربار میں ایک مردِ مومن کی تقریر اور سوال وجواب کی تفصیل سورہ المومن رکوع ۴ - ۵ میں پڑھیے، اُس بصیرت افروز واقعہ میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ فرعون جیسے جبار اور اس کی قوت کے سامنے کس چیز نے مردِ مومن کو ثابت قدم رکھا؟ یہ چیز بھی ان کی تقریر کے آخری ٹکڑے میں صراحۃً آئی ہے:

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (المومن ع ۵)

آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اسے یاد کروگے اور اپنا معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔

"تفویض" مقاماتِ تصوف کا ایک بلند مقام ہے۔ یہاں اس کا مفہوم یہ ہے کہ

مردِ مومن کو اس یقین نے صبر کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا کہ اللہ تعالیٰ دانا و بینا اور اپنے وفادار بندوں کے تمام معاملات کا کفیل و کیل ہے۔ انھوں نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا اور مطمئن ہو گئے۔ آگے کی آیت بتاتی ہے کہ اللہ نے انھیں فرعون کے مکر و شر سے بچا لیا۔

(د) سورہ یٰس رکوع ۲ میں "اصحاب القریہ" کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ داعیانِ حق کو اس قوم نے سنگ سار کر دینے کی دھمکی دی تو اس قوم کے ایک مردِ مسلمان دوڑتے ہوئے آئے اور داعیانِ حق کے سامنے سینہ سپر ہو گئے انھوں نے اپنی قوم کو اس بڑے جرم سے روکنے کے لیے تقریر کی لیکن قوم ماننے کے بجائے ان کی دشمن ہو گئی اور آخر کار انھیں شہید کر ڈالا۔ سوال یہ ہے کہ ان میں اتنا صبر کہاں سے آیا کہ جان دے دی لیکن ذرہ برابر مداہنت گوارا نہ کی۔ اس کا جواب ان کی تقریر میں موجود ہے۔ ان کو آخرت کے یقین اور اس یقین نے ثابت قدم رکھا کہ نفع و ضرر صرف اللہ کے دست قدرت میں ہے، اس کی مشیت کے بغیر کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا —— قرآن اور احادیث میں اس طرح کے بہت واقعات ملیں گے۔

(۳) صبر کو ترقی دینے کی تیسری تدبیر عمل ہے۔ امراضِ روحانی و قلبی جتنے بھی ہیں ان کی دوا علم و عمل سے مرکب ہوتی ہے، ہر مرض اور ہر غفلت کے لیے ایک الگ علم اور الگ عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہاں ان سب کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، یہ دوسرے امراض اور غفلتوں کے علاج کے لیے بھی نمونہ بن سکتی ہیں۔

(الف) فرض کیجیے کوئی مسلمان ایسا ہے جس کی نمازِ فجر غائب ہو جاتی ہے یا اکثر جماعت چھوٹ جاتی ہے۔ یہ ایک غفلت ہے جس کا علاج مطلوب ہے۔ دیکھنا

چاہیے کہ اس غفلت کا سبب کیا ہے؟ کیونکہ جب تک وہ سبب دُور نہ ہو یہ غفلت دُور نہ ہو گی۔ اگر اس کا سبب بے پروائی ہو تو اسے یہ علم حاصل کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جس کے لیے وہ نماز پڑھتا ہے، وقت پر اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی اہمیت کیا ہے نیز اسے یہ بھی جاننا اور سوچنا چاہیے کہ وہ اس غفلت کی وجہ سے روزانہ یا اکثر اپنے آپ کو کتنے بڑے اجر سے محروم کر رہا ہے۔ صحیح احادیث میں آتا ہے کہ نمازِ باجماعت، منفرد نماز سے ۲۵ یا ۲۷ درجہ زیادہ ہوتی ہے۔ اسے سوچنا چاہیے کہ دُنیا میں مثال کے طور پر روزانہ یا اکثر ۲۵ یا ۲۷ روپوں کا نقصان گوارا کرنے کے لیے تیار ہے؟ حالانکہ ۲۷ درجوں کا جو اجر ہو گا وہ دنیا کی کسی قیمت سے ناپا نہیں جاسکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ اس کی یہ بے پروائی اللہ کے نزدیک کتنی ناپسندیدہ ہو گی اور اس بات کا کتنا اندیشہ ہے کہ اس بے پروائی کے ساتھ جو نمازِ فجر وہ پڑھ رہا ہے خواہ قضا پڑھ رہا ہو یا وقت کے اندر تنہا ادا کر رہا ہو، اللہ کی بارگاہ میں ناقابلِ قبول قرار پائے۔ اگر نماز پڑھنے والا مومن مخلص ہے تو انشاءاللہ اس تفکر اور غور و فکر سے غفلت میں کمی واقع ہو گی اور وہ مسلسل فکر کرتا رہا تو بتدریج یہ غفلت دور ہو جائے گی۔ اس عملِ تفکر کے علاوہ اسے یہ بھی کرنا چاہیے کہ اپنے اوپر ایک ایسا عمل لازم کرے جو اس کے نفس پر شاق ہو۔ مثلاً اپنے اوپر کچھ صدقہ کرنا لازم کرے یا ایک دن کا روزہ یا کچھ نوافل لازم کرلے۔ غرض جو چیز اس کے نفس پر زیادہ شاق ہوتی ہو، ہر قضا یا ترکِ جماعت کے عوض وہی اپنے اوپر لازم کرے۔ اور اگر نمازِ فجر قضا ہونے یا جماعت چھوٹ جانے کا سبب رات کو دیر تک جاگنا ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ وہ اس عادت کو ترک کر دے، نمازِ عشا کے بعد دیر تک جاگنے اور غیر ضروری کاموں میں مشغول رہنے کی ممانعت احادیث میں اسی لیے آئی ہے۔

ضرورت سے جاگنا الگ چیز ہے لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ البتہ دیر تک جاگنے کی عادت بنا لینا جبکہ اس کی وجہ سے نمازِ فجر میں خلل واقع ہوتا ہو ایک جرم ہے جسے ترک کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور عمل اس کو کرنا چاہیے وہ یہ کہ یا تو وہ اپنے اوپر تہجد کی نماز لازم کرلے یا کم سے کم وقتِ جماعت سے اتنا پہلے جاگنا لازم کرلے کہ ضروریات سے فراغت، وضو اور سُنّتوں کے بعد جماعت کی تکبیرِ اولیٰ پالے ——— نیند نہ ٹوٹنے کا بہانہ ایک نفسانی بہانہ ہے اسے رد کر دینا چاہیے۔ جب اسے نمازِ فجر کے وقت یا اس سے پہلے کہیں سفر کرنا ہوتا ہے تو کس طرح نیند ٹوٹ جاتی ہے؟ یا تو وہ اس کا اہتمام کرتا ہے کہ وقت پر اس کو جگا دیا جائے یا جو فکر اسے لاحق ہوتی ہے وہ خود اسے وقت پر جگا دیتی ہے۔ ایک بات اور ہے۔ اگر غفلت کی وجہ سے کسی نماز کے قضا ہو جانے یا جماعت چھوٹ جانے کا اسے صدمہ پہنچے، دل میں حسرت اور تاسف کی کیفیت پیدا ہو اور اللہ سے اس کی معافی مانگے تو یہ عمل آئندہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

(۲) اگر کوئی مسلمان گھمنڈ میں مبتلا ہے جو ایک سخت رُوحانی اور قلبی مرض ہے تو اس مرض کی دوا بھی علم و عمل دونوں سے مل کر تیار ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی نعمتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور چونکہ یہ نعمتیں اور صلاحیتیں آزمائش کے طور پر دی گئی ہیں اس لیے ان میں یکسانی نہیں ہے۔ کسی کو کوئی نعمت زیادہ دی جاتی ہے، کسی کو کم۔ کسی کو کوئی صلاحیت زیادہ عطا کی جاتی ہے اور کسی کو کم۔ انسان کے اندر گھمنڈ اور تکبّر انھیں نعمتوں اور صلاحیتوں میں کسی ایک یا چند پر پیدا ہوتا ہے۔ کسی کو مال پر، کسی کو جمال پر، کسی کو جاہ و مرتبہ پر، کسی کو علم و فضل پر، کسی کو ذہانت پر، کسی کو بدن کی قوت پر اور کسی کو

عبادت پر۔ علم اور عبادت پر گھمنڈ تو درحقیقت ان دونوں کی نفی کے برابر ہے۔ تکبر کی حقیقت تین اجزا سے مل کر تیار ہوتی ہے، اس کا ایک جز تو خود تکبر کرنے والا ہے، دوسرا وہ شخص یا اشخاص ہیں جن پر تکبر کر رہا ہے اور تیسرا جز وہ چیز ہے جس کی بنا پر تکبر کر رہا ہے۔ تکبر کا مفہوم یہ ہے کہ کسی نعمت یا صلاحیت کی بنا پر اپنے آپ کو دوسروں سے بلند درجہ اور ان کو اپنے سے حقیر اور ذلیل سمجھے، یہ ایک قلبی و نفسی مرض ہے جس کا اظہار متکبر کے افعال اور اس کے حرکات و سکنات سے ہوتا ہے۔ مثلاً کسی مجلس و محفل میں جائے تو ان لوگوں کے درمیان بیٹھنا گوارا نہ کرے جنھیں وہ اپنے سے کم مرتبہ، اور حقیر سمجھتا ہے یا ان لوگوں کو جنھیں وہ اپنے سے پست سمجھتا ہے۔ ابتداءً سلام کرنا کسر شان تصور کرے اور جواب بھی اس انداز میں دے جیسے وہ ان پر کوئی احسان کر رہا ہے یا جسے وہ حقیر سمجھتا ہے اگر وہ اس کو نصیحت کرے تو اسے قبول نہ کرے بلکہ اسے اپنی توہین قرار دے یعنی یہ کہ ایک تھرڈ کلاس آدمی، فرسٹ کلاس آدمی کو نصیحت کرنے کا کیا حق رکھتا ہے یا ایسا کوئی شخص اس کی کسی بات کو رد کر دے تو وہ غضب ناک ہو جائے۔ غرض اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جو تکبر کی علامت قرار پاتی ہیں۔

اس سخت نفسانی بیماری کے لیے سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ اس کا تکبر حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کم سے کم کوئی مومن و مسلم یہ نہیں سمجھتا کہ جو نعمت و صلاحیت اس کے پاس ہے وہ کسی کا عطیہ نہیں بلکہ اس کا اپنا ذاتی ہے۔ وہ عقیدۃً یہی سمجھتا ہے کہ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہے پھر جو چیز اس کی ذاتی نہیں بلکہ خیرات کے طور پر اس کو ملی ہے اس پر گھمنڈ اور تکبر حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس خیرات کا شکریہ

نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں کے مقابلے میں جنھیں یہ خیرات کم ملی ہو، گھمنڈ کرے بلکہ یہ ہے کہ ان کے سامنے تواضع اختیار کرے اور یہ سمجھے کہ اللہ نے یہ نعمت مجھے زیادہ دے کر آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ تکبر کے علاج کا دوسرا علمی حصّہ یہ ہے کہ اس کی بُرائی اور مذمت میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطالعہ کرے اور اس کے ساتھ وہ ان آیات و احادیث کو بھی پڑھے جن میں تواضع کی فضیلت اور اس کا اجر بیان کیا گیا ہے، یہ علمی حصّہ غور و فکر اور تامل و تفکر کے پہلے حصّے کو تقویت پہنچائے گا۔

اس علاج کا عملی جزیہ ہے کہ جو افعال تکبر کی علامت ہیں ان کے خلاف اعمال و افعال کو بتدریج اپنی عادت بنائے ـــــ اس سلسلے میں بطورِ اُسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام اور تابعین کے واقعاتِ تواضع کا پُرخلوص مطالعہ بے حد مفید ہوگا۔ امام غزالی لکھتے ہیں:

(۱) ایک بار ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو اس پر آپؐ کی ہیبت سے لرزہ طاری ہو گیا، حضورؐ نے فرمایا، نہ گھبراؤ، سکون سے بیٹھو، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو قبیلۂ قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں جو دھوپ میں سوکھا ہوا نمکین گوشت کھاتی تھی (۱)

(۲) ایک بار حضرت عمرؓ نے مشک اپنی گردن پر اٹھائی اور باہر نکلے، لوگوں نے پوچھا اے امیر المومنین یہ کیا؟ انھوں نے جواب دیا، میرے نفس میں خود پسندی کا خیال پیدا ہوا تو میں نے چاہا کہ اسے ذلیل کروں (۲)

(۳) ایک رات حضرت عمر بن عبد العزیز کچھ لکھ رہے تھے اور ان کے پاس ایک

---

(۱) احیاء العلوم ج ۲ بیان تواضعہ صلی اللہ علیہ وسلم (۲) ازالۃ الخفا مقصد دوم

مہمان بھی ٹھہرے ہوئے تھے، چراغ میں تیل ختم ہو گیا اور وہ بجھنے لگا، مہمان نے اجازت طلب کی کہ میں اٹھ کر چراغ میں تیل ڈال دیتا ہوں، انھوں نے کہا کہ یہ اخلاق سے بعید ہے کہ مہمان کو زحمت دی جائے تب مہمان نے کہا میں خادم کو جگا دیتا ہوں وہ اسے درست کر دے گا، جواب ملا، نہیں، یہ ابھی سویا ہے۔ پھر وہ خود اٹھے، تیل کی کپّی سے چراغ میں تیل ڈال کر اسے ٹھیک کیا۔ اور جب اپنی جگہ واپس آئے تو مہمان نے تعجب سے کہا یا امیر المومنین آپ نے خود زحمت کی؟ جواب میں انھوں نے فرمایا جب میں اٹھ کر گیا تو عمر تھا اور جب واپس آیا تو عمر ہوں (۱)

یہ تین واقعات محض نمونے کے طور پر لکھے گئے ہیں، اس طرح کے واقعات پڑھ کر مومن کا قلب متاثر ہوتا ہے اور مرض کبر سے نجات پانے کا عزم پیدا ہوتا ہے۔

(ج) کوئی مسلمان بخل کی بیماری میں مبتلا ہے۔ نہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور نہ رشتہ داروں کے حقوق —— اس کا علاج کیا ہے؟

بخل، مال کی حد سے متجاوز محبت کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے پہلے حُبّ مال کے اسباب پر غور کرنا ہوگا —— اس کا ایک سبب یہ ہے کہ مال دار شخص اپنی خواہشاتِ نفس پوری کرنا چاہتا ہے جس کے حصول کا ذریعہ اکثر و بیشتر مال ہی ہوتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اسے اپنی عمر بھی طویل معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگر کسی شخص کو قطعی علم حاصل ہو جائے کہ کل اسے مرجانا ہے تو محض ایک دن کی زندگی کے لیے بخل اختیار نہیں کرے گا یہ اس صورت میں ہے کہ وہ صاحبِ اولاد نہ ہو اور اگر وہ صاحبِ اولاد ہے تو پھر اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اپنی

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ باب الخشوع والتواضع

زندگی اسے طویل معلوم ہوتی ہو بلکہ اب اہل وعیال، تحریکِ بخل کا ذریعہ بن جاتے ہیں یعنی یہ لوگ اس کی اپنی ذات کی جگہ لے لیتے ہیں۔

اس کا دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ خود مال ہی اس کا مقصود و مطلوب بن جاتا ہے اور وہ سونا چاندی دیکھ دیکھ کر اور روپے گن گن کر خوش ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے احادیث میں "عبدالدینار والدراہم" (دینار و درہم کے بندے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ایسے اشخاص دیکھے گئے ہیں کہ وہ بوڑھے بھی ہو گئے ہیں، صاحبِ اولاد بھی نہیں ہیں، ان کے پاس مال بھی بہت ہے لیکن وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور حد یہ ہے کہ خود بیمار پڑیں تو اپنے علاج پر بھی مال صرف نہیں کرتے۔ نہ خدا کا حق ادا کرتے ہیں، نہ اپنی ذات کا اور نہ دوسرے بندگانِ خدا کا ——— یہ ایک ایسا شدید قلبی مرض ہے کہ اس کا علاج بہت مشکل ہے بالخصوص جبکہ ایسا شخص بوڑھا بھی ہو گیا ہو۔ عام طور سے مال کی محبت اور بخل کے اسباب یہی ہوتے ہیں۔ اس کا علاج بھی علم اور عمل سے مرکب ہے، علمی جز یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد و خیالات اور ایمان و یقین کا ازسرِ نو جائزہ لے اور ان پر غور و فکر کرے۔ جیسا کہ اوپر تدابیر بیان کرنے سے پہلے لکھا گیا ہے کسی بھی مرض کو دور کرنے کے لیے اوّل قدم یہ ہے کہ مریض کو اپنے مرض کا احساس ہو اور اس کے علاج کے لیے طلبِ صادق پیدا ہو جائے۔ بخیل کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ مال کو اللہ کا عطیہ اور اپنے پاس امانت سمجھتا ہے یا نہیں؟ اگر خدانخواستہ اس کے اس عقیدے ہی میں خلل آ گیا ہو تو اسے اپنے اس عقیدے کو تازہ کرنا چاہیے۔ اس کے بغیر مال میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق ادا کرنا سخت مشکل ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اپنی ذات اور اہل وعیال پر اسراف کی حد تک مال خرچ کرتے ہیں لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کرتے

اس لیے اللہ و رسولؐ کی نظر میں وہ بخیل ہی ہوتے ہیں، بخل کی شرعی تعریف ہی یہ ہے کہ انسان مال کی زکوٰۃ ادا نہ کرے اور اللہ کے واجب کردہ حقوق میں اسے خرچ نہ کرے۔ بخیل مسلمان کو وہ لرزہ خیز سزائیں بھی یاد کرنی چاہییں جو قرآن اور احادیث میں زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لیے بیان کی گئی ہیں اور ساتھ ہی ان دُنیوی و اُخروی فوائد کو بھی سامنے رکھنا چاہیے جو زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو حاصل ہوں گے۔ یہ ایک اجمالی نظر ہے۔ اس کے بعد ہر شخص کو اپنے اپنے خاص اسبابِ بخل پر تفصیل کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ مثلاً جیسا کہ اوپر کہا گیا اگر کسی کو اپنی زندگی بہت طویل معلوم ہوتی ہو تو اسے سوچنا چاہیے کہ آخر اس خیال کی بنیاد کیا ہے؟ وہ سوچے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ یہ ایک شیطانی و نفسانی وسوسہ ہے کسی کو علم نہیں کہ کب موت کا فرشتہ اس کی گردن پکڑ لے گا ـــــــ اگر اولاد، محبتِ مال اور بخل کا سبب بنی ہوئی ہے تو اسے سوچنا چاہیے کہ اللہ نے اسی پہلو سے اولاد کو فتنہ کہا ہے پھر اسے یہ عقیدہ تازہ کرنا چاہیے کہ ہر بچہ اپنے ساتھ اپنی روزی لاتا ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کتنے ایسے بچے جن کے والدین ان کے لیے کچھ چھوڑ کر نہیں گئے تھے ان کی مالی حالت ان بچوں سے بہتر ہوگئی جن کے والدین ان کے لیے بہت کچھ چھوڑ کر مرے تھے۔

بخل کے علاج کا عملی جزیہ ہے کہ جیسے ہی اللہ کی توفیق اور علم و معرفت کے نتیجے میں احساسِ اطاعت تازہ ہو فوراً بلا تاخیر زکوٰۃ ادا کرنے اور حقوقِ واجبہ ادا کرنے کے لیے عملی قدم اٹھا دے، یہ انتہائی ضروری بات ہے اس کے بغیر اس کا مرض دُور نہیں ہو سکتا۔ انسان کے ساتھ شیطان اور اس کا اپنا نفس ہر وقت لگا ہوا ہے تاخیر کرنے سے ہوتا یہ ہے کہ دونوں اس کے جذبۂ خیر کو سرد کرنے میں لگ جاتے ہیں اور عموماً اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتے

ہیں ـــــ امام غزالی نے ایک بزرگ ابوالحسن بوشنجی کی یہ حکایت نقل کی ہے کہ ایک دن وہ کسی ضروری کام میں مشغول تھے کہ انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو پکارا اور کہا کہ میرے جسم سے قمیص اتار کر فلاں شخص کو دے آؤ۔ شاگرد نے عرض کی کہ آپ اپنے اس کام سے فارغ ہو کر قمیص بھجوا سکتے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ تاخیر کرنے سے کہیں میرا ارادہ بدل نہ جائے ـــــ مرضِ بخل کا علاج اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان بہ تکلف دل پر جبر کر کے مال خرچ کرے۔ دو چار، دس بار کے بعد تکلف اور جبر کی کیفیت کم ہوتی جائے گی اور پھر وہ بلا تکلف حقوقِ واجبہ ادا کرنے لگے گا۔

صبر کو ترقی دینے کی ان مثالوں کا حاصل یہ ہے کہ صبر کی ادنیٰ حالت کو استعمال کیے بغیر اعلیٰ حالت حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس طرح تجارت میں جب تک مال صرف نہ کیا جائے نفع کی صورت میں مزید مال کی توقع غلط ہے۔ اسی طرح جب تک فطری طور پر موجود صبر کو استعمال نہ کیا جائے اس میں مزید قوت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں خیالِ خام کے پھندے سے بچائے اور امراضِ قلب کے علاج کے لیے طلبِ صادق عطا فرمائے۔

(۴) صبر کو ترقی دینے کی چوتھی اور سب سے زیادہ مؤثر تدبیر یہ ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کیونکہ اسی کے خزانۂ فیض و کرم سے سب کچھ عطا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

فَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (النحل ع ۱۶)

اے محمدؐ، صبر سے کام کیے جاؤ، اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔

جب صبر اللہ کی توفیق سے ملتا ہے تو اس کے لیے اس سے دُعا کرنی ہی چاہیے۔ قرآن میں صبر کے لیے دعا کا نمونہ بھی موجود ہے:

اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (البقرہ ع ۳۳) — اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمارے قدم جما دے۔

حقیقت یہی ہے کہ اللہ ہی ہے جو صبر عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو مشکل حالات میں اپنے بندے کو ثابت قدم رکھتا ہے اس لیے صبر کو ترقی دینے کی ہر صحیح تدبیر اختیار کرتے ہوئے اللہ سے دعا اور اسی کے کرم پر اعتماد کرنا چاہیے۔

کسی نعمت و احسان پر مُنعم و مُحسن کی مدح و ثنا اور حقِ نعمت و احسان ادا کرنے کا نام شکر ہے، اس کا تعلق دل، زبان اور دیگر اعضا و جوارح سب سے ہوتا ہے، دل نعمت و احسان کا احساس کرتا ہے، زبان اس کا اعتراف اور مدح و ثنا کرتی ہے اور دیگر اعضا و جوارح، نعمت و احسان کا حق بھی ادا کرتے ہیں اور محسن و منعم کا حق بھی ——— تمام نعمتوں کا حقیقی منعم و محسن اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اس کا شکر ہر انسان پر واجب ہے۔ درحقیقت ایمان بھی اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات کا شکر ہی ہے اور یہ شکر وہ ہے کہ اس کے بغیر انسان کو خدا کے غضب اور دوزخ سے نجات نہیں مل سکتی، شکر کا ضد کفرانِ نعمت ہے اور سب سے بڑی ناشکری ایمان کا انکار ہے اور یہ ناشکری وہ حقیقی کفر ہے جو انسان کو اللہ کی ابدی لعنت میں گرفتار کر دیتا ہے۔ اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں اس لیے انسانوں پر بے شمار شکر واجب ہوتے ہیں لیکن ایسے انسان کم ہیں جو دل، زبان اور دیگر اعضا و جوارح سے اتنا شکر بھی ادا کرتے ہوں جتنا ان کی وسعت و قدرت میں ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ (اور میرے بہت شکر گزار بندے کم ہیں) شکور، شاکر کا مبالغہ ہے اس لیے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ایسے بندے کم ہیں جو اپنی قدرت و وسعت کی حد تک بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہوں۔

"صبر" کا تعلق عام طور پر بلا و مصیبت سے ہوتا ہے اور شکر کا عافیت و آرام سے لیکن بعض چیزیں دو مختلف نسبتوں کی وجہ سے بیک وقت مصیبت بھی ہوتی ہیں اور نعمت بھی مثلاً مومن و مسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مصیبت آتی ہے وہ دُنیا کے لحاظ سے مصیبت ہوتی ہے اور اُخروی اجر کے لحاظ سے نعمت ـــــ ایسے موقع پر صبر اور شکر دونوں کا اجتماع ہوجاتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے بعض ایسے بندے بھی ہوتے ہیں جو محبتِ الٰہی کے غلبۂ حال میں مصیبت میں لذّت محسوس کرنے لگتے ہیں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، اسی کیفیت کا اظہار ایک شاعر نے کیا ہے

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یہی موقع ہے جس کے لیے کہا گیا ہے: ہرچہ از دوست می رسد نیکو است

ـــــ امام غزالی نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ہر مصیبت جو مجھ پر آئی، اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کے چار انعامات لائی ایک یہ کہ اس کا تعلق میری دُنیا سے تھا دین سے نہ تھا دوسرا یہ کہ اس مصیبت سے کوئی بڑی مصیبت بھی آسکتی تھی مگر اللہ کے کرم سے چھوٹی آئی تیسرا یہ کہ میں قضا و قدر کے فیصلے پر راضی رہا اور چوتھا یہ کہ میں اس پر اجر و ثواب کا امیدوار ہوں (۱)

امام غزالی نے ایک اور موثّر حکایت یہ لکھی ہے:

بعض اہلِ دل بزرگ کے ایک دوست تھے اتفاقاً بادشاہ نے

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴ باب الشکر

ان کے دوست کو قید کر دیا انھوں نے بزرگ کے پاس خبر بھیجی
اور اپنی تکلیف کی شکایت کی، انھوں نے ان کو پیغام بھیجا کہ
اللہ کا شکرادا کرو پھر جب قید خانے میں ان پر مار پڑی تو بزرگ
کو خبر بھجوائی انھوں نے کہلوایا کہ اللہ کا شکر کرو پھر ایک مجوسی
اسی قید خانے میں لایا گیا اس کے پاؤں میں جو زنجیر ڈالی گئی اسی کا
ایک حلقہ ان کے پاؤں میں بھی ڈال دیا گیا انھوں نے بزرگ کو
اس کی خبر بھجوائی ان کا جواب یہی تھا کہ اللہ کا شکرادا کرو۔ اس
مجوسی کو دست آنے کی شکایت تھی، بار بار اسے دست آتے اور
مجبوراً انھیں اس کے ساتھ کھڑا رہنا پڑتا یہاں تک کہ وہ فارغ ہو
انھوں نے اس بڑی مصیبت کی خبر بھجوائی، ان کا جواب یہی آیا کہ
اللہ کا شکرادا کرو اب تو وہ جھنجلائے انھوں نے کہلوایا کہ کب
تک اللہ کا شکرادا کروں، اس مصیبت سے بڑی مصیبت کیا ہوگی؟
اس کے جواب میں انھوں نے جو پیغام بھجوایا اس کا حاصل یہ تھا
کہ اللہ نے تمھیں ایمان کی دولت دے رکھی ہے، سوچو، غور کرو کہ
جو زنار مجوسی کی کمر میں بندھا ہوا ہے اگر وہی تمھاری کمر میں بھی
ہوتا تو کیا ہوتا؟

اسی کے قریب ایک واقعہ انھوں نے یہ لکھا ہے:

ایک بزرگ کہیں جارہے تھے کہ اوپر چھت سے کسی نے ان کے
اوپر ایک طشت راکھ انڈیل دی، انھوں نے اس پر سجدۂ شکر
ادا کیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیسا سجدہ تھا؟ انھوں نے جواب دیا
کہ مجھے تو اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں مجھ پر آگ نہ انڈیل دی جائے،

اس کے عوض راکھ تو اللہ کا ایک احسان ہے (۱)

یہ شکر کا وہ مقام ہے جو انھیں لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جن کے قلب و دماغ پر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اپنی کوتاہی و تقصیر کا احساس چھایا ہوا ہو۔

منعمِ حقیقی اللہ عزّ وجل کا شکر یہ ہے کہ دل اس کی تعظیم، اس کی نعمتوں کے احساس و اعتراف اور اس کی محبت سے معمور ہو، زبان اس کی حمد سے تر رہے اور اعضاء و جوارح اس کی بندگی و اطاعت میں سرگرم رہیں۔ اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ انھیں اللہ کی مرضیات میں صرف کیا جائے معصیت اور نافرمانی میں صرف نہ کیا جائے ـــــــ اللہ تعالیٰ اپنی بہت سی نعمتیں دوسروں کے واسطے سے دلوا تا ہے، ان واسطوں اور ذریعوں کا بھی علی قدر مراتب (جس کا جو درجہ و مرتبہ ہو) شکریہ، ادا کرنا ضروری ہے۔

گریۂ شکر و سپاس

الرسالۃ القشیریہ میں امام قشیری نے اپنی سند سے حضرت عائشہ رض کی یہ حدیث درج کی ہے:

"عطاء کہتے ہیں کہ میں عبید بن عمیر کے ساتھ حضرت عائشہ رضہ کے یہاں گیا اور میں نے پوچھا کہ آپ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ سب سے تعجب انگیز واقعہ سنائیے جو آپ نے دیکھا ہو۔ وہ رونے لگیں اور کہا کہ حضورؐ کا کون سا حال سب سے زیادہ تعجب انگیز نہ تھا۔ ایک رات وہ میرے بستر پر تشریف لائے اور فرمایا: بنت ابو بکر مجھے اجازت دو کہ میں اپنے رب کی عبادت

---

(۱) ایضاً

کروں، میں نے کہا آپ کا قرب مجھے بہت محبوب ہے لیکن میں آپ کی خواہش کو ترجیح دیتی ہوں، یہ سن کر آپ اُٹھے اور ایک مشک کے پاس جاکر اچھی طرح وضو کیا، اس کے بعد نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ اور آپؐ پر گریہ طاری ہو گیا یہاں تک کہ آنسو بہہ کر صدرِ مبارک تک پہنچ گئے پھر آپؐ نے رکوع کیا اور روتے رہے، پھر آپؐ نے سجدہ کیا اور روتے رہے پھر کھڑے ہوئے اور روتے رہے، آپؐ اسی حال میں رہے یہاں تک کہ رات ختم ہو گئی اور بلالؓ نے آکر نمازِ فجر کی اطلاع دی، میں نے کہا یا رسولؐ اللہ آپؐ کی اگلی پچھلی لغزشیں اللہ نے بخش دی ہیں پھر آپؐ کیوں روتے ہیں، حضورؐ نے فرمایا کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں پھر یہ کہ میں کیوں نہ روؤں جبکہ مجھ پر اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ سے لعلکم تفلحون تک کی آیتیں نازل ہوئی ہیں (سورہ آل عمران کا آخری رکوع) (۱)

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ باب الشکر

توکّل

توکل علی اللہ کے بیان سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ ۱۸ آیتوں میں اللہ پر توکل کرنے کا صریح حکم دیا گیا ہے اور بعض آیتوں میں اس کو ایمان کا لازمی تقاضہ اور لازمی علامت قرار دیا گیا ہے۔ ۱۰ آیتوں میں توکلت اور توکلنا کے صیغے میں توکل علی اللہ کا اظہار و اقرار موجود ہے۔ ۶ آیتوں میں بطورِ صفت اس کا ذکر ہے اور تین آیتوں میں اس کا اجر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد آیتوں میں انبیاء کرام علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے متوکّل بندوں کے متوکلانہ جملوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ممدوح و مطلوب انسانی صفات میں صبر کے علاوہ کوئی دوسری صفت ایسی نہیں ہے جس کا قرآن میں اس کثرت سے حکم دیا گیا ہو۔ اس سے صبر اور توکّل کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلامی تصوّف میں بھی توکل علی اللہ کو وہی مقام دیا گیا ہے جو قرآن و حدیث میں اسے حاصل ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم ج ۴ میں لکھا ہے:

> "توکّل، دین کے منازل میں سے ایک منزل، اصحابِ علم و یقین کے مقامات میں سے ایک مقام اور مقربین کے بلند درجات میں سے ایک بلند درجہ ہے۔"

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"توکل کی اصل، توحید ہے اور توکل ابواب ایمان میں سے ایک باب ہے۔ توحید کی تعبیر تمہارا یہ قول ہے لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ، اسی طرح اللہ کی قدرت پر ایمان کی تعبیر تمہارے قول لہ الملک سے ہوتی ہے اور اللہ کے جود و کرم اور اس کی حکمت پر ایمان کی تعبیر تمہارے قول فلہ الحمد سے ہوتی ہے۔ جس شخص نے "لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ، لہ الملک ولہ الحمد وہو علیٰ کل شئی قدیر" کہا اس کا ایمان مکمل ہو گیا جو توکل کی اصل ہے"

شیخ الاسلام زکریا انصاری نے رسالہ قشیریہ کی شرح میں لکھا ہے:

"توکل ایمان کے لوازم میں سے ہے، اگر اللہ پر توکل نہ ہو تو اس پر ایمان بھی نہ ہوگا کیونکہ ایمان اللہ کی توحید کا نام ہے اور جو شخص غیر اللہ پر اعتماد کرتا ہے وہ فی الحقیقت موحد نہیں ہے خواہ اپنی زبان سے توحید کا اقرار کرتا ہو"

توکل سے متعلق امام قشیری نے اپنے رسالے میں قرآن کی تین آیتوں کے صرف وہ ٹکڑے نقل کیے ہیں جن میں توکل کا لفظ موجود ہے امام غزالی نے احیاء میں پانچ آیتیں اور امام نووی نے بھی ریاض الصالحین میں ۵ آیتیں نقل کی ہیں۔ بعض آیتیں تینوں کتابوں میں مشترک ہیں۔ میں ان آیتوں کے ترجمے جو ان کتابوں میں نقل کی گئی ہیں، حوالوں کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

(۱) جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو اور جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لیے وہ کافی ہے۔ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے، اللہ نے ہر چیز کے لیے

ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے (الطلاق : ۲-۳)
یہ آیت امام غزالی اور امام نووی نے بھی نقل کی ہے۔

(۲) امام قشیری نے وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ کا ٹکڑا نقل کیا ہے۔ یہ ٹکڑا قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں ہے میں سورہ التغابن کی آیت کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں

اللہ، اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، اور اللہ پر چاہیے بھروسہ کریں ایمان والے (التغابن : ۱۳)

(۳) کہا دو مردوں نے اللہ سے ڈرنے والوں میں سے کہ خدا کی نوازش تھی ان دو پر، گھس جاؤ ان پر حملہ کر کے دروازے میں پھر جب تم اس میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو گے اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان والے ہو (المائدہ: ۲۳)
یہ آیت امام غزالی نے بھی نقل کی ہے۔

امام غزالی کی پیش کردہ آیتوں کے ترجمے

(۱) اور ہم کیوں بھروسہ نہ کریں اللہ پر اور دکھا چکا ہم کو ہماری راہیں، اور ہم صبر کریں گے ایذا پر جو تم ہم کو دیتے ہو اور اللہ پر بھروسہ چاہیے بھروسے والوں کو (ابراہیم : ۱۲)

(۲) جبکہ منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں کو روگ لگا ہوا ہے، کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو تو ان کے دین نے خبط میں مبتلا کر رکھا ہے اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔ (انفال : ۴۹)

امام نووی کی نقل کردہ آیتوں کے ترجمے

(۱) اور اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں، اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اسی کا

باخبر ہونا کافی ہے (الفرقان: ۵۸)

(۲و۳) اور جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ توکل کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔
(آل عمران: ۱۵۹-۶۰)

(۴) سچے اہلِ ایمان تو وہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں (انفال: ۲) تفسیر کی کتابوں میں ان سب آیتوں کی تشریحات پڑھنی چاہییں۔ ہم طوالت کے خوف سے یہاں تشریحات پیش نہیں کر رہے ہیں۔

احادیثِ نبوی

تصوف کی کتابوں میں بھی توکل کی فضیلت میں حدیثیں پیش کی گئی ہیں لیکن ان میں عام طور پر کتب احادیث کے حوالے نہیں ہوتے اس کے علاوہ ان میں یہ لحاظ بھی نہیں رکھا جاتا کہ جو حدیث پیش کی جا رہی ہے اس کا درجہ کیا ہے اس لیے میں یہاں کتب احادیث کے حوالوں سے چند احادیث کے ترجمے پیش کرتا ہوں۔

(۱) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میرے سامنے امتیں پیش کی گئیں تو میں نے کسی نبی کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے ساتھ محض تھوڑی سی جماعت ہے، کسی نبی کو دیکھا کہ ان کے ساتھ ایک اور دو آدمی ہیں اور کسی نبی کو دیکھا کہ ان کے ساتھ کوئی آدمی نہیں ہے۔ اتنے میں میرے سامنے ایک بڑی جماعت

آئی میں نے خیال کیا کہ یہ میری امت ہے، مجھ سے کہا گیا کہ یہ لوگ موسیٰ اور ان کی قوم ہیں لیکن تم ایک طرف دیکھو تو مجھے ایک بڑی جماعت نظر آئی، کہا گیا کہ دوسری طرف دیکھو، اُدھر بھی ایک کثیر جماعت نظر آئی، مجھ سے کہا گیا کہ یہ تمھاری امت ہے اور اس گروہ کے ساتھ ستر ہزار وہ لوگ ہیں جو جنت میں بغیر کسی حساب و عذاب کے داخل ہوں گے یہ فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور اپنے گھر میں داخل ہو گئے، اس کے بعد لوگ اس پر غور و خوض کرنے لگے کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں جو بلا حساب و عذاب جنت میں داخل ہوں گے، کسی نے کہا کہ شاید وہ رسول اللہؐ کے صحابہ ہیں، کسی نے کہا شاید وہ لوگ ہیں جو عہدِ اسلام میں پیدا ہوئے اور انھوں نے کبھی کسی کو اللہ کا شریک نہیں قرار دیا، اسی طرح کی اور باتیں لوگوں نے کہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے پاس آئے اور پوچھا کہ وہ کیا غور و خوض کر رہے ہیں؟ لوگوں نے بتایا. آپؐ نے فرمایا وہ لوگ وہ ہیں جو نہ دوسروں کی جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور نہ خود اپنے اوپر جھاڑ پھونک کراتے ہیں، وہ بدفالی نہیں لیتے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ یہ سُن کر عکاشہ بن محصن کھڑے ہوئے اور کہا آپؐ اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ مجھے بھی اس جماعت میں داخل کر دے آپؐ نے فرمایا تم انھیں لوگوں میں سے ہو —— پھر ایک دوسرے صاحب کھڑے ہوئے اور کہا میرے لیے بھی یہ دُعا کر دیجیے آپؐ نے فرمایا عکاشہ تم پر سبقت لے گئے (ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم)

(۲) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام جب آگ میں ڈالے گئے تو ان کا آخری کلمہ یہ تھا حسبی اللہ

ونعم الوکیل (میرے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے)

(ایضاً بحوالہ بخاری و مسلم)

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں ایسے لوگ بھی داخل ہوں گے جن کے دل پرندوں کے دلوں کی طرح ہوں گے۔ بعض محدثین نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ وہ توکل کرنے والے لوگ ہوں گے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ "رقیق القلب" لوگ ہوں گے (ایضاً بحوالہ مسلم)

(۴) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ اگر تم اللہ پر توکل (اعتماد) کرو جیسا کہ حق ہے توکل کرنے کا تو وہ تمھیں اس طرح رزق دے جس طرح پرندوں کو دیتا ہے کہ وہ صبح کو خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھونسلوں میں واپس آتے ہیں (ایضاً بحوالہ ترمذی)

توکل کا مفہوم اور اُس کی حقیقت

توکل کے لغوی معنی کسی پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کے ہیں اس لفظ کے مادّے میں عاجزی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اسی لحاظ سے وکیل اس شخص کو کہتے ہیں جس پر بھروسہ کیا جائے اور اپنا کام اس کے سپرد کر دیا جائے۔ اس لغوی معنی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرنے کو توکل علی اللہ کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ دُنیا میں کسی چیز کی کامیابی کے لیے جو اسباب اللہ نے مقرر کیے ہیں انھیں استعمال کیا جائے لیکن کامیابی کے لیے ان اسباب پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ اعتماد اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت پر کیا جائے، توکل ترکِ اسباب

کا نام نہیں بلکہ اسباب پر ترکِ اعتماد کا نام ہے۔ اس کی حقیقت جاننے کے لیے اصلاً ان آیات کا جن میں توکل کا ذکر ہو مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان آیتوں اور ان کے سیاق و سباق سے توکل کی حقیقت پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اوپر قرآنِ کریم کی جن آیتوں کے ترجمے نقل کیے گئے ہیں ان میں ایک سورہ المائدہ کی آیت ۲۳ بھی ہے۔ اس آیت پر حاشیہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا ہے:

"وہ دو شخص حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا تھے جو خدا سے ڈرتے تھے اسی لیے عمالقہ وغیرہ کا کچھ ڈر ان کو نہ رہا۔

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

ان دونوں نے کہا، ہمت کر کے شہر کے پھاٹک تک تو چلو پھر خدا تم کو غالب کرے گا۔ خدا اسی کی مدد کرتا ہے جو خود بھی اپنی مدد کرے۔ معلوم ہوا کہ اسبابِ مشروعہ کو ترک کرنا توکل نہیں "توکل" یہ ہے کہ کسی نیک مقصد کے لیے انتہائی کوشش اور جہاد کرے پھر اس کے مثمر و منتج ہونے کے لیے خدا پر بھروسہ رکھے اپنی کوشش پر نازاں اور مغرور نہ ہو۔ باقی اسبابِ مشروعہ کو چھوڑ کر خالی امیدیں باندھتے رہنا توکل نہیں تعطل ہے۔" (حاشیۂ قرآن)

یہی بات صوفیۂ متقدمین نے بھی اپنی کتابوں میں لکھی ہے اور اگر کوئی قول ایسا پایا گیا ہے جس میں ترکِ اسباب کو توکل کہا گیا ہے تو انھوں نے اس قول کی تاویل کی ہے۔ توکل میں بھی ہمارے لیے نمونہ انبیاء کرام علیہم السلام بالخصوص سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی سیرت کو قیامت تک کے لیے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا گیا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

صوفیۂ کرام کے اقوال و احوال

صوفیۂ کرام نے اپنے ذوق کے مطابق توکل کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ہم یہاں ان کے چند اقوال پیش کرتے ہیں:

(۱) کسی نے حاتم اصم سے پوچھا کہ آپ کو رزق کہاں سے ملتا ہے؟ انھوں نے جواب میں یہ آیت پڑھی وَلِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰکِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَا یَفْقَهُوْنَ ۝ (اور آسمانوں اور زمینوں کے خزانوں کا مالک اللہ ہے مگر یہ منافقین سمجھتے نہیں ہیں (المنافقون: ۷) اس کے بعد انھوں نے اس شخص سے کہا، جان لو کہ توکل کا محل قلب ہے، اگر کوئی شخص دل میں یہ یقین رکھتا ہو کہ رزق کی تنگی و فراخی سب اللہ کی طرف سے ہے تو بظاہر حصولِ رزق کا کوئی سبب اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔

(۲) بشر الحافی نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا حالانکہ وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں، اگر وہ واقعی اللہ پر بھروسہ رکھتے تو اللہ جس حال میں انھیں رکھتا اس پر راضی رہتے اس لیے کہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا توکل کے ثمرات میں سے ہے۔

(۳) ابوتراب نخشبی نے کہا، توکل یہ ہے کہ انسان اپنے جسم کو احکامِ عبودیت کے حوالے کر دے، اپنے دل کا تعلق اللہ کی ربوبیت سے جوڑ لے اور اسے پورا اطمینان ہو کہ اللہ کافی ہے، جو کچھ ملے اس پر شکر کرے اور جو نہ ملے اس پر صبر کرے۔

(۴) قال سہل بن عبد اللہ من طعن فی الحرکۃ فقد طعن فی السنۃ ومن طعن فی التوکل فقد طعن فی الایمان۔

سہل بن عبد اللہ نے کہا جس نے کسب پر طعن کیا اس نے سنت پر طعن کیا اور جس نے توکل پر طعن کیا اس نے ایمان پر طعن کیا۔

اس قول کی شرح یہ ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے کوئی سبب اختیار کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال سے ثابت ہے، مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے خندق کھودنا، جنگ میں زرہ پہننا، حفاظت کے لیے قلعہ بندی، اور سفر میں زادِ راہ لے جانا یہ سب باتیں سنّتِ رسول ؐ سے ثابت ہیں، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسببات کو ان کے اسباب کے ساتھ معلق کیا ہے اور قرآن میں اسباب مہیا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے مثلاً فرمایا گیا ہے:
وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (انفال: ۶۰)
(اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے لیے تیار رکھو)
اب اگر کوئی شخص کسب یعنی سبب اختیار کرنے پر طعن کرتا ہے تو وہ سنّتِ رسول ؐ پر طعن کرتا ہے اور اللہ کے اس طریقے پر طعن کرتا ہے جو دُنیا میں جاری ہے۔ توکل پر طعن کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی مقصد کے حصول کے لیے اپنی دوڑ دھوپ اور اپنی قوت ہی کو کافی سمجھ لے، یہ خیال اللہ پر ایمان کے منافی ہے۔

(۵) ابراہیم الخواص ایک بڑے متوکل بزرگ تھے اس کے باوجود، سوئی، دھاگے، پیالہ اور قینچی ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی، ان سے کسی نے پوچھا، "اے ابو اسحاق آپ یہ چیزیں اپنے ساتھ کیوں رکھتے ہیں؟ سوال کا مطلب یہ تھا کہ یہ توکل کے خلاف معلوم ہوتا ہے، انھوں ؒ نے جواب دیا اس قسم کی چیزیں توکل کے خلاف نہیں ہیں اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ نے ہم پر کچھ فرائض عائد کیے ہیں جیسے نماز، اور محتاج کے پاس کبھی ایک ہی لباس ہوتا ہے اور وہ بسا اوقات پھٹ جاتا ہے اب اگر اس کے پاس سوئی اور دھاگے نہ ہوں تو

نماز میں ستر عورت کھل جائے گا اور اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر اس کے ساتھ پیالہ یا چھاگل نہ ہو تو اس کی طہارت فاسد ہو گی اور اگر قینچی نہ ہو تو مونچھ بڑھ جانے کی صورت میں وہ کس چیز سے اس کو سُنت کے مطابق کرے گا، جب تم کسی فقیر کو دیکھو کہ اس کے پاس سوئی دھاگے اور پیالہ نہیں ہے تو سمجھ لو کہ اس کی نماز ناقص ہے۔

(٦) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا، بیٹے! دُنیا ایک گہرا سمندر ہے اور اس میں بہت سے لوگ ڈوب چکے ہیں، اگر تم سے ہو سکے تو اس میں اپنی کشتی ایمان باللہ کو بناؤ، اس کا سامان اللہ عزوجل کے احکام پر عمل ہو اور اس کی پتوار توکل علی اللہ ہو، امید ہے کہ نجات پا جاؤ گے۔

(٧) عبداللہ بن مبارکؒ نے کہا، جس نے حرام کا ایک پیسہ بھی لیا وہ قطعاً متوکل نہیں ہے یعنی اس میں توکل علی اللہ کا نام و نشان بھی موجود نہیں ہے۔

(٨) حذیفہ مرعشی جنھوں نے ابراہیم ادہم کی خدمت کی تھی اور ان کی صحبت میں رہے تھے، ان سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ آپ نے جو سب سے عجیب واقعہ دیکھا ہو وہ بیان کیجیے۔ انھوں نے کہا کہ میں ابراہیم ادہم کے ساتھ مکہ معظمہ جا رہا تھا، راستے میں کئی دن ایسے گزر گئے کہ ہمیں کھانے کی کوئی چیز نہیں ملی پھر ہم کوفہ پہنچے اور وہاں ایک غیر آباد مسجد میں ٹھہرے، انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا، حذیفہ میں تم میں بھوک کا اثر دیکھ رہا ہوں، میں نے کہا بات وہی ہے جو شیخ نے دیکھی۔ انھوں نے کہا میرے پاس قلم دوات اور کاغذ لاؤ، میں ان کے پاس لے گیا۔ انھوں نے لکھا،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ انت المقصود الیہ بکل حال والمشار	اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے ہر حال میں وہی مقصود اور ہر معنی کا مشار الیہ

الیہ ما بکل معنی — وہی ہے۔

انا حامد انا شاکر انا ذاکر — میں حامد ہوں میں شاکر ہوں میں ذاکر ہوں،
انا جائع انا نائع انا عاری — میں بھوکا ہوں میں پیاسا ہوں میں ننگا ہوں
هی ستة وانا الضمین لنصفها — یہ چھ چیزیں ہیں میں ان میں سے نصف کا ضامن
فکن الضمین لنصفها یا جاری — ہوں تو اے مجھ سے قریب ان میں سے نصف کا
مدحی بغیرك لهب نار خضتها — تو ضامن ہو جا۔ میری مدح تیرے غیر کے لیے
فاجر عبیدك من دخول النار — آگ کا شعلہ ہے جس میں میں گھس جاؤں گا
تو اپنے بندوں کو آگ میں گھسنے سے بچالے۔

یہ رقعہ لکھ کر انھوں نے میرے حوالے کیا اور کہا، اسے لے کر جاؤ اور اپنا دل صرف اللہ کی طرف متوجہ رکھو اور تمھیں جو سب سے پہلا آدمی ملے اسے دے دو خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ میں مسجد سے نکل کر آگے بڑھا، سب سے پہلا آدمی جو مجھے ملا وہ ایک خچر پر سوار تھا۔ میں نے وہ رقعہ اس کو دے دیا اس نے پڑھا اور رونے لگا۔ پھر پوچھا یہ رقعہ لکھنے والے کہاں ہیں۔ میں نے کہا وہ فلاں مسجد میں مقیم ہیں۔ اس نے مجھے ایک تھیلی دی جس میں چھ سو دینار تھے۔ پھر میری ایک دوسرے شخص سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس خچر سوار کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا یہ ایک عیسائی ہیں۔ میں ابراہیم ادہم کے پاس واپس ہوا اور پورا قصہ ان کو سُنایا، انھوں نے کہا ابھی اس تھیلی کو ہاتھ نہ لگاؤ، وہ شخص تھوڑی دیر میں یہاں آنے والا ہے۔ چنانچہ وہ تھوڑی دیر میں آیا، اس نے ابراہیم بن ادہمؒ کے سر کو بوسہ دیا اور اسلام لے آیا۔(١)

---

(١) یہ تمام اقوال و احوال رسالہ قشیریہ اور اس کی شرح سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔

توکّل علی اللہ کی وسعت

اللہ پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کا حکم صرف کسی دنیوی مصیبت سے بچنے اور حلال روزی کی تلاش ہی میں نہیں دیا گیا ہے بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ ہی پر اعتماد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک مومن کے لیے سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ شیطان کے فتنوں سے بچے اور زندگی کے تمام معاملات میں اسے ہدایت اور صحیح رہنمائی حاصل ہو۔ قرآن مجید میں صراحت ہے کہ اللہ پر توکّل، شیطان کے فتنوں سے بچاتا ہے اور ہدایت و رہنمائی کے لیے بھی اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ سورہ النحل میں ہے:

"جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو انھیں ان لوگوں پر تسلّط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔" (النحل: ۹۸-۹۹)

ان دونوں آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کتاب ہدایت ہے، اسی سے ہدایت اور صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور شیطان کے فتنوں سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے اللہ پر توکل ہی اس کے فتنوں سے بچا سکتا ہے۔ اس مضمون کی متعدد آیتیں قرآن میں ہیں ہم نے محض مثال کے لیے دو آیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے —— ہدایت و رہنمائی کے لیے صرف اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کی تعلیمات پر بھروسہ کرنا چاہیے، کسی اور سے ہدایت نہیں مل سکتی خواہ نماز اور روزے کے مسائل ہوں یا تزکیۂ نفس کے مسائل ہوں۔

قرآنِ کریم میں جہاں جہاں توکل علی اللہ کا حکم دیا گیا یا ترغیب دی گئی ہے ان تمام مواقع کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ توکّل کے معنی

یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر اعتماد، اس کی قدرت وحکمت پر بھروسہ اور اس
کے وعدوں پر یقین ہو۔ اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ توکل کی حقیقت
یہ ہے کہ بندۂ مومن ہر طرح کے حالات میں اللہ کی دکھائی ہوئی راہ پر ثابت قدم
رہے، اس سے انحراف نہ کرے اور مشکل حالات کو بدلنے کی ہر جائز تدبیر اختیار
کرے لیکن اس کا اصل اعتماد اپنے ذرائع و وسائل اور اپنی قوت وصلاحیت یا
کسی دوسرے کے ذرائع و وسائل اور اس کی قوت وقابلیت پر نہ ہو بلکہ صرف اللہ
کی قدرت اور اس کی تائید وتوفیق پر ہو ـــــ توکل کی یہ حقیقت جن لوگوں کے
عقیدہ وعمل میں سرایت کر جاتی ہے وہ کبھی بے حوصلہ اور مایوس نہیں ہوتے
اور انھیں اس کا بہت بڑا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ غیر اللہ سے بے خوف
ہو جاتے ہیں، بعض حدیثوں میں آتا ہے من احب ان یکون اقوی الناس
فلیتوکل علی اللہ (جو شخص چاہتا ہو کہ سب انسانوں سے قوی تر ہو جائے اسے
چاہیے کہ اللہ پر بھروسہ کرے) توکل سے انسان نہ صرف یہ کہ اللہ کی مدد کا مستحق
ہوتا بلکہ وہ اس کا محبوب بن جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ (بے شک
اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

حُسنِ خُلق

تصوّف میں بھی حسنِ خُلق کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ بعض ائمۂ تصوّف نے اس کی تعریف ہی حُسنِ اخلاق سے کی ہے، تصوّف کی تمام اعلیٰ درجے کی کتابوں میں حُسنِ اخلاق پر مستقل ابواب لکھے گئے ہیں، الاستاذ سید مصطفیٰ عروسی لکھتے ہیں:

واعلم ان حسن الخلق من اعظم ما انعم اللہ بہ علیٰ عبادہ المقربین المحبوبین (۱)

جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب اور محبوب بندوں کو جن انعامات سے نوازا ہے ان میں بہت بڑی نعمت حُسنِ خلق ہے۔

سید موصوف نے حُسنِ خلق کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

التخلی من الصفات المذمومة والتحلی بالصفات المحمودة علی طریق علم الشریعة

صفاتِ مذمومہ سے پاکی وصفاتِ محمودہ سے آراستگی، شریعتِ محمدیہ کے علم کے مطابق، حُسنِ خُلق ہے۔

یہ حسنِ خلق کی ایک جامع تعریف ہے۔ دوسرے بزرگوں نے اپنے ذوق کے مطابق، حُسنِ خلق کے بعض اہم ثمرات کو حسنِ خلق کہہ دیا ہے۔ مثلاً حضرت عبداللہ ابن

---

(۱) نتائج الافکار القدسیة ج ۲ ص ۱۸۵

مبارکؒ کہتے ہیں کہ حسنِ خلق چہرے کی بشاشت، ایذا رسانی سے پرہیز انفاقِ مال کا نام ہے۔ واسطی رحمہا اللہ نے کہا ہے، خلقِ عظیم یہ ہے کہ تم اپنی ذات کے لیے کسی سے مخاصمت نہ کرو اور نہ تمہاری ذات سے کسی کو مخاصمت ہو۔ یعنی حُسنِ خلق صَرفِ نظر اور عفوو درگزر کا نام ہے، حسین بن منصور نے کہا ہے کہ خلقِ عظیم کے معنی یہ ہیں کہ تمہارا مطالعۂ حق اتنا وسیع اور گہرا ہو کہ تم پر مخلوق کی جفا اثر انداز نہ ہو یعنی تم اسباب سے صرف نظر کرو اور تمہاری نگاہ مسبب الاسباب پر جمی رہے۔

اخلاق کی تشریح علمی انداز میں

امام غزالی رحمہا اللہ نے اخلاق کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

"خُلق اور خَلق دو الفاظ ہیں جو عموماً ایک ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے فُلَانٌ حَسَنُ الخُلُقِ وَالخَلْقِ فلاں شخص کا باطن بھی اچھا ہے اور ظاہر بھی اچھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خَلق سے مُراد ظاہری صورت ہے اور خُلق سے مُراد باطنی صورت ــــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جسم اور رُوح سے مُرکب ہے، جسم کا ادراک بَصر سے ہوتا ہے اور رُوح کا بصیرت سے، اور ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک مخصوص ہیئت اور صورت ہے خواہ وہ قبیح ہو یا جمیل۔ اب یوں سمجھو کہ خُلق نفس کی ایک ایسی ہیئت راسخہ کو کہتے ہیں جس سے افعال بہ سہولت، بلا تکلف، صادر ہوتے ہیں، اگر وہ ہیئتِ راسخہ ایسی ہے کہ اس سے اچھے اور قابلِ تعریف افعال صادر ہوتے ہیں تو اس ہیئت کا نام خُلقِ حسن ہے اور

اگر بُرے اور قابلِ مذمت افعال صادر ہوتے ہیں تو اسے
خُلقِ قبیح کہتے ہیں ہیئتِ راسخہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی
شخص سے کوئی اچھا یا بُرا فعل اتفاقاً کسی خاص سبب سے
صادر ہو گیا ہو تو اس کو اس شخص کا اخلاق نہیں کہیں گے مثلاً
اگر کوئی شخص کسی عارضی ضرورت سے اپنا مال خرچ کر دے
تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ سخی ہے اور اس کا خُلق سخاوت ہے
یا کوئی شخص کبھی اتفاق سے جھوٹ بول دے تو یہ نہیں کہا
جائے گا کہ جھوٹ اس کا اخلاق بن گیا ہے ــــــ اگر یہ
ہیئتِ راسخہ تمام صفاتِ حسنہ کی جامع ہے تو ایسا شخص
مطلقاً صاحبِ خُلقِ حسن ہوگا ورنہ جزوی طور پر جو صفت بھی
اس کا اخلاق بن گئی ہوگی وہ اسی کی طرف منسوب ہوگا (۱)

قرآن اور احادیث میں حُسنِ خُلق کی جو تعریفیں اور فضیلتیں آئی ہیں وہ اسی شخص
کے لیے ہیں جو تمام صفاتِ مذمومہ سے پاک اور تمام صفاتِ محمودہ سے آراستہ ہو
اور یہ مقام کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ بہت غنیمت ہے کہ کسی شخص میں
اچھی صفات زیادہ اور بُری صفات کم ہوں۔

حُسنِ اخلاق کی فضیلت قرآن میں

امام غزالی نے ذیل کی دو آیتیں پیش کی ہیں:

(۱) وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ٥ (ن والقلم)	اور بے شک آپ اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ معیار پر ہیں۔

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۳۲

(۲) خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۝
(الاعراف آخری رکوع)

اے نبیؐ، نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ اُلجھو۔

امام نوویؒ نے یہ آیت بھی نقل کی ہے
وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ (آل عمران ع ۱۴)

جو غصّے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔

خُلقِ حسن کا ذکر احادیث میں

(۱) قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلم انما بعثت لاتمم مكارم الاخلاق

میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کر دوں۔

(۲) قالت عائشة رضي الله عنها كان رسول الله صلى الله عليه وسلم خلقه القرآن

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق قرآن تھا۔

(۳) وَكَانَ مِنْ دُعَائِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ عَنْ سَيِّئِهَا إِلَّا أَنْتَ (۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یہ دعا بھی تھی۔ اے اللہ مجھے اچھے اخلاق کی ہدایت دے اچھے اخلاق کی ہدایت تیرے سوا کوئی نہیں دے سکتا اور مجھ سے بُرے اخلاق دُور کر دے، تیرے سوا کوئی اسے دُور نہیں کر سکتا۔

---

(۱) یہ تینوں حدیثیں احیاء العلوم ج ۳ سے لی گئی ہیں۔

امام نووی نے ریاض الصالحین میں جو حدیثیں نقل کی ہیں میں یہاں ان کے ترجمے پیش کرتا ہوں۔

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق میں تمام انسانوں سے بہتر تھے۔ (بخاری)

(۲) حضرت انس رض کہتے ہیں کہ میں نے دس سال حضور ص کی خدمت کی لیکن کبھی آپ ص نے مجھے اف بھی نہیں کہا۔ (بخاری و مسلم)

(۳) حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ص سے بِرّ اور اثم کے بارے میں سوال کیا آپ ص نے فرمایا بِرّ، حُسنِ خُلق کو کہتے ہیں اور اثم وہ ہے جو تمھارے دل میں کھٹکے اور تمھیں یہ ناپسند ہو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں (مُسلم)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سب سے بہتر آدمی وہ ہے جس کا اخلاق سب سے بہتر ہو (بخاری و مُسلم)

(۵) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن مومن کی ترازو میں حُسن خلق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہ ہو گی اور اللہ فحش گو اور بے ہُودہ گو سے نفرت کرتا ہے (ترمذی)

(۶) حضرت ابوہُریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا، وہ کون سی چیز ہے جو سب سے زیادہ، لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی آپ ص نے فرمایا اللہ کا تقویٰ اور حُسنِ خُلق (ترمذی)

(۷) حضرت ابوہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اُس مومن کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے جس کے اخلاق سب سے زیادہ اچھے ہیں (ترمذی)

(۸) حضرت ابوامامۃ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضورؐ نے فرمایا جو شخص اپنے اخلاق اچھے بنالے تو میں ضامن ہوں کہ اُسے اعلیٰ جنّت میں ایک گھر ملے گا (ابوداؤد)

(۹) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن تم میں سے وہی شخص مجھے سب سے زیادہ محبوب اور مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوگا جس کے اخلاق سب سے زیادہ اچھے ہوں گے اور مجھے سب سے زیادہ مبغوض اور مجھ سے سب سے زیادہ دُور وہ لوگ ہوں گے جو بہ تکلف بکواس کرنے والے، اپنی چرب زبانی سے دوسروں پر چھا جانے والے اور تکبّر و تبختر کے ساتھ گفتگو کرنے والے ہوں گے (ترمذی)

(۱۰) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ مومن اپنے حُسنِ خُلق سے صائم و قائم کا درجہ حاصل کرلیتا ہے (ابوداؤد)

یہاں صائم سے مُراد وہ شخص ہے جو بکثرت نفل روزے رکھتا ہے اور قائم سے مُراد وہ شب بیدار شخص ہے جو نمازِ تہجد ادا کرتا ہے۔

حُسنِ خُلق کی علامتیں

امام غزالی لکھتے ہیں کہ ہر انسان اپنے عیوب سے ناواقف ہوتا ہے، وہ جب تھوڑا سا

مجاہدہ کرکے بڑے بڑے گناہ اور بے حیائی کی باتوں کو ترک کر دیتا ہے تو بسا اوقات وہ یہ خیال قائم کر لیتا ہے کہ اس نے اپنے نفس کو مہذب اور اپنے اخلاق کو اچھا بنا لیا لہٰذا اب وہ مجاہدے سے مستغنی ہو گیا حالانکہ اس کا یہ خیال صحیح نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مومنوں اور منافقوں دونوں ہی کی صفات بیان کی ہیں، یہ صفات بالعموم یا تو خلقِ حسن کا ثمرہ ہیں یا سوءِ خلق کا ـــــ ان آیتوں کو سامنے رکھ کر ہر شخص کو اپنے اخلاق کا جائزہ لینا چاہیے امام غزالی نے سورہ المومنون کی ابتدائی آیتوں، سورہ الانفال رکوع ۱ کی آیت ۲ اور ۳ - سورہ توبہ ع ۱۴ کی آیت التائبون العابدون الحامدون کے حوالے دے کر لکھا ہے کہ جس شخص پر اپنی حالت مشتبہ ہو گئی ہو اسے اپنے نفس کو ان آیات پر پیش کرنا چاہیے اگر وہ تمام صفات اس میں پائی جاتی ہوں تو یہ حسنِ خلق کی علامت ہے اور اگر تمام صفات مفقود ہوں تو موجود پر اللہ کا شکر ادا کرے اور مفقود کو حاصل کرنے کے لیے مجاہدہ کرے، اس کے بعد انھوں نے چند حدیثیں نقل کی ہیں جن میں حضورؐ نے مومنوں کی صفات بیان کی ہیں مثلاً یہ کہ مومن وہ ہے جو اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند کرتا ہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے یا یہ کہ جو شخص اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہے وہ یا تو اچھی باتیں بولے یا خاموش رہے -

حسنِ خلق کے کچھ واقعات

واقعات کا انسانی قلب پر بہت اثر پڑتا ہے اس لیے یہاں حسنِ خلق کے چند واقعات پیش کیے جا رہے ہیں - پہلے حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کا ایک قول شیخ الاسلام کی تشریح کے ساتھ پیش کرتا ہوں اس سے اندازہ ہو گا کہ صوفیۂ کرام کے نزدیک حسنِ خلق کی اہمیت کیا ہے -

"فضیل بن عیاض نے کہا اگر میرے ساتھ کوئی خوش اخلاق گنہگار

ہو تو مجھے اس کی صحبت اس عابد سے زیادہ پسند ہے جو بد اخلاق ہو" شیخ الاسلام لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عاصی کو اگر اطاعت کا حکم دیا جائے اور معصیت پر زجر و توبیخ کی جائے تو وہ اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے اس کو برداشت کرے گا اور اگر بات اس کی سمجھ میں آجائے تو حق کی طرف رجوع کرے گا اور بداخلاق عابد کا حصہ کثرتِ ذکر اور کثرتِ صوم وصلوٰۃ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اپنی بداخلاقی کی وجہ سے کسی کی نصیحت برداشت نہیں کرسکتا وہ اپنی ظاہری عبادت میں مگن ہوتا ہے اگر اسے نصیحت کی جائے تو کچھ اور نہ ہو جب بھی کم سے کم نصیحت کرنے والے کا عناد اس کے دل میں ضرور پیدا ہو جائے گا، اس سے اس کی توقع کم ہے کہ وہ نصیحت قبول کرے اور حق کی طرف پلٹ آئے" (۱)

آج بھی ایسے عابدوں کی کمی نہیں ہے جو حسد، کبر، عجبِ نفس، تند خوئی اور کج خلقی کی شدید بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ حقیقی عابد وہ لوگ ہیں جن کے کچھ واقعات ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

(۱) ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ شہر کے قریب بعض جنگلوں میں گئے، وہاں ان کی ملاقات ایک "فوجی" سے ہوئی۔ اس نے ان سے پوچھا کہ آبادی کدھر ہے، انھوں نے قبرستان کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے سمجھا کہ اس کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے اور پھر اس نے ان کو اتنا مارا کہ ان کا سر کھل گیا۔ وہ آگے بڑھا تو اسے کچھ لوگ ملے اور انھوں نے کہا ابھی تم جسے مار رہے تھے

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ باب الخلق

وہ خراسان کے زاہد، ابراہیم بن ادہم ہیں، یہ سن کر وہ اُن کے پاس واپس آیا اور معذرت کرنے لگا، انھوں نے کہا جب تم نے مجھے مارا تھا تو اسی وقت میں نے تمھارے لیے جنت کی دعا کی تھی، اس نے پوچھا یہ کیوں؟ جواب دیا کہ مجھے یقین تھا کہ اس زدوکوب پر اللہ مجھے اجر دے گا تو میں نے پسند نہیں کیا کہ تمھاری وجہ سے تو مجھے خیر ملے اور میری وجہ سے تمھیں کوئی شر پہنچ جائے۔ (۱)

(۲) ابو عثمان حیری رحمہ اللہ کی ایک شخص نے دعوت کی اور انھیں اپنے ساتھ لے چلا۔ جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو کہا کہ مجھے ندامت ہے کہ میں نے آپ کو دعوت دی، آپ واپس جائیں۔ ابو عثمان واپس ہوئے، جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچے تو پیچھے سے وہ شخص پھر آیا اور کہا مجھے بڑی ندامت ہے کہ میں نے آپ کو واپس کر دیا آپ ابھی فوراً میرے ساتھ چلیں وہ پھر اس کے ساتھ چلے۔ جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو اس نے پھر وہی بات کہی، وہ پھر واپس ہوئے، تین چار بار اس نے یہی کیا آخری بار اس نے کہا کہ میں آپ کو آزما رہا تھا واقعی آپ حُسنِ خلق سے آراستہ ہیں، انھوں نے کہا میری تعریف نہ کرو، یہ بات جو تم نے مجھ میں دیکھی وہ تو کتّوں میں بھی پائی جاتی ہے جب انھیں کھانے پر بلاؤ تو آجاتے ہیں اور جب بھگاؤ تو بھاگ جاتے ہیں (۲)

یہ واقعہ تواضع اور بے نفسی کی ایک اونچی مثال ہے۔

(۳) عبداللہ خیاط رحمہ اللہ کا ایک گاہک مجوسی تھا وہ ان کی دوکان پر کپڑے

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ باب الخُلق (۲) ایضاً

سلواتا اور اجرت میں کھوٹے سکے دیتا، وہ اسے لے لیا کرتے، ایک دفعہ ایسا ہوا کہ وہ اپنی دوکان سے کہیں گئے اور اسی اثنا میں وہ مجوسی آیا اُس نے اپنے کپڑے لیے اور کھوٹے سکے دیئے۔ عبداللہؒ کے شاگرد نے سکے واپس کیے تو پھر اس نے کھرے سکے حوالے کیے۔ جب عبداللہؒ آئے اور شاگرد سے پوچھا کہ اس مجوسی کا کرتہ کہاں ہے؟ اس نے واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا تم نے بُرا کیا۔ ایک عرصے سے میں کھوٹے سکے لے کر صبر کر رہا تھا، میں وہ سکے لیتا اور ایک کنویں میں ڈال دیتا کہ کہیں پھر کسی کو ان سے دھوکا نہ دیا جائے (۱)

(۴) احنف بن قیس کو راستے میں ایک شخص گالیاں دینے لگا۔ وہ خاموشی سے سُنتے رہے، جب وہ اپنے محلے کے قریب پہنچے تو کھڑے ہو گئے اور اس شخص سے مخاطب ہو کر کہا اگر کوئی گالی اور باقی ہو تو وہ بھی دے لو، مجھے اندیشہ ہے کہ میرے محلے کا کوئی نادان میرے نام گالی سُن کر تمھیں تکلیف نہ پہنچائے (۲)

(۵) مالک بن دینار کو مخاطب کر کے ایک عورت نے کہا "اے ریاکار" انھوں نے جواب میں کہا، تجھے میرا وہ نام معلوم ہو گیا جسے اہلِ بصرہ بھول گئے تھے (۳)

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ باب الخلق (۲) احیاء علوم ج ۳ ص ۴۶ (۳) ایضاً

خوف

"خوف" کے لغوی معنی یہ ہیں کہ انسان کے دل میں کسی ناپسندیدہ اور تکلیف دہ چیز کے واقع ہونے کا خطرہ اور اندیشہ پیدا ہو، اللہ سے خوف کے معنی یہ ہیں کہ بندہ اس کے عذاب سے ڈرے خواہ وہ عذاب دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کے عذاب سے ڈریں بلکہ قرآن میں اللہ سے خوف کو ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے:

وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ — اور مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

رسالہ قشیریہ میں اس آیت کا صرف اتنا ہی ٹکڑا نقل کیا گیا ہے، پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے:

"یہ شیطان ہے جو تمھیں اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو" (آل عمران ع ۱۰ آیت ۱۷۵)

سورہ البقرہ رکوع ۱۸ میں کہا گیا ہے:

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي — تو تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔

ایک جگہ ٹھیک وہی بات کہی گئی ہے جو سورہ آل عمران آیت ۱۷۵ میں ہے:

أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (التوبہ ع ۲ آیت ۱۳) — کیا تم ان سے ڈرتے ہو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

ان آیتوں میں صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کو ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیا گیا ہے

کیونکہ اس کے بغیر توحید کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ جو صرف اللہ سے ڈرتا ہے وہ کسی اور سے نہیں ڈرتا اور جو غیر اللہ سے ڈرتا ہے وہ یا تو شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے یا اللہ کی نافرمانی میں۔

اللہ تعالیٰ سے خوف کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

فَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ ○ — پس مجھی سے ڈرو۔

(النحل ع ۷، آیت ۵۱)

خوف کے معنی میں ایک اور لفظ وجل قرآن میں استعمال کیا گیا ہے۔ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو جواب دیا تھا:

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ — فرشتوں نے کہا ڈرو نہیں

ایک جگہ سچے مومنوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الانفال ع ۱) — سچے اہلِ ایمان تو وہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا حال یہ ہے کہ فرشتے جو اس کی حضوری میں رہتے اور جو پیدائشی طور پر معصوم ہیں وہ بھی اس کے خوف سے لرزہ براندام رہتے ہیں — انسانوں میں بھی جنھیں سب سے زیادہ اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور جو سب سے زیادہ اس کی بارگاہ میں مقرب ہوتے ہیں، انھیں پر سب سے زیادہ اس کا خوف اور خشیت طاری رہتی ہے۔ ان کی زندگی خشیت و انابت کی زندگی ہوتی ہے۔

اللہ سے خوف کا مفہوم

ایک خوف تو وہ ہوتا ہے جو کسی تکلیف دہ اور ڈراؤنی چیز سے طبعی طور پر انسانوں میں پایا جاتا ہے جیسے انسان کا زہریلے سانپ سے ڈرنا یا خونخوار شیر سے ڈرنا — اللہ سے خوف کا یہ مطلب نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا، سانپ یا شیر سے ڈر کر انسان ان سے بھاگتا ہے

لیکن اللہ سے ڈر کر مومن اس سے بھاگتا نہیں بلکہ اُسی کی طرف پلٹتا اور اُسی کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ اللہ سے خوف کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس کی نافرمانی ترک کر دے اور اطاعت اختیار کرے۔ اللہ کے خوف اور اس کی خشیت سے انسان پر جو کیفیات طاری ہوتی ہیں ان کی صحت و صداقت کو جانچنے کا معیار بھی اللہ کی اطاعت ہی ہے۔ امام راغب نے "مفردات" میں لکھا ہے:

"اللہ سے خوف" کی مُراد یہ نہیں ہے کہ دل میں اس طرح کی دہشت اور رعب پیدا ہو جس طرح شیر کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی معصیت ترک اور اس کی اطاعت اختیار کی جائے اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ شخص اللہ سے خائف شمار نہیں کیا جاتا جو گناہوں کا تارک نہ ہو"

ٹھیک یہی بات صوفیۂ کرام نے بھی کہی ہے:

"حقیقی خائف وہ ہے جو اُن چیزوں کو ترک کر دیتا ہے جن پر اسے عذاب کا خوف ہو"(۱)

ابوالحسن احمد النوریؒ فرماتے ہیں:

"خائف وہ ہے جو اللہ کی معصیت سے اُس کی اطاعت اور اُس کی نارضامندی سے اس کی رضا کی طرف بھاگتا ہے" (۲)

ابو عثمان الحیریؒ نے کہا ہے:

"سچا خوف یہ ہے کہ انسان ظاہری و باطنی تمام گناہوں سے پرہیز کرے" (۳)

خوف اور خشیت کی کیفیات

جن لوگوں کے دلوں پر اللہ عزوجل کی عظمت و جلال اور اس کی بے نیازی کا

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۹۳ (۲) ایضاً ص ۱۹۵ (۳) ایضاً ص ۱۹۶

احساس چھا جاتا ہے، جن کے دماغوں میں قیامت کی ہولناکیاں اور عذابِ جہنم کی رُوح فرسائیاں حاضر رہتی ہیں اور جنھیں اپنی بندگی و غلامی، اپنے نقص و تقصیر اور اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کا شدید احساس ہوتا ہے ان پر خدا کا خوف اور اس کی خشیت مستولی رہتی ہے۔ کبھی ان کے دل لرز جاتے ہیں، کبھی ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کبھی وہ رونے لگتے ہیں، کبھی چیخ اُٹھتے ہیں اور کبھی بیمار پڑ جاتے ہیں، خشیت کے اثر سے بے ہوش ہو جانے اور وفات پا جانے کے واقعات بھی ہوتے ہیں۔ دل لرز جانے، رونگٹے کھڑے ہو جانے اور گریہ وزاری کی کیفیات کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔ ہم ذیل میں ان آیتوں کے ترجمے نقل کرتے ہیں:

(۱) "یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا اور اُن لوگوں کی نسل سے جنھیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور ابراہیمؑ کی نسل سے اور اسرائیلؑ کی نسل سے اور یہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا، اُن کا حال یہ تھا کہ جب رحمٰن کی آیات ان کو سُنائی جاتیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے" (مریم ع ۴)

سورۂ مریم کی اس آیت (۵۸) میں اتنی تفصیل سے انبیاء کرام کا ذکر کیا گیا ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام انبیاء اس میں داخل ہو گئے ہیں اور اُن میں کا کوئی فرد اس سے باہر نہیں رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا کلام سُن کر رونا تمام انبیاء کا "حال" رہا ہے اور گریہ وزاری کی کیفیت سب پر طاری ہوئی ہے۔

(۲) اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے (قرآن کو) سُن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے" (بنی اسرائیل ع ۱۲)

اس آیت میں ان سچے علمائے اہلِ کتاب کا حال بیان کیا گیا ہے جو قرآن پر بھی

ایمان لائے۔

(۳) "جب وہ اس کلام کو سُنتے ہیں جو رسولؐ پر اُترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسو بہانے لگتی ہیں"

(المائدہ ع ۱۱)

اس آیت میں بھی اُن علمائے اہلِ کتاب کا حال بیان کیا گیا ہے جو قرآن پر ایمان لائے، اس آیت کے بعد ان کے ایمان لانے کا ذکر صراحۃً قرآن میں ہے۔

(۴) "کیا اس کلام (قرآن) پر تمھیں تعجب ہے۔ اور تم ہنستے ہو، روتے نہیں ہو" (النجم ع ۳)

قرآن جس صاحبِ عظمت و جلال کا کلام اور جس مقتدرِ اعلیٰ کے احکام و فرامین کا مجموعہ ہے اس کا حق یہ ہے کہ اس کو سُن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں، یہی وجہ ہے کہ ان آیتوں میں کفار و مشرکین کو یہ ملامت کی گئی ہے کہ تم قرآن کی ہنسی اڑاتے ہو حالانکہ اسے سُن کر تمھیں رونا چاہیے تھا ——— ان تمام آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف و خشیت کے زیرِ اثر گریہ و زاری کی کیفیت اللہ کو بہت پسند ہے بالخصوص اللہ کا کلام سُن کر یا تلاوت کر کے آنسو بہانا ایک ایسی کیفیت اور ایک ایسا "حال" ہے کہ موجود نہ ہو تو اسے پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

"حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کی تلاوت کرو اور آنسو بہاؤ اور اگر گریہ نہ آئے تو رونے کی کوشش کرو" (۱)

---

(۱) تفسیر مظہری بحوالہ ابن ماجہ و اسحاق بن راہویہ و البزار ج ۴ ص ۱۰۴

(۵) وہ واپس ہوئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس غم میں کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے۔

(التوبہ ع ۱۲)

اس آیت میں اُن صحابۂ کرامؓ کا حال بیان کیا گیا ہے جو غزوۂ تبوک میں اس لیے شریک نہ ہو سکے تھے کہ اُن کے پاس اتنا مال نہ تھا کہ جہاد کا سامان کر سکتے وہ حضورؐ کے پاس آئے کہ بیت المال سے انتظام کر دیا جائے لیکن بیت المال بھی خالی تھا۔ حضورؐ کے ساتھ غزوے میں شریک نہ ہونے سے حسرت و افسوس اور رنج و غم کی جو کیفیت اُن کے دلوں میں پیدا ہوئی وہ آنسو بن کر ان کی آنکھوں سے بہہ نکلی اور وہ آنسو اللہ کو اتنے پسند آئے کہ اس نے قرآن میں اس کا ذکر کیا۔ اب ان آنسوؤں کی قیمت کون لگا سکتا ہے۔

(۶) "پس چاہیے کہ وہ لوگ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ" (التوبہ ع ۱۱)

اگرچہ اس کے مخاطب منافقین ہیں لیکن آیت میں یہ سبق تمام انسانوں کے لیے ہے کہ انھیں اللہ کی معصیتوں اور نافرمانیوں پر بہت رونا چاہیے۔

دل لرز جاتے ہیں

(۱) "سچے اہلِ ایمان تو وہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سُن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں" (الانفال ع ۲)

(۲) "اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"

(المومنون ع ۴ آیت ۶)

اس آیت کے بارے میں حضرت عائشہؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ اس میں ان لوگوں کا

حال بیان کیا گیا ہے جو چوری اور زنا کرتے اور شراب پیتے ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں بلکہ اس میں ان لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو نماز پڑھتے روزہ رکھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں (۱)

یہ حدیث ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور بیہقی میں بھی ہے۔ ان میں اتنا اضافہ اور ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: یہ لوگ خوف زدہ رہتے ہیں کہ کہیں ان کے یہ اعمال خدا کی بارگاہ میں نامقبول نہ ہو جائیں۔

(۳) اور بشارت دے دو، عاجزوں کو جن کا حال یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جو مصیبت ان پر آتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے اور جو رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (الحج ع ۵)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ذکر پر دلوں کا لرز جانا یا کانپ اٹھنا ایک محبوب و مطلوب کیفیت ہے لیکن انھیں آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر یہ کیفیت حقیقی ہو تو اس کے ساتھ بے عملی جمع نہیں ہو سکتی، خشیتِ الٰہی سے لرزنے والے اور کانپنے والے لوگ وہی ہوتے ہیں جو اللہ کی اطاعت میں سرگرم ہوں، اطاعت کے ساتھ یہ کیفیت اللہ کی عظمت و بے نیازی اور اپنی عاجزی کوتاہی کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔

رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں

"اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزا ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دُہرائے گئے ہیں۔ اسے سُن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۹۶

اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں" (الزمر ع ۲ آیت ۲۳)

امام بغوی نے تفسیر معالم التنزیل اپنی سند کے ساتھ حضرت عُروہ بن زبیرؓ کی یہ روایت درج کی ہے۔

"عروہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی دادی حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے دریافت کیا کہ جب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تھا تو ان کا کیا حال ہوتا تھا انھوں نے جواب دیا کہ ان کا وہی حال ہوتا تھا جس کا بیان قرآن میں ہے، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے"۔

سورۂ زمر کی اس آیت سے حقیقی خشیت اور بناوٹی خشیت کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے جب قرآن سنتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اس کے بعد ان کے جسم اور دل اللہ کے ذکر کی طرف جھک جاتے ہیں۔ یہی دوسری بات حقیقی اور مصنوعی خشیت میں فرق کرنے والی ہے۔ اگر رونگٹے کھڑے ہونے کے بعد بھی ذکرِ الٰہی کی رغبت میں اضافہ نہ ہو تو یہ مصنوعی خشیت ہوگی، یہ خشیت تو دوسروں کے سامنے اس کا اظہار ہے اور کچھ نہیں۔

خشیّتِ الٰہی کا اعلیٰ ترین اُسوہ

احادیث و سیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے جو حالات ملتے ہیں وہ خشیتِ الٰہی اور انابت الی اللہ کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہیں۔ .... اللہ تعالیٰ کے جلال و استغناء کا احساس حضورؐ کے قلبِ مطہر پر اس قدر مستولی تھا کہ

بعض اوقات دوسرے تمام احساسات اس کے نیچے دب جاتے تھے، صحیح ترین حدیثوں میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان منقول ہے کہ جب تیز ہوا چلتی تھی تو حضورؐ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا اور جب آسمان پر ابر کے ٹکڑے نمودار ہوتے تو آپؐ پر اضطراب اور بے چینی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ آپؐ کبھی حجرۂ مبارک سے باہر جاتے، کبھی اندر آتے، کبھی آگے بڑھتے، کبھی پیچھے ہٹتے اور اس وقت تک یہ کیفیت طاری رہتی جب تک بارش نہ آجاتی پھر یہ کیفیت دور ہو جاتی، انھوں نے دریافت کیا تو فرمایا:

"اے عائشہ، مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ ابر ویسا نہ ہو جیسا قوم عاد پر آیا تھا، قرآن میں ہے کہ جب انھوں نے اپنی وادیوں کی طرف ابر آتے دیکھا تو کہا یہ بادل ہم پر پانی برسائے گا۔"

یہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی بے نیازی کا بے نظیر احساس اور بے مثال استحضار ہے، اس احساس کا اگر ایک ذرہ بھی نصیب ہو جائے تو ہماری زندگیاں سنور جائیں۔

حضرت عائشہ رضؓ ہی کا بیان ہے کہ میں نے حضورؐ کو کبھی منھ کھول کر قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا۔ اکثر و بیشتر آپؐ صرف تبسم فرماتے تھے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، بے مزہ، ہنسی خوشی سے خالی اور بشاشت و ظرافت سے عاری تھی، ایسا نہیں تھا کیونکہ آپؐ اعتدال و توازن کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے، لیکن آپؐ کے اوصاف بیان کرنے والوں نے کہا ہے: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم متواصل الاحزان، دائم الفکرۃ۔ یعنی آپؐ پر فریضۂ رسالت کی انجام دہی اور آخرت کی فکر چھائی رہتی تھی۔ آپؐ کی ہنسی خوشی اور بشاشت و ظرافت میں غافلوں کی طرح بے اعتدالی نہ تھی۔

آپؐ قرآن سنتے تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ نمازوں میں کبھی کبھی آپؐ پر شدید گریہ طاری ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک بار مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ، میں نے کہا یا رسول اللہ، میں آپ کو قرآن سناؤں؟ قرآن تو آپ ہی پر اترا ہے، آپ نے فرمایا میں دوسروں سے بھی اسے سننا پسند کرتا ہوں، میں نے سورہ النساء پڑھنی شروع کی، میں جب اس آیت پر پہنچا، فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا تو آپ نے فرمایا اب بس کرو۔ میں نے حضورؐ کی طرف پلٹ کر دیکھا تو آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے (۱)

(۲) حضرت عبداللہ بن شخیر رضؓ کہتے ہیں کہ ایک بار میں اس حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آپؐ نماز پڑھ رہے تھے اور شدت گریہ کی وجہ سے آپؐ کے سینے سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے ہانڈی پک رہی ہو (۲)

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے مکہ میں دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گرے ہوئے رو رہے ہیں اور زبانِ مبارک سے یا اللہ، یا رحمٰن کی پکار جاری ہے (امام البغوی)

حضورؐ صحابہ کرامؓ کی تعلیم و تربیت میں بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ان کی ہنسی مذاق میں غفلت اور بے اعتدالی پیدا نہ ہو وہ خدا سے ڈرتے رہیں اور خشیت و انابت کا جذبہ ان پر طاری رہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہؓ کے بارے میں کوئی بات پہنچی تو آپ نے ان کے سامنے خطبہ دیا اور فرمایا اگر

---

(۱) ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم (۲) ایضاً بحوالہ ابو داؤد و ترمذی

تم وہ کچھ جانتے جو میں جانتا ہوں تو ہنستے کم اور روتے زیادہ، حضرت انس رض کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ صحابہ رض نے اپنے منہ اور سر ڈھانک لیے اور اتنا روئے کہ ان کی گھگھیاں بندھ گئیں (۱)

حضرت عامر جہنی رضی اللہ عنہ نے ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، یارسول اللہ نجات کی کیا صورت ہے؟ جواب ملا کہ:

اپنی زبان پر قابو رکھو، قناعت اختیار کرو اور اپنی خطاؤں پر آنسو بہاؤ (۲)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میں کس طرح عیش و تنعم کی زندگی بسر کروں جبکہ فرشتہ صور منہ میں لیے اور کان لگائے کھڑا ہے کہ نہ معلوم کب اسے صور پھونکنے کا حکم مل جائے (۳)

حضرت ابی رض بن کعب سے روایت ہے کہ جب رات کی دو تہائی گزر جاتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے اور فرماتے اے لوگو، اللہ کو یاد کرو، اللہ کو یاد کرو، وہ جھنجوڑنے والی آوازِ صور آپہنچی، اس کے پیچھے دوسری آوازِ صور لگی ہوئی ہے۔ موت آگئی، اپنے خطروں اور پریشانیوں کے ساتھ موت آگئی (۴)

معذب قوموں کے مقامات سے گزرنا پڑتا تو حضور صحابۂ کرام رض سے فرماتے ان مقامات سے روتے ہوئے گزرو۔

خلفائے راشدین کی خشیت و انابت

امت مسلمہ کے سب سے بلند رتبہ افراد خلفائے راشدین ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اقامتِ دین کے سب سے بہتر قائد اور سربراہ تھے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان کی زندگیاں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا عکس تھیں، ان

---

(۱) بخاری و مسلم (۲) ترمذی (۳) ریاض الصالحین (۴) ترمذی ابواب صفۃ القیامۃ

پر بھی خشیتِ الٰہی اور انابت الی اللہ کی کیفیت مستولی تھی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ انتہائی رقیق القلب تھے، قرآن پڑھتے تو آنسو ضبط کرنا مشکل ہوتا، ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں اپنے گھر کے صحن میں ایک چھوٹی سی مسجد بنالی تھی۔ اس میں خشوع وخضوع کے ساتھ عبادات میں مشغول رہتے، قرآن تلاوت کرتے تو رونے لگتے اور ان کے گریہ وبکا کو سن کر لوگ جمع ہوجاتے اور اس کا ان پر بہت اثر پڑتا ــــــــ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں شدتِ مرض کی وجہ سے مسجد میں تشریف نہیں لے جاسکے تو آپؐ نے فرمایا، ابو بکرؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔ یہ سن کر حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کی یا رسولؐ اللہ وہ رقیق القلب انسان ہیں۔ آپؐ کی جگہ کھڑے ہوکر نماز پڑھائیں گے تو ان پر گریہ غالب آجائے گا اور وہ مقتدیوں کو قرأت اور تکبیرات بھی نہ سنا سکیں گے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کی رقتِ قلب عمر کے آخری دور تک باقی رہی، یہاں تک کہ لوگ انھیں بکاء (بہت رونے والے) کہتے تھے۔ ان کے سوانح میں کان رجلا بکاء (وہ بہت رونے والے شخص تھے) کے الفاظ ملتے ہیں۔

جب آپؐ خلیفہ ہوئے تو خلافت کی ذمہ داریوں نے خشیت وانابت میں کمی نہیں کی بلکہ اسے اور بڑھا دیا۔ اب ان کے افکار میں اس فکر کا بھی اضافہ ہوگیا کہ مکار دنیا کہیں انھیں اپنے جال میں نہ پھنسالے، ایک بار انھوں نے پینے کا پانی مانگا تو لوگ شہد ملاکر پانی لائے لیکن ابھی لبوں کے قریب پہنچا تھا کہ ان پر رقت طاری ہوگئی اور اس طرح اور اس قدر روئے کہ جو لوگ وہاں موجود تھے سب رونے لگے۔ جب کچھ سکون ہوا تو لوگوں نے رونے کی وجہ پوچھی انھوں نے جواب دیا کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، آپؐ کسی چیز کو دور، دور کہہ کر ہٹا رہے تھے حالانکہ مجھے کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی، میں نے پوچھا تو آپؐ نے جواب دیا

کہ لوگوں کو بہکانے والی فریبی دنیا مجسّم ہو کر میرے سامنے آئی تھی میں اسی کو بھگا رہا تھا، مجھے یکایک وہ واقعہ یاد آگیا اور خوف پیدا ہوا کہ کہیں دُنیا مجھے اپنے جال میں نہ پھنسا لے ـــــ ان کا حال یہ تھا کہ کبھی کبھی رات رات بھر نمازیں پڑھتے اور اتنی رقت طاری ہوتی کہ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ قیامت کے حساب کتاب کا خوف اس قدر مستولی تھا کہ کبھی کبھی درخت کو دیکھتے تو کہتے، کاش میں کوئی درخت ہوتا تو آخرت کے حساب کتاب سے بچ جاتا، کبھی چڑیوں کو چہچہاتے دیکھتے تو سرد آہ کھینچ کر کہتے تمھیں مبارک ہو کہ دنیا میں چرتی چگتی ہو، درخت کے سائے میں بیٹھتی ہو اور قیامت میں تمھارا کوئی حساب کتاب نہیں، کاش ابوبکر بھی تمھاری طرح ہوتا۔ نرم دلی اور رقتِ قلب کے باعث بات بات پر آہِ سرد کھینچتے تھے یہاں تک کہ اَوّاہ، مُنیب ان کا لقب ہو گیا تھا، یہ وہ لقب ہے جو قرآنِ پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال ہوا ہے اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ۝ (ہود ۷) بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جن کے دبدبے اور رعب سے ایوانِ کسریٰ کے کنگرے لرزتے تھے، خود خشیتِ الٰہی سے اتنے لرزاں و ترساں رہتے کہ وعید اور عذاب کی آیتیں سُن کر بیمار پڑ جاتے، مفسر ابن کثیر نے بعض محدثین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک بار وہ رات کے گشت پر نکلے، ایک گھر سے قرآن پڑھنے کی آواز آ رہی تھی، پڑھنے والے سُورہ طور کی ابتدائی آیتیں پڑھ رہے تھے، حضرت عمرؓ سننے لگے، جب وہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ۝ مَا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ پر پہنچے تو حضرت عمرؓ پر اتنا اثر پڑا کہ بیٹھ گئے اور دیوار سے ٹیک لگالیا، تھوڑی دیر کے بعد واپس تشریف لے گئے اور علیل ہو گئے، بیس دنوں تک بیمار رہے، لوگ عیادت کے لیے آتے تھے لیکن کسی کو پتہ نہ تھا کہ امیر المومنین کی بیماری کیا ہے۔ اسی آیت کے بارے میں

حضرت حسن بن علیؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نماز میں جب وہ اس آیت پر پہنچے تو اتنا روئے کہ روتے روتے آنکھیں سوج گئیں ـــــ اسی طرح ایک دفعہ آیت اِذَا اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۵۱ (الفرقان ۱۳) پڑھی تو ایسی حالت ہوگئی کہ کوئی ناواقف دیکھتا تو سمجھتا کہ اب ان کی روح پرواز کر جائے گی ـــــ ایک دن صبح کی نماز میں سورہ یوسف شروع کی جب اس آیت پر پہنچے وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ۵ تو زار و قطار رونے لگے یہاں تک کہ تلاوت ختم کر کے رکوع پر مجبور ہو گئے۔ بخاری کتاب الصلوٰۃ میں حضرت عبداللہ بن شداد کی حدیث ہے کہ "میں پچھلی صف میں رہتا تھا لیکن حضرت عمر اِنَّمَا اَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ کی آیت پڑھ کر اس زور سے روتے تھے کہ میں ان کے رونے کی آواز سنتا تھا" ـــــ تہجد کی نماز تو وہ پڑھتے ہی تھے، کبھی کبھی رات بھر نماز پڑھتے اور جب صبح قریب ہوتی تو گھر والوں کو جگاتے اور یہ آیت پڑھتے وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ۔ اللہ کے جلال اور اس کی بے نیازی کا احساس اتنا مستولی تھا کہ اپنی خلافت کے کارناموں کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر میں اس کے بدلے میں عذاب سے بچ جاؤں تو یہی بہت ہے۔ ایک دفعہ راستے میں ایک تنکا اٹھا لیا اور کہا اے کاش میں بھی خس و خاشاک ہوتا، اے کاش میری ماں مجھے نہ جنتی۔ فرماتے تھے کہ اگر آسمان سے ندا آئے کہ ایک آدمی کے سوا سب جنتی ہیں جب بھی مواخذے کا خوف زائل نہ ہوگا کہ شاید وہ بدقسمت انسان میں ہی ہوں ـــــ ان کے چہرے پر آنسو بہتے بہتے دو سیاہ نشان پڑ گئے تھے (۱)

حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب وہ کسی قبر پر کھڑے

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴ ص ۱۱۵

ہوتے تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی اور ان کی داڑھی تر ہو جاتی۔ ان سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ آپ جنت و جہنم کے ذکر پر نہیں روتے اور قبر دیکھ کر روتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قبر، منازلِ آخرت کی پہلی منزل ہے اگر اس مرحلے میں کوئی عذاب قبر سے بچ گیا تو بعد کے مرحلے اس کے لیے آسان ہوں گے اور اگر نہ بچ سکا تو بعد کے مرحلے اس سے زیادہ سخت ہوں گے (۱) وہ عام حالات میں بھی اکثر خدا کے خوف سے آبدیدہ رہتے۔ موت، قبر اور عاقبت کا خیال ہمیشہ دامن گیر رہتا۔ تلاوتِ قرآن سے خاص شغف تھا۔ شہادت کے وقت بھی قرآن تلاوت فرما رہے تھے۔ رات کا اکثر حصہ عبادت وریاضت میں بسر کرتے ـــــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "دو اشخاص کی زندگی قابلِ رشک ہے، ایک وہ جس کو اللہ نے قرآن کا علم عطا کیا ہو اور وہ رات دن اس کا حق ادا کرنے میں لگا ہوا ہو اور دوسرا وہ جس کو اللہ نے مال عطا کیا ہو اور وہ رات دن اللہ کی راہ میں اس کو خرچ کر رہا ہو۔ حضرت عثمانؓ اس حدیث کے کامل مصداق تھے اور یہ دونوں قابلِ رشک زندگیاں ان کی ایک زندگی میں اکٹھا ہو گئی تھیں۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خشیتِ الٰہی اور خوف، صدیقؓ و فاروقؓ کی یاد دلاتی ہے۔ وہ بچپن میں ایمان لائے اور حضورؐ کے ساتھ اللہ کے آگے سر جھکایا تو زندگی کے آخری لمحے تک اس کے سامنے سجدہ ریز رہے۔ وہ میدانِ جنگ میں حیدرِ کرار تھے لیکن اللہ کے حضور زار و نزار تھے۔ حضرت معاویہؓ کے اصرار پر ضرار اسدی نے حضرت علیؓ کے جو حالات بیان کیے ہیں ان میں وہ کہتے ہیں:

"میں نے ان کو بعض معرکوں میں دیکھا کہ رات گزر چکی ہے، ستارے ڈوب چکے

---

(۱) ترمذی ابواب الزہد

ہیں اور وہ اپنی داڑھی پکڑے ہوئے اس طرح مضطرب ہیں جیسے ان کو بچھو نے ڈنک مار دیا ہے۔ روتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں، افسوس افسوس، میں نے تجھے تین طلاقیں دے دی ہیں اب رجعت نہیں ہو سکتی، تیری عمر کم اور تیرا مقصد حقیر ہے، آہ زادِ راہ کم اور سفر دُور دراز کا ہے اور رستہ وحشت خیز ہے" (خلفائے راشدین)

ان کے حالات میں یہ جملے بھی ملتے ہیں کان غزیر العبرۃ طویل الفکرۃ (وہ بہت روتے تھے اور ان کا تفکر طویل ہوتا تھا)

خشیتِ الٰہی کا یہی سرچشمہ تھا جس سے خلافتِ راشدہ کی ٹھنڈی اور میٹھی نہر جاری ہوئی تھی اور ایک ایسی حکمرانی وجہاں بانی وجود میں آئی تھی جس کی نظیر تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔ اگر ان حضرات پر خشیتِ الٰہی مستولی نہ ہوتی تو ان کی حکومتیں بھی عبدالملک، ولید اور منصور ومہدی سے مختلف نہ ہوتیں یہی وہ لوگ تھے جن پر پوری طرح یہ آیت صادق تھی:

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ٥

(الفاطر ۲۸)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں، بے شک اللہ بہت زبردست، بہت بخشنے والا ہے۔

چند مزید حدیثیں

(۱) "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دوزخ میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جو اللہ کی خشیت سے روتا رہا، اور راہِ خدا کا غبار اور جہنم کا دھواں یک جا نہیں ہو سکتے" (۱)

---

(۱) ترمذی

یہ اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ جن آنسوؤں کا اجر اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے وہ تصنع کے آنسو نہیں ہیں، بلکہ وہ سچے اور حقیقی آنسو ہیں جو خدا کے خوف اور اپنی تقصیر کے احساس سے بہتے ہیں اور جس شخص پر خدا کی خشیت اتنی طاری ہو وہ ان اعمال میں منہمک نہیں ہو سکتا جو جہنم میں لے جانے والے ہوتے ہیں۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی ایک حدیثِ مرفوع میں سات ایسے افراد کا ذکر ہے جو قیامت میں عرشِ الٰہی کے سائے تلے ہوں گے اور ان سات میں سے ایک وہ شخص ہے جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرتا ہے اور اُس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑتے ہیں (۱)

اس حدیث میں تنہائی کا ذکر گریہ و بکا کے خلوص کو ظاہر کرتا ہے، کیونکہ تنہائی میں تصنع اور دکھاوے کے آنسو نہیں بہتے۔

(۳) حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف روزہ دار تھے، افطار کے بعد جب اُن کے لیے کھانا لایا گیا تو انھوں نے کہا مصعبؓ بن عمیر شہید کیے گئے اور وہ مجھ سے بہتر تھے، جب وہ شہید ہوئے تو ایک چادر کے سوا اور کوئی چیز نہیں ملی جس سے انھیں کفنایا جاتا، چادر بھی اتنی چھوٹی تھی کہ سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں ڈھانکے جاتے تو سر کھل جاتا اور اب دُنیا سے ہمیں بہت کچھ حصہ مل گیا ہے، ہمیں اندیشہ ہوتا ہے کہ ہماری نیکیوں کا اجر ہمیں دُنیا ہی میں تو نہیں مل گیا، پھر وہ رونے لگے یہاں تک کہ کھانا بھی چھوڑ دیا (۲)

(۴) حضرت ابو اُمامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) بخاری و مسلم (۲) بخاری شریف

نے فرمایا: دو قطرے اور دو نشان اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں، اللہ کی خشیت سے نکلے ہوئے آنسو کے قطرے اور خون کے وہ قطرے جو اللہ کی راہ میں بہائے جاتے ہیں۔ رہے دو نشان تو ایک نشان وہ ہے جو اللہ کی راہ میں (کسی چوٹ یا ضرب سے) پڑ جاتا ہے اور دوسرا نشان وہ جو اللہ کے فرائض میں سے کسی فریضے کو ادا کرتے ہوئے جسم پر پڑ جاتا ہے (۱)

(۱) ترمذی

رجاء

عربی لغت میں رجاء کسی مرغوب و محبوب اور پسندیدہ چیز کی توقع اور امید کو کہتے ہیں، شرعی اصطلاح میں رجاء اللہ تعالیٰ کی رحمت و کرم اور اعمالِ خیر پر اجر و ثواب کی توقع اور امید کو کہتے ہیں۔ خوف سے انسان کے دل میں گھبراہٹ اور تکلیف پیدا ہوتی ہے اور رجاء سے فرحت و لذت ——— اور جس طرح اللہ کے عذاب کا حقیقی خوف وہ ہے جو انسان کو معصیتوں سے بچاتا اور طاعتوں میں مشغول رکھتا ہے اسی طرح اللہ کے کرم کی سچی امید وہ ہے جو معصیت سے بچ کر اور اطاعت میں مشغول رہ کر پیدا ہوتی ہے، اس کے بغیر اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کی امید، رجاء نہیں بلکہ تمنائے خام، دھوکا اور حماقت ہے۔ علماء اور صوفیہ نے حقیقی خوف و رجاء کو پرندے کے دو بازوؤں سے تشبیہ دی ہے، مومن انھیں دو بازوؤں سے ہر مطلوب و محمود مقام کی طرف پرواز کرتا، ہر دشوار گزار وادی کو طے کرتا اور تقربِ الٰہی کی منزلِ مقصود تک جا پہنچتا ہے۔ اگر کوئی ایک بازو بھی ٹوٹ جائے تو وہ اس پرندے کی طرح مفلوج ہو کر رہ جائے گا جس کا کوئی بازو ٹوٹ گیا ہو۔ مومن نہ خدا کے خوف سے بے نیاز ہوتا ہے اور نہ اس کی رحمت سے مایوس۔ ایک طرف وہ خدا کے خوف سے کانپتا ہے اور دوسری طرف اس کے فضل و کرم کا امیدوار رہتا ہے۔ قرآن میں برگزیدہ بندوں کی یہی حالت اور کیفیت بیان کی گئی ہے۔

(۱) وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (بنی اسرائیل ع ٦ آیت ۵۷)

اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔

متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات و واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

(۲) اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝ (الانبیاء ع ٦ آیت ۹۰)

یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

اس میں "رغبت" کا لفظ "رجاء" کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس آیت میں حقیقی خوف و رجاء کو واضح کر دیا گیا ہے۔ نیکی کے کاموں میں آگے بڑھ کر حصہ لینا، اس میں دوڑ دھوپ کرنا، خدا کے سامنے جھکا رہنا اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ سے ڈرنا اور اس کے کرم کی توقع رکھنا یہ ہے وہ مقام جس پر حقیقی خوف و رجاء کے الفاظ صادق آتے ہیں۔

(۳) تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (السجدہ ع ۲ آیت ۱٦)

ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس میں طمع کا لفظ رجاء کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں بھی خوف و رجاء کے ساتھ نمازِ تہجد اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔

(۴) اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَاۗىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (الزمر ع ۱ آیت ۹)

بھلا وہ شخص جو مطیع فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدہ کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی

رحمت سے امید لگاتا ہے۔

ان آیتوں سے واضح ہوا کہ اللہ کے برگزیدہ اور فرماں بردار بندے خوف و رجاء دونوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ان آیتوں کے علاوہ قرآن میں کہیں صالحین کے صرف خوف کا ذکر ہے اور کہیں صرف رجاء کا لیکن ہر جگہ مراد دونوں ہی ہیں اس لیے کہ فی الواقع خوف و رجاء دونوں لازم و ملزوم ہیں، جو خوف شرعًا مطلوب و محمود ہے اس کا وجود رجاء کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح جو رجاء مطلوب و محمود ہے اس کے ساتھ خوف بھی لگا ہوا ہے۔ اسی مفہوم میں خوف و رجاء مقاماتِ تصوف کے دو مقام قرار دیئے گئے ہیں۔

قرآن میں اللہ کی رحمت سے مایوسی کو کفر قرار دیا گیا ہے اور ساتھ ہی تمنائے خام کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ سورہ الاعراف میں اہلِ کتاب کا حال بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جو کتابِ الٰہی کے وارث ہو کر اسی دُنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ توقع ہے، ہمیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی متاعِ دنیا پھر سامنے آتی ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں"

(الاعراف ع ۲۱)

یعنی اللہ کی نافرمانی کیے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ اللہ ہمیں بخش دے گا، یہی وہ تمنائے خام ہے جو رجاء مطلوب و محمود کی ضد ہے۔ اس کی توضیح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی ہے:

الاحمق من اتبع نفسہ ھواھا وتمنا علی اللہ (ترمذی)	احمق وہ ہے جو اپنی خواہشِ نفس کے پیچھے چلے اور اللہ پر تمنا کرے۔

ڈھٹائی کے ساتھ گناہ کرتے ہوئے یہ امید کہ اللہ بخش دے گا اسی کو "تمنی علی اللہ" کہا گیا ہے یہی بات اپنے وقت کے ایک بڑے صوفی نے دہرائی ہے:

ایک شخص وہ ہے جو نیکی کرتا ہے اور اس کی قبولیت میں امیدوار رہتا ہے، دوسرا شخص وہ ہے جس نے کوئی برائی کی اس کے بعد اس نے توبہ کی اور وہ مغفرت کی امید رکھتا ہے۔ تیسرا وہ جھوٹا شخص ہے جو گناہ کیے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ بے مغفرت کی امید ہے (۱)

شاہ کرمانی نے رجاء محمود کی علامت یہ بیان کی ہے:

"رجاء کی علامت حسن طاعت ہے" شیخ الاسلام نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ دنیوی اعمال میں یہ بات سب کو معلوم ہے کہ جو شخص اچھی زمین میں دانے بکھیرتا اور زمین کو سیراب کرتا ہے، فصل حاصل کرنے میں اس کی توقع اور امید قوی ہوتی ہے، اس کے برعکس اس شخص کا حال ہے جو موسم گرما میں بنجر زمین کے اندر اپنے بیج ڈالے اور یہ کہے کہ اللہ غلہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اگرچہ اس کی یہ بات صحیح ہے لیکن قابل اتباع نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں اپنے قاعدے ضابطے جاری اور نافذ کیے ہیں (۲)

شاہ کرمانی نے اسی رجاء کی علامت حسن طاعت بیان کی ہے جو مقامات تصوف ایک مقام ہے۔

رجاء کے کچھ اور معانی

علماء اور صوفیہ نے اللہ تعالیٰ کی بے کراں رحمت اور وسیع مغفرت کی نسبت سے بھی رجاء کا ذکر کیا ہے

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۳۰۴ (۲) ایضا

اس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کسی کافر و مشرک کو بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ کفر و شرک سے باز آ کر اور اسلام قبول کر کے اللہ کی رحمت کا مستحق بن سکتا ہے اسی طرح کسی بڑے سے بڑے گنہگار مسلمان کے لیے بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ کفر و شرک کے سوا ہر گناہ (جس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو) اللہ کی مشیت کے تحت ہے وہ چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو سزا دے۔ نیز یہ کہ کسی زندہ انسان کی ہدایت اور پھر اس کی مغفرت سے مایوس ہونا صحیح نہیں، نزع سے پہلے ہر شخص تائب ہو سکتا اور اس کی مغفرت ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی رحمت کی امید کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بندۂ مومن اپنے اعمال پر اعتماد نہیں کرتا بلکہ صرف اللہ کی رحمت پر بھروسہ کرتا ہے خواہ اس کا تعلق اس کی نجات و مغفرت سے ہو یا درجات کی بلندی سے کیونکہ اس کی رحمت کے بغیر نہ دوزخ سے نجات مل سکتی، نہ جنت حاصل ہو سکتی اور نہ کوئی بلند درجہ مل سکتا ہے۔

فقر

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فقر کا لفظ دو معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ایک مفلسی و تنگ دستی کے معنی میں جو اس کا لغوی معنی ہے اور دوسرے اس معنی میں کہ ہر انسان اپنی ذات کے لحاظ سے محتاج ہے۔ احتیاج ہر انسان کی ذاتی صفت ہے خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ اپنی ذات کے لحاظ سے غنی صرف وہ ہے جس نے یہ کائنات پیدا کی ہے غناء، استغناء، بے نیازی صرف اللہ رب العالمین کی ذاتی صفت ہے۔ اس کی ہر مخلوق اس کی محتاج ہے وہ کسی کا محتاج نہیں۔ ہر مخلوق اس کی نیاز مند ہے وہ کسی کا نیاز مند نہیں وہ سب سے بے نیاز ہے۔ پہلے معنی میں فقر کا لفظ بطور اسم مصدر پورے قرآن میں صرف ایک جگہ آیا ہے البتہ فقراور فقراء کے الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں۔

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ (البقرہ : ۲۶۸)	شیطان تمھیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ

مگر اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی اُس کو بڑی دولت مل گئی۔ ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں

جو دانش مند ہیں۔" (البقرہ رکوع ۳۷)

اس کی تشریح میں ایک مفسر لکھتے ہیں:

حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور قوتِ فیصلہ ہے۔ یہاں اس ارشاد سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جس شخص کے پاس حکمت کی دولت ہوگی وہ ہرگز شیطان کی بتائی ہوئی راہ پر نہ جائے گا بلکہ اس راہِ کشادہ کو اختیار کرے گا جو اللہ نے دکھائی ہے۔ شیطان کے تنگ نظر مریدوں کی نگاہ میں یہ بڑی ہوشیاری اور عقل مندی ہے کہ آدمی اپنی دولت کو سنبھال سنبھال کر رکھے اور ہر وقت مزید کمائی کی فکر میں لگا رہے لیکن جن لوگوں نے اللہ سے بصیرت کا نور پایا ہے ان کی نظر میں یہ عین بے وقوفی ہے۔ حکمت و دانائی ان کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے اسے اپنی متوسط ضروریات پوری کرنے کے بعد دل کھول کر بھلائی کے کاموں میں خرچ کرے۔ پہلا شخص ممکن ہے کہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں دوسرے کی بہ نسبت بہت زیادہ خوش حال ہو لیکن انسان کے لیے یہ دنیا کی زندگی پوری زندگی نہیں بلکہ اصل زندگی کا ایک نہایت چھوٹا سا جز ہے۔ اس چھوٹے سے جز کی خوش حالی کے لیے جو شخص بڑی اور بے پایاں زندگی کی بدحالی مول لیتا ہے۔ وہ حقیقت میں سخت بے وقوف ہے۔ عقل مند در اصل وہی ہے جس نے اس مختصر زندگی کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر تھوڑے سرمایہ ہی سے اس ہمیشگی کی زندگی میں اپنی خوش حالی کا بندوبست کر لیا۔

(تفہیم القرآن ج ۱)

مفلسی و تنگ دستی کے معنی میں فقیر اور فقراء کے الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں ان میں سب سے مشہور مقام مصارفِ زکوٰۃ کی آیت ہے:

(۱) اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ (توبہ: ع ۸) — زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں اور محتاجوں کا۔

زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں فقراء و مساکین دو مصرف ہیں۔ فقیر اور مسکین کی تعیین میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ بعضوں نے فقیر اس شخص کو کہا ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ بالکل مفلس ہو اور مسکین اس شخص کو کہا ہے جس کے پاس کچھ مال تو ہو لیکن اس کی ضرورت سے کم مال ہو اور بعض مفسرین نے ان دونوں کی تعیین اس کے بالکل برعکس کی ہے۔ یعنی فقیر اس شخص کو قرار دیا ہے جس کے پاس اس کی ضرورت سے کم مال ہو اور مسکین اس شخص کو کہا ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ بالکل مفلس ہو۔ بہرحال اس آیت میں فقراء کا لفظ فقر کے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۲) اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ — اگر ظاہر کر کے دو خیرات تو کیا اچھی بات ہے اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ بہتر ہے تمہارے حق میں۔

(البقرہ ع ۳۷)

اس آیت میں بھی فقراء کا لفظ مفلس و تنگ دست کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۳) فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ (الحج آیت ۲۸) — اس میں سے خود بھی کھاؤ اور تنگ دست محتاج کو بھی کھلاؤ۔

(۴) یتیم کا جو سرپرست مال دار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقے سے کھائے۔ (النساء آیت ۶)

اس آیت میں بھی فقیر کا لفظ غریب محتاج کے معنی میں آیا ہے۔

لفظ فقر دوسرے معنی میں — فقر کا لفظ اس معنی میں کہ تمام انسان اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں اور غنی صرف وہ ہے۔ سورہ فاطر میں آیا ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ	اے لوگو! تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی غنی و حمید ہے۔

(الفاطر آیت ۱۵)

یہاں فقراء کا لفظ غریب اور مفلس کے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے کہ انسان اپنی اصل کے لحاظ سے اللہ کا محتاج ہے خواہ وہ امیر کبیر ہی کیوں نہ ہو۔ نیز یہ کہ انسان کی احتیاج صرف مال اور رزق ہی کے لحاظ سے نہیں ہے، بلکہ ہر لحاظ سے ہے۔ وہ اپنی زندگی و موت اور ہر چیز میں اللہ کا محتاج ہے۔ ایک مفسر اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"غنی" سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے، ہر ایک سے مستغنی اور بے نیاز ہے، کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے اور "حمید" سے مراد یہ ہے کہ وہ آپ سے آپ محمود ہے کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے مگر حمد (شکر اور تعریف) کا استحقاق اسی کو پہنچتا ہے۔ ان دونوں صفات کو ایک ساتھ اس لیے لایا گیا ہے کہ محض غنی تو وہ بھی ہو سکتا ہے جو اپنی دولت مندی سے کسی کو نفع نہ پہنچائے۔ اس صورت میں وہ غنی تو ہو گا مگر حمید نہ ہو گا۔ حمید وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ کسی سے وہ خود تو کوئی فائدہ نہ اٹھائے مگر اپنی دولت کے خزانوں سے دوسروں کو ہر طرح کی نعمتیں عطا کرے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ان دونوں صفات میں کامل ہے اس لیے فرمایا گیا ہے کہ وہ محض غنی نہیں ہے، بلکہ ایسا غنی ہے جسے ہر تعریف اور شکر کا استحقاق پہنچتا ہے کیونکہ وہ تمھاری اور تمام موجوداتِ عالم کی حاجتیں پوری کر رہا ہے۔ (تفہیم القرآن ج ۴)

(۲) وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ — اور اللہ غنی ہے اور تم محتاج ہو۔

(سورہ محمد)

اس آیت میں بھی فقراء کا لفظ اسی معنی میں آیا ہے، جس معنی میں سورۂ فاطر آیت ۱۵ میں آیا ہے۔

فقر کی دو قسمیں فقر اضطراری، فقر اختیاری۔ فقر اضطراری یہ ہے کہ آدمی کو کہیں سے مال و دولت ملے ہی نہیں اور وہ مفلس و تنگ دست ہو۔ فقر اختیاری یہ ہے کہ مختلف حلال ذرائع سے مال تو بہت ملے لیکن آدمی اس کو دوسرے حاجت مندوں میں تقسیم کردے اور خود فقر و فاقہ کی زندگی کو ترجیح دے۔ فقر اضطراری میں اگر صبر ہو تو ایسے فقیر صابر کی فضیلت میں بھی صحیح احادیث ... موجود ہیں اور فقر اختیاری تو وہ چیز ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے پسند فرمایا تھا۔ حضورؐ نے اپنے لیے جیسا کہ آگے آرہا ہے مسکین رہنے کی دعا کی تھی۔ آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے بھی یہی زندگی پسند کی۔ حضرت عائشہؓ کو خاص طور پر حضورؐ نے فقر کی زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیا تھا اور انھوں نے اس کی پوری تعمیل کی۔ اسی اہمیت کے پیش نظر کتب احادیث میں فقراء کی فضیلت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سادہ پُرمشقت زندگی سے متعلق ایک الگ باب موجود ہے اور بعض کتب احادیث میں کتاب الزہد والفقر کے عنوان سے ایک علیحدہ باب مرتب کیا گیا ہے اور اہمیت کے پیش نظر اسلامی تصوف میں بھی زہد اور فقر کو بلند مقام حاصل ہے۔

میں پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپؐ کی سادہ زندگی کے بارے میں صحابۂ کرامؓ کے بیانات پیش کروں گا۔ اس کے بعد کتب تصوف کی تصریحات سامنے لاؤں گا۔ احادیث کے سلسلے میں میں نے نہیں لی ہیں جن کے ضعیف

ہونے پر محدثین کا اتفاق ہو۔ انتہائی ضعیف اور موضوع احادیث نے بھی اسلامی تصوف کو بگاڑنے میں اچھا خاصا رول ادا کیا ہے۔ تصوف کی کتابیں ایسی حدیثوں سے بھری پڑی ہیں۔

حضور کی زاہدانہ زندگی

(۱) عن عائشة قالت ما شبع آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم من طعام بر ثلث لیال تباعا حتی قبض (مسلم شریف ج ۲ کتاب الزہد)

حضرت عائشہ رضی نے کہا کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم تین دن مسلسل گیہوں کی روٹی سے کبھی آسودہ نہیں ہوئے یہاں تک کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

(۲) عن عائشة ما شبع آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم من خبز شعیر یومین متتابعین حتی قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایضاً)

حضرت عائشہ رضی نے کہا آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم دو دن مسلسل جو کی روٹی سے آسودہ نہیں ہوئے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے۔

(۳) عن عائشة قالت انا کنا آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم نمکث شہرا ما نستوقد بنار ان ھو الا التمر والماء

حضرت عائشہ رضی نے کہا ہم آل محمد مہینہ بھر چولھا نہیں جلاتے تھے کھانے کو چھوارے اور پانی کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔

عن عائشة زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت لقد مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما شبع من خبز و زیت فی یوم واحد مرتین (ایضاً)

حضرت عائشہ رضی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن میں دو بار

روٹی اور روغنِ زیتون سے کبھی آسودہ نہیں ہوئے یہاں تک کہ آپؐ
دنیا سے رخصت ہو گئے۔

(۵) "عُروہؓ حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتی تھیں۔ خدا کی قسم اے بھانجے ہم دو مہینوں میں تین چاند دیکھ لیتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں آگ نہیں جلتی تھی۔ عُروہؓ نے کہا۔ میں نے پوچھا خالہ تو پھر آپ لوگ کیا کھاتے تھے انھوں نے جواب دیا۔ چھوارے اور پانی الایہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسی انصار کے پاس دودھ دینے والے جانور تھے وہ جب دودھ بھیج دیتے تو آپؐ ہم لوگوں کو وہ دودھ پلا دیتے تھے"۔ (ایضاً)

(۶) سماک سے روایت ہے کہ میں نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سُنا۔ کیا آج یہ حال نہیں ہے کہ تم لوگ جو کچھ چاہو کھاؤ اور پیو؟ میں نے تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا ہے کہ ان کے پاس ردّی قسم کے چھوارے بھی نہیں ہوتے تھے جن سے وہ اپنا پیٹ بھر سکیں۔ ایک دُوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا اور تمھارا حال یہ ہے کہ تم الوان و اقسام کی کھجوروں اور مکھن سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔

(۷) عن انس لم یاکل النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم خبزا مرققا حتی مات (بخاری کتاب الرقاق باب فضل الفقر)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ نے چپاتی کبھی نہیں کھائی یہاں تک کہ آپؐ وفات پا گئے۔

حضرت انسؓ کی دوسری روایت میں ہے انھوں نے کہا مجھے علم نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی چپاتی (پتلی روٹی) دیکھی بھی ہو یہاں تک کہ آپ کی۔

وفات ہوگئی اور نہ کبھی آپؐ نے بھنی ہوئی بکری دیکھی۔ (ایضاً)

(۸) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے اور سامان رکھنے کے مچان پر تھوڑے سے جو کے سوا کچھ نہ تھا جسے کھایا جائے۔ (ایضاً)

(۹) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر چمڑے کا گدا تھا جس میں کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی۔ (ایضاً)

یہ سب مسلم اور بخاری کی حدیثیں ہیں انھیں پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زاہدانہ اور پُرمشقت زندگی کا ایک ایسا نقشہ سامنے آتا ہے جو بڑا سبق آموز ہے۔ حضورؐ اس زندگی پر مجبور نہ تھے بلکہ آپؐ نے اپنے لیے یہی زندگی پسند فرمائی تھی۔ آپؐ نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام نہیں کیا تھا۔ میسر آجانے پر آپؐ نے اچھی غذا بھی کھائی ہے اور اچھا لباس بھی پہنا ہے۔ جانور کے اگلے حصے یعنی دست کا گوشت آپؐ کو پسند تھا۔ شہد اور میٹھی چیز آپؐ پسند فرماتے تھے۔ زاہدانہ زندگی اختیار کرنے کا مطلب جیسا کہ اوپر کہا گیا یہ ہے کہ آپؐ کے پاس جو مال، جو غلہ اور دوسری چیزیں آتی تھیں وہ آپؐ دوسروں میں تقسیم فرمادیتے تھے۔ آپؐ نے اپنے لیے اچھی غذا اور اچھے لباس کا کبھی اہتمام نہیں کیا اور عام طور پر فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخرت اور وہاں کی نعمتوں کا ایسا یقین اور اتنا استحضار تھا کہ دُنیا کے عیش و آرام کی طرف دھیان ہی نہ دیتے تھے۔ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کی پُرمشقت زندگی دیکھ کر عرض کیا یا رسولؐ اللہ قیصر و کسریٰ نازو نعمت کی زندگی بسر کریں اور آپؐ ایسی زندگی گزاریں۔ یہ سُن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ ان کے لیے دُنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت۔ اِس دُنیا کی عارضی زندگی ہر وقت حضورؐ کے سامنے رہتی تھی۔ ایک بار آپؐ نے اسے ایک بلیغ تمثیل سے سمجھایا۔

دنیا میں قیام کی تمثیل

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی پر سوئے۔ آپؐ کے پہلو میں اس کا نشان پڑ گیا۔ یہ دیکھ کر ہم نے کہا۔ یا رسولؐ اللہ! کیا ہم آپؐ کے لیے ایک نرم بستر تیار نہ کریں؟ آپؐ نے فرمایا۔ میرا اور دُنیا کا تعلق کیا ہے۔ میرا دُنیا میں قیام ایسا ہے جیسے ایک سوار جو سایے کے لیے ایک درخت کے نیچے تھوڑی دیر رُکا۔ پھر چل پڑا اور اُسے چھوڑ دیا۔ یہ ایک صحیح حدیث ہے۔ (ترمذی ابواب الزہد)

دنیا میں مسافرانہ قیام کی یہ کتنی بلیغ تمثیل ہے۔ یہی وہ استحضار ہے جو کسی مومن کو زاہدانہ و فقیرانہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

فقراء کی فضیلت

(۱) ابن عمران بن حصینؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے جنّت میں اکثریت ان لوگوں کی دیکھی جو دُنیا میں فقیر تھے۔ (بخاری)

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدخل الفقراء الجنۃ قبل الاغنیاء بخمس مأۃ عام نصف یوم ھذا حدیث حسن صحیح (ترمذی ابواب الزہد)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ فقرا مال داروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ یعنی آخرت کا آدھا دن۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

انھیں کی ایک دوسری روایت میں فقراء المسلمین کے الفاظ آئے ہیں یعنی امتِ مسلمہ کے فقراء — دُنیا کے پانچ سو سال آخرت کے آدھے دن کے برابر ہیں۔

رزقِ کفاف کی فضیلت

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا جس نے اسلام قبول کیا اور جسے رزقِ کفاف دیا گیا اور اللہ
نے جسے قناعت عطا کی وہ فلاح یافتہ ہوا۔ یہ ایک حسن صحیح حدیث ہے۔
(ترمذی)

(۲) فضالہ بن عبید سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا کہ جسے اسلام کی ہدایت دی گئی اور جسے
سامانِ زندگی ضرورت کے مطابق دیا گیا اور جو قانع رہا اس کے لیے
خوش خبری ہے۔ یہ صحیح حدیث ہے۔ (ترمذی)

"رزقِ کفاف" اس رزق کو کہتے ہیں جو اوسط درجے کی ضرورت کے
مطابق ہو اس سے زیادہ نہ ہو۔

حضورؐ کی دُعا اپنے لیے

عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم قال اللّٰھم احینی
مسکینا و امتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین یوم القیامۃ (ترمذی)
اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں وفات دے اور
قیامت کے دن مسکینوں کے گروہ میں اٹھا۔

اختیاری فقر کی یہی وہ فضیلت ہے جس کا مقابلہ ہفت اقلیم کی بادشاہت
بھی نہیں کر سکتی۔

حضورؐ کی محبّت کا ایک اثر

حضرت عبداللہ بن مغفل رضؓ سے روایت ہے
کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم سے کہا۔ خدا کی قسم یا رسولؐ اللہ میں آپؐ سے محبت کرتا ہوں۔ آپؐ
نے فرمایا۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔ خوب سوچ لو۔ انھوں نے پھر وہی بات
کہی۔ ایسا تین بار ہوا۔ تب حضورؐ نے فرمایا اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو

تو فقر و فاقہ کی مدافعت کے لیے سامان تیار رکھو۔ کیونکہ جو مجھ سے محبت
کرتا ہے فقر اس کی طرف اس تیزی سے آتا ہے جس تیزی سے سیلاب
اپنی آخری حد کی طرف جاتا ہے۔ (ترمذی)

حدیث میں تجفاف کا لفظ آیا ہے جس کے معنی چار آئینہ یعنی اس آہنی پوشاک کے ہیں جو لڑائی کے وقت ہاتھی، گھوڑوں کو پہناتے ہیں۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص آپؐ سے محبت کرے گا وہ اپنے محبوب ہی جیسی زندگی پسند کرے گا۔ اس حدیث میں "فقر" کا لفظ فقرِ اضطراری نہیں، بلکہ فقرِ اختیاری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

فقر کتبِ تصوف میں

یہ بات ذہن میں تازہ رکھنی چاہیے کہ جس فقر کی فضیلت پر گفتگو ہو رہی ہے وہ فقر مع الصبر (صبر کے ساتھ فقر) ہے ورنہ جو فقر جزع فزع، جائز و ناجائز سے بے پروائی اور اللہ کی شکایت کے ساتھ ہو وہ تو انسان کو کفر تک پہنچا سکتا ہے اور یہی فقر ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ کاد الفقر ان یکون کفراً (قریب ہے کہ فقر کفر بن جائے) اور یہی فقر و فاقہ ہے جس سے آپؐ نے پناہ مانگی ہے۔ ایسے فقرا کی کمی نہیں ہے جو مال دار اور صاحبِ اقتدار لوگوں کے خوشامدی، ان کے تنگ خوا، حُبِّ دُنیا میں گرفتار اور مال و دولت کے پرستار ہیں اور انھوں نے اپنی ظاہری عبادت، ظاہری صلاح و تقویٰ اور ظاہری "صوفی پن" کو حصولِ زر کا ذریعہ بنا لیا ہے اور ایسے فقرا کی بھی کمی نہیں ہے جو فی الواقع ضرورت مند اور محتاج نہیں ہیں بلکہ مال جمع کرنے کی حرص میں اپنے آپ کو محتاج ظاہر کرتے ہیں۔ ان فقرا کو تصوف کی کتابوں میں شیاطین سے زیادہ شریر کہا گیا ہے اور امام غزالی نے احیاء العلوم میں ایسے فقرا کو حرام خور قرار دیا ہے اس لیے کہ جو لوگ فی الواقع حاجت مند نہیں ہیں اور

اپنے کو حاجت مند ظاہر کر کے لوگوں سے مال حاصل کرتے ہیں وہ مال ان کے لیے حرام ہوتا ہے۔ احادیث میں بھی ایسے مانگنے والوں کے لیے وعیدیں موجود ہیں۔ جس فقر اور جن فقراء کی فضیلت احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ اس فقر کو اسلامی تصوف میں بھی اونچا مقام حاصل ہے اور صوفیہ صافیہ نے اس کے لیے بڑے بلند الفاظ استعمال کیے ہیں۔ رسالۂ قشیریہ میں لکھا گیا ہے:

> فقر اولیاء کا شعار اور اللہ کے منتخب بندوں کی زینت ہے۔ حق تعالیٰ نے اسے اپنے خواص یعنی خاص بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے۔ فقراء اللہ کے بندوں میں اس کے چیدہ و منتخب بندے اور اس کی مخلوق کے درمیان مہبط اسرار ہیں۔ انھیں کی برکتوں سے وہ مخلوق کی حفاظت کرتا اور اس پر اپنے رزق کے دروازے کھولتا ہے اور فقرائے صابرین کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا خاص تقرب حاصل ہوگا۔[1]

"آداب فقر" پر امام غزالی نے تفصیل سے لکھا ہے۔ میں یہاں اس کی تلخیص پیش کرتا ہوں:

> جان لو کہ فقیر کے لیے اس کے باطن، اس کے ظاہر، لوگوں کے ساتھ اس کی ملاقات و ہم نشینی اور اس کے افعال میں چند آداب کی رعایت کرنا ضروری ہے۔ اس کے باطن کا ادب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جس فقر و فاقہ میں مبتلا کیا ہے اس کی کراہت و ناپسندیدگی اس کے دل میں موجود نہ ہو۔ اللہ نے جو معاملہ اس کے ساتھ کیا ہے وہ اسے ناپسند نہ کرے۔ کراہت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فقر و فاقہ کی طبعی

---

[1] جلد ۳ مع شرح و حاشیہ ص ۲۳۴

تکلیف محسوس نہ کرے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھو کہ کسی کے زخم میں کوئی ڈاکٹر نشتر لگائے تو وہ اس کی تکلیف بھی محسوس کرے گا اور اس تکلیف کو طبعًا ناپسند بھی کرے گا لیکن نہ تو وہ ڈاکٹر سے کراہت محسوس کرے گا اور نہ نشتر لگانے کے فعل کو ناپسند کرے گا بلکہ اپنے آپ کو اس کا احسان مند سمجھے گا۔ یہ فقیر کے ادبِ باطن کا کم سے کم درجہ ہے جو اس پر واجب ہے اور اس کی ضد (یعنی اللہ کے فعل کو ناپسند کرنا) حرام ہے۔ اگر یہ درجہ بھی اسے حاصل نہ ہو تو وہ فقر کے اجر کا مستحق نہیں ہے۔ اس سے بلند درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فقر و فاقہ سے راضی ہو اور اس سے بلند درجہ یہ ہے کہ وہ چونکہ تمول و تونگری کی بُرائیوں اور اس کی خرابیوں سے واقف ہے اس لیے وہ فقر کا طالب اور اس سے خوش ہو، اسے اللہ پر توکل ہو اور وہ کفاف یعنی بقدرِ ضرورت رزق سے زیادہ کو ناپسند کرتا ہو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ فقر ذریعۂ عقوبت بھی ہوتا ہے اور موجبِ اجر و ثواب بھی۔ جو فقر موجبِ اجر و ثواب ہو اس کی علامت یہ ہے کہ صاحبِ فقر خوش اخلاق اور اپنے رب کا مطیع و فرماں بردار ہوتا ہے۔ اپنی حالت کی شکایت نہیں کرتا اور اپنے فقر پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا ہے۔ اور جو فقر ذریعۂ عقوبت و سزا ہو اس کی علامت یہ ہے کہ فقیر بد اخلاق اور اپنے رب کا نافرمان ہوتا ہے۔ اپنی حالت کی بکثرت شکایت کرتا اور قضا و قدر سے ناراض ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کا یہ قول اس بات کی دلیل ہے کہ ہر فقر محمود نہیں ہے بلکہ وہ فقر محمود ہے جس میں قضا و قدر کے فیصلے پر ناراضی

اور غصّہ نہ ہو بلکہ رضامندی ہو یا فرحت و مسرت ہو۔ اور یہ فرحت اس اجر کی بنا پر ہو جو اللہ نے اپنے صابر اور فرماں بردار فقراء کے لیے مہیّا کر رکھی ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب بھی کسی کو دُنیا کا مال و متاع دیا جاتا ہے تو گویا ساتھ ہی ساتھ اس سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اے لینے والے اسے تین چیزوں کے ساتھ لے۔ اس کی دیکھ ریکھ میں مشغولیت، اس کی حفاظت کی فکر اور حسابِ آخرت کی زیادتی۔

فقیر کے ظاہر کا ادب یہ ہے کہ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے۔ بلکہ لوگوں پر ظاہر کرے کہ اس کا حال اچھا ہے۔ وہ اپنے فقر کو چھپائے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فقیر کو پسند کرتا ہے جو صاحبِ عیال ہو اور کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (ناواقف ان لوگوں کو سوال نہ کرنے کی وجہ سے غنی سمجھتا ہے)

فقیر کے اعمال کا ادب یہ ہے کہ کسی مال دار کے سامنے محض اس کے مال و دولت کی وجہ سے تواضع و خاکساری اختیار نہ کرے بلکہ اس کے سامنے ایسی خودی کا مظاہرہ کرے جیسے وہ اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھ رہا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے۔ غنی کا وہ تواضع اچھا ہے جو وہ فقیر کے سامنے اللہ کا اجر حاصل کرنے کی طلب میں اختیار کرتا ہے لیکن اس سے بہتر فقیر کی وہ خود داری ہے جس کا مظاہرہ، وہ اللہ کی رزاقیت پر توکّل کی وجہ سے کسی مال دار کے سامنے کرتا ہے۔ یہ ایک درجہ ہے اور اس سے کم تر درجہ یہ ہے کہ فقیر نہ تو مال داروں سے خلا ملا رکھے اور نہ ان کی ہم نشینی کی اسے کوئی رغبت ہو اس لیے کہ حرص و طمع کا آغاز یہیں سے

ہوتا ہے ـــــ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب فقیر مالداروں سے خلا ملا رکھے تو سمجھ لو کہ وہ ریا کار ہے اور اگر اقتدارِ وقت کے ساتھ خلا ملا رکھے تو سمجھ لو وہ چور ہے۔ فقیر کے اعمال کا ادب یہ بھی ہے کہ وہ مال داروں کے سامنے ان کے عطیہ و ہدیہ کی طلب میں سچی بات کہنے سے خاموشی اختیار نہ کرے ورنہ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ وہ ان کے مال کے لالچ میں مداہنت کر رہا ہے۔

فقیر کے افعال کا ادب یہ ہے کہ وہ فقر و فاقہ کی وجہ سے اللہ کی عبادت میں سستی نہ کرے اور اگر اس کے پاس مال ضرورت سے کچھ بھی زیادہ ہو تو اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے نہ رُکے یہی چیز جہد المقل (یعنی محتاج کی محنت و مشقت کا صدقہ) ہے اور اس کی فضیلت مال دار رہتے ہوئے راہِ خدا میں کثیر اموال خرچ کرنے سے زیادہ ہے۔ زید بن اسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک درہم کا صدقہ اللہ کے نزدیک ایک لاکھ درہموں کے صدقے سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ دریافت کیا گیا۔ یہ کس طرح یا رسولؐ اللہ! آپؐ نے فرمایا ایک شخص نے اپنے مال کے انبار سے ایک لاکھ درہم نکالا اور صدقہ کر دیا اور ایک دوسرے شخص نے جس کا کُل مال صرف دو درہم تھا اس میں سے ایک درہم نکالا اور خوش دلی کے ساتھ صدقہ کر دیا۔ اسی طرح یہ ایک درہم خرچ کرنے والا ایک لاکھ درہم خرچ کرنے والے سے بڑھ گیا۔"

فقیر کے شایانِ شان یہ بات ہے کہ بقدرِ ضرورت مال سے زیادہ جمع نہ کرے اور اس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک دن اور رات کی ضرورت

سے زیادہ جو مال ہو اُسے راہِ خدا میں خرچ کر دے[1]

امام غزالی رحمہ اللہ نے یہ جو کچھ فرمایا تصوف کی دوسری مستند کتابوں میں بھی اسی طرح کی باتیں کہی گئی ہیں۔ اس کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ آج کتنے محتاج ایسے ہیں جو "مقامِ فقر" پر فائز ہوں اور آج کتنے لوگ ایسے ہیں جو خدا کی رزاقیت پر اتنا عظیم توکل رکھتے ہوں کہ ایک دن کی ضرورت سے زیادہ مال خدا کی راہ میں خرچ کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ "مقامِ فقر" کا حصول کھیل تماشہ نہیں ہے اور نہ ہر محتاج اس معنی میں فقیر ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ مقامِ فقر کا اصل تعلق فقدانِ مال سے نہیں، بلکہ قلب کی ایمانی کیفیت سے ہے۔ فقدانِ مال اس کیفیت کا محض ظاہری حصہ ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے کہ تونگری مال کی کثرت سے نہیں بلکہ تونگری دل کی تونگری ہے۔ اگر دل میں قناعت و استغنا نہیں تو کروڑپتی بھی فقیر ہے اور اگر دل میں قناعت و استغنا موجود ہو تو فقیر بھی غنی ہے۔

دو آیتوں سے استدلال

صوفیہ نے فقر اور فقراء کی فضیلت پر اخبار و آثار کے علاوہ قرآن مجید کی دو آیتوں سے بھی استدلال کیا ہے۔

(۱) ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے:

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خود داری دیکھ کر ناواقف آدمی

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۴، باب آداب الفقیر فی فقرہ ص ۱۲۸ مطبع مجتبائی میرٹھ

گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی
حالت پہچان سکتے ہو مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر
کچھ مانگیں۔ ان کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے
پوشیدہ نہ رہے گا۔ (البقرہ رکوع ۳۷، آیت ۲۷۳)

امام قشیری نے اپنے رسالے میں صرف یہی آیت پیش کی ہے۔ سید مصطفیٰ
عروسی نے نتائج الافکار القدسیہ ج ۳ ص ۲۳۰ میں لکھا ہے کہ

اس سے مراد اہلِ صُفّہ رضوان اللہ علیہم ہیں یہ تقریباً چار سو
فقرائے مہاجرین تھے جو مسجدِ نبوی کے ایک چبوترے پر رہتے تھے ان
کے تمام اوقات دین سیکھنے اور جہاد کرنے میں گھرے ہوئے تھے۔ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں جس سریہ (فوج کی ایک ٹکڑی) میں چاہتے
جہاد کے لیے بھیج دیتے۔ اس آیت میں یہ جو کہا گیا ہے کہ "وہ کسی کے
پیچھے پڑ کر کچھ نہیں مانگتے"۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ کسی سے
کچھ نہیں مانگتے۔ یعنی سوال کرنے کی مطلقاً نفی مُراد ہے اور ایک مطلب
یہ ہے کہ اگر حالتِ اضطرار میں کسی سے کچھ مانگنا پڑے تو جھپٹ کر اور
پیچھے پڑ کر نہیں مانگتے۔

قرآن کی آیت میں ان کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ مطلب نکلتا ہے
کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتے۔ تفسیرِ جلالین میں صرف اسی مطلب پر اکتفا کیا گیا ہے۔
مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے حاشیۂ قرآن میں اس آیت کے تحت لکھا ہے:

"یعنی ایسوں کا دینا بڑا ثواب ہے جو اللہ کی راہ اور اس کے دین کے کام
میں مقید ہو کر چلنے پھرنے، کھانے کمانے سے رُک رہے ہیں اور کسی
پر اپنی حالت ظاہر نہیں کرتے۔ جیسے حضرت کے اصحاب تھے۔ اہلِ صفہ

نے گھر بار چھوڑ کر حضرت کی صحبت اختیار کی تھی۔ علمِ دین سیکھنے کو اور مفسدین فتنہ پردازوں پر جہاد کرنے کو۔ اسی طرح اب بھی جو کوئی قرآن کو حفظ کرے یا علمِ دین میں مشغول ہو تو لوگوں پر لازم ہے کہ ان کی مدد کریں اور چہرے سے ان کو پہچاننا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے چہرے زرد ہو رہے ہیں اور آثارِ جد و جہد ان کی صورت سے نمودار ہیں۔"

(۲) امام غزالیؒ نے احیاء العلوم جلد ۴ "بیان فضیلۃ الفقر مطلقاً" میں دوسری آیت پیش کی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

نیز مالِ فے ان غریب مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال باہر کیے گئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی حمایت پر کمربستہ رہتے ہیں۔ یہی راست باز لوگ ہیں۔ (الحشر رکوع ۱۔ آیت ۸)

سورۂ حشر کی یہ آیت مالِ فے کی تقسیم سے متعلق ہے[1] مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے حاشیۂ قرآن میں اس آیت کے تحت لکھا ہے:

"یوں تو اس مال سے عام مسلمانوں کی ضروریات و حوائج متعلق ہیں لیکن خصوصی طور پر ایثار پیشہ جاں نثاروں اور سچے مسلمانوں کا حق مقدم ہے۔ جنھوں نے محض اللہ کی خوشنودی اور رسولؐ کی محبت و

---

[1] حالتِ جنگ میں کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے جنگ کر کے جو مال حاصل ہوتا ہے اس کو غنیمت اور جو جنگ کے بغیر حاصل ہوتا ہے اس کو فے کہتے ہیں۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کا حکم سورۂ الانفال میں ہے اور مالِ فے کی تقسیم کا حکم سورۂ الحشر میں ہے۔ (سیّد احمد)

اطاعت میں اپنے گھر بار اور مال و دولت سب کو خیرباد کہا اور بالکل خالی ہاتھ ہو کر وطن سے نکل آئے تاکہ اللہ و رسولؐ کے کاموں میں آزادانہ مدد کر سکیں۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے:

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس وقت مکہ معظمہ اور عرب کے دوسرے علاقوں سے صرف اس بنا پر نکال دیئے گئے تھے کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ (تفہیم القرآن ج ۵)

امام غزالی نے سورۂ البقرہ اور سورۂ الحشر کی آیتوں سے فقر اور فقراء کی فضیلت پر اس طرح استدلال کیا ہے:

اللہ کا یہ کلام مدح کے اندازِ بیان میں ہے نیز یہ کہ اللہ نے ان کے وصفِ فقر کو ان کے وصفِ ہجرت اور ان کے وصفِ احصار (یعنی اللہ کے کاموں کے لیے بالکلیہ اپنے تمام اوقات مشغول کر دینا) پر مقدم کیا ہے۔ اس میں فقر کی تعریف و تحسین کی کھلی ہوئی دلیل موجود ہے۔[1]

فقر اور فقراء کے بارے میں صوفیۂ کرام کے اقوال

(۱) یحییٰ بن معاذ سے فقر کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا:

"اس کی حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ صرف اللہ سے استغناء حاصل کرے اور اس کی رسمی تعریف یہ ہے کہ تمام مال و اسباب کا فقدان ہو۔"

شیخ الاسلام زکریا انصاری نے اس قول کی یہ تشریح کی ہے کہ بندہ خلقِ خدا

---

[1] احیاء العلوم ج ۴ ص ۱۲۱

کے سامنے اپنی احتیاج پیش نہ کرے کیونکہ اس صورت میں وہ صرف اللہ سے استغنا حاصل کرنے والا نہ ہوگا۔ جسے اللہ کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا کسی چیز کا مالک نہیں وہ اپنے آپ کو اللہ کے سوا کسی دوسرے کا محتاج نہیں سمجھتا۔ مال و اسباب کی نفی اس لیے ہے کہ کہیں انھیں پر اعتماد نہ ہو جائے۔

(۲) ابو جعفر فرخانی کہتے ہیں کہ میں نے جنید بغدادی کو کہتے ہوئے سنا:

اے گروہِ فقراء لوگ تمھیں اللہ کے واسطے سے پہچانتے اور اللہ ہی کے لیے تمھارا احترام کرتے ہیں لہٰذا تمھیں یہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ خلوتوں اور تنہائیوں میں اللہ کے ساتھ تمھارا سلوک کیا ہے؟

شیخ انصاری نے اس بات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت جنید نے فقراء کو اس بات پر اُبھارا ہے کہ خلوتوں اور تنہائیوں میں اللہ کے وہ حقوق ادا کریں جن کی وجہ سے ان کا اکرام و احترام کیا جاتا ہے ان حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ وہ خلوتوں میں بھی کمال ادب کے ساتھ رہیں، اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں اور اس بات کو مستحضر رکھیں کہ اللہ کی کسی طاعت پر، اس کی مدد کے بغیر بذاتِ خود انھیں کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔

سید مصطفیٰ عروسی نے حاشیے میں لکھا ہے کہ حضرت جنید نے جو کچھ کہا اس میں نفاق سے اجتناب کی نصیحت کی گئی ہے یعنی فقراء کا باطن ان کے ظاہر کے مطابق ہونا چاہیے تاکہ وہ منافقین کی صفت سے برأت حاصل کرلیں۔

(۳) ابو حفص رحمہ اللہ نے کہا

"کسی شخص کا فقر اس وقت تک صحیح نہیں جب تک اس کے نزدیک دوسروں کو دینا خود لینے سے زیادہ محبوب نہ ہو۔"

مطلب یہ ہے کہ فقیر بخیل اور حریص نہیں ہوتا بلکہ سخی اور قانع ہوتا ہے۔ انھیں کا قول یہ بھی ہے کہ:

"بہترین ذریعہ جس سے بندہ اپنے مولیٰ کا تقرب حاصل کرتا ہے، یہ ہے کہ وہ تمام احوال وظروف میں اپنے کو صرف اللہ کا محتاج سمجھے اور تمام افعال میں سنتِ نبوی کی پیروی کو لازم جانے اور حلال ذریعے سے رزق کفاف حاصل کرے۔"

(۴) قال بشر بن حارث
افضل المقامات عقد الصبر علی الفقر الی القبر

مقامات میں سب سے افضل مقام، قبر تک فقر پر صبر ہے۔

اس بلیغ جملے میں سب کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ اصل اعتبار خاتمے کا ہے۔ جب تک موت نہ آجائے تمام احوال اور تمام مقامات میں تبدیلی کا احتمال موجود ہے۔ فقر کو اختیار کرنا مشکل نہیں لیکن اس پر تا مرگ صبر کے ساتھ جمنا بہت مشکل ہے۔

(۵) نوری رحمہ اللہ نے کہا:

"فقر کی تعریف یہ ہے کہ مال موجود نہ ہو تو اس پر سکون کی کیفیت طاری رہے اور مال موجود ہو تو بذل وایثار کا جذبہ چھا جائے۔"

"سکون" کے معنی یہاں یہ ہیں کہ اس پر اضطراب طاری نہ ہو وہ جزع فزع نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے وعدۂ رزق پر کامل اعتماد کی وجہ سے وہ صابر وساکن رہے اور مال موجود ہو تو دریادلی کے ساتھ اللہ کی راہ پر خرچ کرے اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دے۔

(۶) کہا گیا ہے کہ:

فقر کے لیے کم سے کم چار چیزیں لازمی ہیں۔ (۱) ایسا علم جو اس کا

نگراں و رہنما ہو۔ (۲) ایسا ورع (تقویٰ سے اونچا درجہ) جو اسے ان
چیزوں کے ارتکاب سے روکے جو اللہ کو ناپسند ہیں۔ (۳) ایسا یقین جو
اسے اللہ کی اطاعت و عبادت پر ابھارے۔ (۴) اللہ کی ایسی یاد جو
اس کے دل کی راحت بن جائے۔

سید عروسی لکھتے ہیں۔ غور کرو جب یہ کم سے کم ہے تو زیادہ کیا ہوگا۔

(۷) حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے کہا:

"کسی بندے پر اللہ کے غضب کی علامت یہ ہے کہ وہ بندہ فقر و فاقہ کے
خوف میں مبتلا ہو جائے۔"

اس قول کی شرح یہ ہے کہ فقر و فاقہ کا خوف اس بات کی علامت ہے کہ اللہ
نے رزق کی جو ضمانت دی ہے اس میں اسے شک ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ فقر و
فاقہ سے شیطان ڈراتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کے خوف میں گرفتار ہونا دراصل
شیطان کی پیروی ہے۔ فقر و فاقہ کا خوف انسان کو بخل میں مبتلا کرتا اور مال میں اللہ
کے مقرر کیے ہوئے حقوق ادا کرنے سے روکتا ہے۔

(۸) یحییٰ بن معاذ سے پوچھا گیا فقرِ مذموم کیا ہے؟ انھوں نے کہا فقر کا خوف۔
ان سے پوچھا گیا غنائے محمود کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا اللہ کے وعدے پر
اعتماد اور سکون۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ فقر کے خوف کا مطلب،
تونگری سے محبت ہے اور اس کی محبت انسان کو فقر میں مبتلا کرتی ہے۔ جب کبھی
انسان اس بات سے ڈرے گا کہ کہیں وہ محتاج نہ ہو جائے تو اس کے نتیجے میں وہ
زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے میں سرگرم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس غنائے محمود
دراصل فقر اور قناعت کی محبت ہے اور ان دونوں کی محبت اللہ کے وعدے پر اطمینان

وسکون کی کیفیت پیدا کرتی ہے اس شخص کو پورا اطمینان ہوتا ہے کہ اللہ نے جس رزق کی ضمانت دی ہے وہ اسے ضرور ملے گا۔

(۹) ابراہیم ادہم نے کہا:

"ہم نے فقر کو مطلوب بنایا تو تونگری ہمارے استقبال کو آگے بڑھی اور لوگوں نے تونگری کو مطلوب بنایا تو محتاجی ان کے استقبال کو آگے بڑھی"۔

شیخ انصاری اس جملے کی تشریح میں کہتے ہیں کہ جس شخص کی رغبت دُنیا میں حصول میں کم ہوگی اور وہ اپنے آپ کو اللہ کی طاعات وعبادات کے لیے فارغ کرے گا وہ کم سے کم پر اکتفا کرے گا اور وہ کم سے کم چیز بھی وہی ہوگی جو اعمالِ آخرت میں اس کی مددگار بنے گی اور دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے جیسے اس کو مال ملتا جائے گا اس میں اضافے کی حرص بڑھتی جائے گی اس طرح اس کا نفس کبھی غنی نہیں بن سکے گا۔

سید عروسی پہلے جملے کی شرح میں لکھتے ہیں کہ "تونگری کے استقبال کا مطلب یہ ہے کہ نفس میں قناعت پیدا ہوجاتی ہے اور انسان صرف اتنے پر راضی ہوجاتا ہے جو اس کی جان بچانے کے لیے کافی اور طاعت وعبادت میں معین ومددگار ہو اور "فقر کے استقبال" کا مطلب یہ ہے کہ دل میں فقر گھر بنالیتا ہے اور یہ فقر کی انواع واقسام میں سب سے شدید قسم کا فقر ہے۔ اس کے بعد اگر کسی کو تمام دُنیا کی دولت دے دی جائے تب بھی وہ مزید کی خواہش کرے گا۔ حدیث اس کی تائید کرتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ دو حریص ایسے بھی ہیں جو کبھی آسودہ نہیں ہوتے طالبِ علم اور طالبِ دُنیا۔

(یہ تمام اقوال اور ان کی تشریحات رسالۂ قشیریہ اور اس کی شرح اور حاشیے سے ترجمہ کی گئی ہیں)

اس کتاب کا حقیر مؤلف عرض کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم ادہم کے قول کی ان دو علماء نے جو تشریح کی ہے، صحیح ہے لیکن ان کے قول کا ایک اور مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص فقر کو مطلوب بنا کر اللہ تعالیٰ کے طاعات و عبادات کے لیے اپنے کو فارغ کر لیتا ہے اور آخرت اس کی فکر کا محور بن جاتی ہے تو فی الواقع تونگری اس کے استقبال کو آگے بڑھتی ہے۔ وہ مال سے بھاگتا ہے اور مال اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اور جو دنیا کو مطلوب بنا کر اللہ کی اطاعت سے غافل ہو جاتا ہے اور دنیا اس کا مطمح نظر بن جاتی ہے اس کی محتاجی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ آپ ایسے کسی مال دار کے پاس اپنی ضرورت لے کر جائیں تو وہ ہمیشہ اپنے کثیر اخراجات اور قلیل آمدنی کا رونا روتا نظر آئے گا۔ اس مطلب کی تائید ذیل کی حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آخرت، جس کی فکر بن جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب میں استغناء پیدا کر دیتا ہے اور دُنیا ذلیل و خوار ہو کر اس کے سامنے آتی ہے۔ اور دُنیا جس کی فکر بن جاتی ہے تو اللہ اس کی محتاجی کو اس کا نصب العین بنا دیتا اور اس کے مجتمع امور کو متفرق و منتشر کر دیتا ہے اور دنیا میں سے اسے اتنا ہی ملتا ہے جو اس کے مقدر میں ہو۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ایسا شخص ہر وقت فقیر و محتاج ہی رہتا ہے اور جو شخص دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اللہ اپنے مسلم و مومن بندوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیتا ہے اور وہ اس کی طرف کھنچنے لگتے ہیں اور اللہ ہر خیر و خوبی کا دروازہ اس پر کھول دیتا ہے۔

(جمع الفوائد بحوالہ ترمذی ج ۲ ص ۲۷۸)

اسی مضمون کی ایک حدیثِ قدسی[1] حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے :
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔
اے ابنِ آدم تو اپنے آپ کو میری بندگی و اطاعت کے لیے فارغ کرلے۔
میں تیرے سینے کو استغناء و قناعت سے بھر دوں گا اور تیری احتیاج
دُور کر دوں گا۔ اور اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تجھے دُنیوی مشاغل میں
گھیر دوں گا اور تیرے فقر و احتیاج کو دُور نہیں کروں گا۔

(ایضاً بحوالہ ترمذی)

فقرائے صوفیہ کے احوال

"فقر" کے بارے میں صوفیۂ کرام کے چند اقوال کا مطالعہ کر لینے کے بعد یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ان کے احوال، ان کے اقوال کے مطابق تھے یا نہیں اس لیے کہ احوال و اعمال ہی اقوال کی صداقت کے گواہ ہوتے ہیں۔ یہ گواہی موجود نہ ہو تو اقوال وبال بن جاتے ہیں۔

فقرِ اضطراری بھی اگر صبر کے ساتھ ہو تو ایک اونچا مقام ہے لیکن اس سے بلند تر مقام فقرِ اختیاری کا ہے۔ اس میں انسان اللہ کے قرب، اس کی خوشنودی اور آخرت کے بلند درجات کے حصول کے لیے دُنیوی عیش و آرام کو تج دیتا ہے اور اپنے اوقات کا بہت بڑا حصہ اللہ کی عبادت و اطاعت میں لگا دیتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس کے وقت کا کوئی حصہ اللہ کی اطاعت سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ دیکھ کر شیطان صاحبِ مقام کے پیچھے لگ جاتا اور اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے کہ تمہارا کیا کہنا۔ تم تو بڑے عابد و زاہد اور اللہ کے مقرب بندے ہو اس طرح گھمنڈ پیدا کر کے تمام عبادات و اطاعت پر پانی

---

[1] جس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے ارشاد فرمائی ہو اس کو حدیثِ قدسی کہتے ہیں۔

پھیر دینے کی اَن تھک کوشش کرتا ہے۔ شیطان کے اس مکر و کید سے بچنا، تواضع اختیار کرنا اور ہر وقت اپنی کوتاہیوں کا احساس تازہ رکھنا اس مقامِ بلند کو محفوظ رکھنے کے لیے انتہائی ضروری کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچے فقراء کے احوال میں تواضع اور اپنی کوتاہیوں کا احساس ایک نمایاں وصف کے طور پر ہمیں ملتا ہے۔ یہاں چند فقراء کے جو احوال پیش کیے جا رہے ہیں ان سے فقر کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔

(۱) ایک فقیر صوفی نے دوسرے فقیر صوفی سے ملاقات کی اور کہا کہ میں آپ سے للہ فی اللہ محبت کرتا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر میرے بارے میں تم وہ کچھ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم مجھ سے للہ فی اللہ نفرت کرتے۔ پہلے صوفی نے کہا آپ اپنے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں اگر وہ مجھے معلوم ہوتا تو اپنے نفس کے بارے میں مجھے جو کچھ علم ہے وہ آپ سے نفرت کرنے کی فرصت نہ دیتا ——— یہ تواضع اور اپنی کوتاہیوں کا وہ زندہ احساس ہے جو انسان کو غیبت، عیب چینی، گھمنڈ اور اس قسم کے بیسیوں گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

(۲) محمد بن واسع رحمہ اللہ سے ایک بار پوچھا گیا۔ آپ کا کیا حال ہے۔ کس حال میں آپ نے صبح کی؟ اس سوال کا انھوں نے یہ فصیح و بلیغ جواب دیا۔

اصبحت طویلا املی قصیرا اجلی	میں نے اس حال میں صبح کی کہ میری آرزو
سیئا عملی	طویل میری مدتِ حیات قلیل اور میرا عمل ذلیل ہے

"امل" کا لفظ احادیث میں دُنیا کی لمبی چوڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اس سے اجتناب کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ "سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں"۔

اس جواب میں عمل کی صفت "سیئ" لائی گئی ہے جس کے لفظی معنی بُرے اور خراب کے ہیں۔ میں نے قافیہ کی رعایت سے اس کے لیے "ذلیل" کا لفظ استعمال

کیا ہے۔

(۳) ایک شخص ابراہیم بن ادہم کے پاس دس ہزار درہم لائے کہ وہ انھیں ضروریات میں خرچ کریں۔ انھوں نے لینے سے انکار کیا اور کہا کیا تم چاہتے ہو کہ میں دس ہزار درہم کے عوض .... اپنا نام فقراء کے دفتر سے مٹا ڈالوں۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔

(۴) ایک شخص نے ابن الجلاء رحمہ اللہ سے "فقر" کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اپنے گھر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر کہا۔ میرے پاس چار دانق (دانق ایک درہم کے چھٹے حصّے کے برابر ایک سکے کا نام ہے) موجود تھے ان کے رہتے ہوئے مجھے اللہ سے شرم آئی کہ میں "فقر" پر گفتگو کروں۔ میں ان کو خرچ کر آیا۔ پھر وہ اپنی جگہ بیٹھے اور فقر پر گفتگو کی۔

(۵) بنان المصری رحمہ اللہ نے کہا کہ میں مکہ معظمہ میں ایک جگہ بیٹھا تھا اور ایک جوان میرے سامنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آئے اور اس جوان کے سامنے درہموں سے بھری ہوئی ایک تھیلی رکھ دی۔ جوان نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس شخص نے کہا۔ اگر آپ کو ضرورت نہیں تو ان درہموں کو فقراء و مساکین کے درمیان تقسیم کر دیجیے۔ چنانچہ اس جوان نے وہ تھیلی تقسیم کر دی۔ پھر اسی دن عشاء کے وقت میں نے دیکھا کہ وہ جوان وادیٔ مکہ میں اپنے کھانے کے لیے کوئی چیز تلاش کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا۔ اگر ان دراہم میں سے آپ اپنے لیے چند درہم رکھ لیتے تو آپ کے لیے اس تلاش سے بہتر ہوتا۔ اس کا جواب اس جوان نے یہ دیا۔ "مجھے معلوم نہ تھا کہ میں اس وقت تک زندہ بھی رہوں گا"

(۶) چار درویش اور ان کے الگ الگ چار طرز عمل

ابو علی روز باری رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک زمانے میں چار فقیر تھے۔ ان میں ایک کسی سے کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے، نہ حاکمِ وقت سے اور نہ اپنے احباب سے،

یہ تھے یوسف بن اسباط، انھوں نے وراثت میں ستر ہزار درہم پائے لیکن اس میں سے کچھ بھی نہیں لیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کھجور کے پتوں کی چٹائی بنتے اور فروخت کرکے اپنی ضرورت پوری کرتے ــــــ دوسرے فقیر کا طرزِ عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ حاکمِ وقت سے بھی عطیہ قبول کرتے اور اپنے دوست احباب سے بھی۔ یہ تھے ابو اسحٰق الفزاری۔ لیکن وہ جو کچھ اپنے دوستوں سے قبول کرتے اسے ان فقراء پر خرچ کرتے جن کا حال لوگوں کو معلوم نہ تھا اور جو کچھ حاکمِ وقت سے قبول کرتے وہ طرطوس (ایک شہر کا نام) کے ان مستحق لوگوں پر خرچ کرتے جن کا مسلمانوں کے بیت المال میں کوئی حق ہوتا ــــــ تیسرے فقیر کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ احباب سے تو عطیہ قبول کرتے لیکن حاکمِ وقت سے قبول نہ کرتے۔ یہ تھے عبداللہ بن مبارک لیکن وہ اس کی مکافات بھی کرتے۔ یعنی احباب کو اپنی طرف سے تحفے دیتے۔ ہدیہ بھیجتے ــــــ چوتھے فقیر اس کے برعکس حاکمِ وقت سے عطیہ قبول کرتے لیکن احباب سے قبول نہ کرتے۔ یہ تھے مخلد بن الحسین۔

یہ حکایت اس بات کی دلیل ہے کہ کسی کام میں مختلف دلائل و محرکات کی بنا پر مختلف طرزِ عمل اختیار کیے جاسکتے ہیں اور وہ سب اپنی جگہ صحیح ہوتے ہیں پہلے طرزِ عمل کا محرک یہ تھا کہ کسی سے کچھ نہ لینا اور اپنے ہاتھوں کی کمائی پر قناعت کرنا سلامتی کا راستہ ہے کیونکہ کسی سے کچھ لینے میں انسان دھوکا کھا سکتا ہے۔ دوسرے طرزِ عمل کی دلیل وہ تعلیم ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو دی تھی۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا تھا ما اتاك من غیر مسئلۃ فخذہ (جو کچھ تمھارے پاس مانگے بغیر، بے طلب آئے اسے لے لو)

پھر یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ وہ بزرگ جو کچھ قبول کرتے تھے اسے اپنی ذات پر صرف نہیں کرتے تھے بلکہ دوسروں پر خرچ کرتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں

کہ وہ اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے قبول کرتے تھے۔ تیسرے طرزِ عمل کا محرک تقویٰ اور ورع تھا۔ احباب کے مال کے بارے میں ظنِ غالب یہ تھا کہ وہ حلال ہوگا اور حاکمِ وقت کے مال کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ کہیں وہ حرام نہ ہو۔ چوتھے بزرگ نے اپنے عمل کا محرک خود بیان کیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ حاکمِ وقت جو کچھ دیتا ہے اس پر احسان نہیں جتاتا۔ اس کے علاوہ یہ کہ بیت المال اس کی ملکیت نہیں ہوتا۔ میں جو کچھ لیتا ہوں، اپنا حق لیتا ہوں ــــــــــ اور دوست احباب سے قبول کرنے میں اس کا اندیشہ ہے کہ آئندہ کبھی وہ اس کا احسان جتانے لگیں۔[1]

(۷) یوسف بن اسباط رحمہ اللہ نے کہا کہ چالیس سال سے میں کبھی دو قمیصوں کا مالک نہیں ہوا۔ یعنی ایک ہی قمیص کو وہ دھو دھو کر استعمال کرتے رہے۔

شیخ انصاری نے اس واقعہ کے تحت یہ لکھا ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک بار امیر المومنین عمرؓ بن الخطاب خطبہ دے رہے تھے بایں حال کہ ان کے جسم پر جو لباس تھا ان میں گیارہ پیوند لگے ہوئے تھے اور ان میں کا ایک پیوند چمڑے کا تھا گویا پیوند کے لیے بھی کپڑا میسر نہ آیا تو چمڑا سی دیا۔

(۸) محمد بن علی الکتانی رحمہ اللہ نے کہا۔ ہمارے قریب میں ایک نوجوان رہتے تھے۔ ان کے جسم پر بوسیدہ لباس تھا وہ نہ تو ہمارے کسی معاملے میں دخل دیتے اور نہ ہماری مجلسوں میں آتے۔ میرے دل میں ان کی محبت و عزت پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ مجھے حلال ذریعہ سے دو سو درہم حاصل ہوئے۔ میں ان کے پاس لے گیا اور ان کی جانماز کے ایک کنارے رکھ دیا اور کہا یہ درہم مجھے حلال ذریعے سے ملے ہیں آپ انھیں اپنی ضرورتوں پر خرچ کیجیے۔ یہ دیکھ اور سن کر انھوں

---

[1] رسالہ قشیریہ اور اس کی شرح

نے مجھ پر ایک غضب ناک نظر ڈالی اور کہا۔ میں نے اللہ کے حضور فراغت اور اطمینان
کے ساتھ بیٹھنے کے لیے یہ نشست، دیگر جائدادوں کے علاوہ ستر ہزار دینار نقد
لگاکر خریدی ہے اور اب تم ان چند درہموں کے عوض مجھے بہکا کر اس نشست سے
محروم کرنا چاہتے ہو۔ یہ کہا اور جا نماز جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تمام درہم
بکھر گئے۔ میں بیٹھ کر انھیں چننے لگا۔ اس دن میری نظر میں ان سے زیادہ مکرم و
محترم اور خود اپنے سے زیادہ ذلیل وحقیر اور کوئی نہ تھا۔

(۹) اسی طرح کا ایک واقعہ رسالہ قشیریہ اور اس کی شرح میں اس طرح
بیان کیا گیا ہے۔ خیر النساج رحمہ اللہ نے کہا کہ میں ایک مسجد میں داخل ہوا۔ میں
نے دیکھا کہ اس میں ایک فقیر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب انھوں نے دیکھا تو اٹھ کر
میرا دامن پکڑ لیا اور کہا اے شیخ میری مدد فرمائیے۔ میں ایک سخت مصیبت
میں بتلا ہو گیا ہوں۔ میں نے پوچھا وہ کیا مصیبت ہے۔ انھوں نے کہا۔ میں
"فقر" سے محروم کر کے عافیت و رفاہیت کی طرف دھکیل دیا گیا ہوں۔ واقعہ یہ
پیش آیا تھا کہ ان فقیر کے بعض دوستوں نے ان کے فقر و فاقہ پر ترس کھا کر
ان کے سامنے تھوڑا سا مال رکھ دیا تھا اور بھاگ کھڑے ہوئے تھے تاکہ وہ اسے
واپس نہ کر سکیں۔ یہ تھی وہ مصیبت جس میں وہ بتلا ہو گئے تھے اور اس سے
نکلنے کے لیے خیر النساج کے دامن سے لپٹ کر فریاد کر رہے تھے۔

(۱۰) محمد بن محمد بن احمد رحمہ اللہ نے کہا۔ میں ابو بکر وراق کی مجلس میں
تھا۔ انھوں نے کہا۔ فقیر کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں خوش خبری ہے۔ اہلِ
مجلس نے اس کی تشریح چاہی۔ انھوں نے کہا دنیا میں خوش خبری یہ ہے کہ
بادشاہِ وقت اس سے خراج طلب نہیں کرتا اور آخرت میں خوش خبری یہ ہوگی کہ
اس سے مال کا حساب طلب نہیں کیا جائے گا۔

شارح لکھتے ہیں کہ یہ فقر کے فوائد میں سے ایک بڑا فائدہ ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اور بھی فوائد ہیں مثلاً ۱۔ مال کی دیکھ بھال اور اس کے حساب کتاب سے فراغت و راحت ۲۔ اللہ کی طرف کامل توجہ اور مناجات کی لذت ۳۔ مالداروں سے پہلے دخولِ جنت۔

فقر و غنا کے درمیان فضیلت کی بحث

فقیر صابر اور غنی شاکر میں کون افضل ہے؟ تصوف کی کتابوں میں اس سوال پر بھی بحث کی گئی ہے اور امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ علماء و صوفیاء کی بڑی تعداد نے فقیر صابر کو افضل قرار دیا ہے اور ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے غنی شاکر کو افضل کہا ہے۔ امام غزالیؒ نے خاص علمی انداز میں یہ بحث کی ہے کہ مطلقاً نہ فقیر صابر کو افضل کہا جاسکتا ہے اور نہ غنی شاکر کو۔ اس کے بعد انھوں نے ان دونوں کی مختلف اقسام اور ان کے مختلف درجات پر گفتگو کی ہے۔ بعض صوفیہ نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ایک لفظی بحث ہے کیونکہ صبر و شکر دراصل لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں صبر ہوگا وہاں شکر بھی ہوگا اور جہاں شکر ہوگا وہاں صبر بھی ہوگا۔

راقم الحروف کے نزدیک فقیر صابر کے حق میں دو دلیلیں ایسی ہیں جو اسے شکر گزار غنی سے افضل قرار دیتی ہیں۔ ایک یہ کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے فقر کو اختیار فرمایا۔ اور دوسری یہ کہ فقرائے صابرین مال داروں سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔

فقر اختیاری کے بارے میں ایک ضروری یاددہانی

اپنا سب کچھ دوسروں کو دے کر خود فقر و فاقہ اختیار کرنے کے بارے میں کتاب و سنت سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اجرِ آخرت

کو ترجیح دینے اور اللہ کی رزاقیت پر توکل کرنے کے مدارج متفاوت ہیں اور انھیں مدارج کے لحاظ سے رہنمائی کی گئی ہے۔ ایک طرف سب کچھ خرچ کر دینے کی ممانعت کی گئی ہے اور دوسری طرف فقر و فاقہ کے باوجود ایثار کی مدح کی گئی ہے۔ ایک طرف کسی سے اس کا تمام مال قبول کر لیا گیا ہے اور دوسری طرف کسی کے تمام مال کو قبول کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ یہ کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ ایمان باللہ، توکل علی اللہ اور ایمان بالآخرت کے مدارج متفاوت ہونے کی بنا پر احکام مختلف ہو گئے ہیں۔ قرآنِ کریم میں مال خرچ کرنے سے متعلق عام ہدایت یہ دی گئی ہے کہ انسان بخل اور اسراف دونوں سے احتراز کرے۔ اس کا خرچ شرعی حدود کے اندر معتدل ہونا چاہیے۔ اس کے لیے سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۶ تا ۳۰، اور سورۂ الفرقان کی آیت ۶۷ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ دوسری طرف خاص اور ہنگامی حالات میں اپنی ضرورت سے زیادہ تمام مال راہِ خدا میں خرچ کر دینے کی ہدایت بھی دی گئی ہے اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینے کی مدح بھی کی گئی ہے۔

ہنگامی حالات میں ضرورت سے زیادہ تمام مال فی سبیل اللہ خرچ کر دینے کا حکم سورۂ البقرہ میں دیا گیا ہے۔

"اور پوچھتے ہیں ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو جو کچھ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو" (البقرہ رکوع ۲۷، آیت ۲۱۹)

اور سورۂ الحشر میں انصار کی مدح کرتے ہوئے فرمایا:

(اور مالِ فے ان لوگوں کے لیے بھی ہے)، جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی دار الہجرت میں مقیم تھے۔ یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ بھی ان کو دے دیا جائے اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح

دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ شحِ نفس (دل کی تنگی) سے بچا لیے گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (الحشر آیت ۹)

انصارِ مدینہ نے مہاجرینِ مکہ کے لیے جس ایثار سے کام لیا تھا یہ اس کا ایک خاکہ ہے اور جس کی کوئی مثال تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ خود فقر و فاقہ اختیار کر کے دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا قابلِ تعریف اور شحِ نفس سے بچ جانے کی علامت ہے۔ قرآن اور احادیث میں مال خرچ نہ کرنے کے لیے دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ بخل اور شُح۔ بخل، مال میں اللہ کے عائد کیے ہوئے حقوق کو ادا نہ کرنے کا اور شح اس سے آگے بڑھ کر کنجوسی کو کہتے ہیں۔ اور جب اس لفظ کو نفس کی طرف منسوب کر کے "شح نفس" کہا جاتا ہے تو یہ تنگ نظری، تنگ دلی، کم حوصلگی اور دل کے چھوٹے پن کا ہم معنی ہو جاتا ہے جو بخل سے وسیع تر چیز ہے بلکہ خود بخل کی بھی اصل جڑ وہی ہے۔

ابوالہیاج اسدی نے کہا کہ میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص صرف یہی دعا مانگ رہے ہیں۔ اللھم قنی شُحَّ نفسی (اے اللہ مجھے میرے نفس کی تنگی اور بخل سے بچالے) میں نے کہا آپ بار بار صرف یہی دعا کیوں مانگ رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر مجھے شحِ نفس سے بچا لیا جائے تو میں نہ چوری کروں گا، نہ زنا کروں گا اور نہ اس طرح کے دوسرے گناہوں کا ارتکاب کروں گا۔ اب جو میں نے دیکھا تو وہ عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔ (ابن جریر طبری) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شحِ نفس نہ صرف بخل بلکہ بہت سی برائیوں کی جڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمام مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے۔

دوسرے کو اپنے اور اپنے اہل و عیال پر ترجیح دینے کا واقعہ

ابن جریر طبری نے تفسیر قرآن میں اور امام ترمذی نے کتاب، التفسیر میں سورۂ

الحشر کی اس آیت کے تحت یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک انصاری (غالباً ابو طلحہ انصاریؓ) ایک مہمان کو اپنے گھر لے گئے۔ ان کی بیوی نے کہا کہ کھانا بہت کم ہے اور بچوں نے بھی ابھی نہیں کھایا ہے۔ انھوں نے کہا، بچوں کو بہلا کر سُلا دو اور کھانا مہمان کے سامنے رکھو۔ جب وہ کھانا شروع کر دیں تو چراغ کو ٹھیک کرنے کے بہانے بُجھا دینا۔ ان کی بیوی نے اس پر عمل کیا۔ وہ اندھیرے میں خود بھی منہ چلاتے رہے تاکہ مہمان یہ نہ سمجھے کہ وہ تنہا کھا رہا ہے۔ مہمان نے آسودہ ہو کر کھا لیا اور پورا گھر بھوکا سویا۔

کسی سے پورا مال قبول کر لینے کا ایک مؤثر واقعہ

حضرت عمر بن الخطابؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا اور جس وقت آپؐ نے یہ حکم دیا اُس وقت میرے پاس مال کی ایک اچھی خاصی مقدار موجود تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں کبھی ابو بکرؓ سے سبقت لے جا سکوں گا تو وہ آج کا دن ہو سکتا ہے۔ یہ خیال کر کے اپنا نصف مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم نے اپنے اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑا ہے۔ میں نے کہا اسی کے برابر یعنی نصف مال اہل وعیال کے لیے باقی ہے۔ اور ابو بکرؓ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب کا سب لے آئے۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا۔ تم نے اپنے اہل وعیال کے لیے کیا باقی رکھا؟ کہا میں ان کے لیے اللہ و رسولؐ کو چھوڑ آیا ہوں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا۔ میں ابو بکرؓ سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔[1]

---

[1] یہ واقعہ امام ترمذی نے ابواب المناقب، مناقب ابو بکر الصدیق میں اور امام ابو داؤد نے کتاب الزکوٰۃ میں بیان کیا ہے۔

غالباً یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے وقت پیش آیا تھا۔ مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے اصح السیر میں بہت اختصار کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر غزوۂ تبوک کے بیان میں کیا ہے۔

تمام مال قبول نہ کرنے کا ایک واقعہ

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص انڈے کے برابر سونے کا ایک ٹکڑا لے کر آئے اور کہا یا رسولؐ اللہ میں نے اسے ایک کان (معدن) میں پایا ہے آپ اسے قبول فرمالیں یہ میری طرف سے صدقہ ہے۔ اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ آپؐ نے اعراض فرمایا اور منہ پھیر لیا۔ وہ آپؐ کے داہنے ہاتھ کی طرف آئے اور وہی بات دُہرائی۔ آپؐ نے پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہ بائیں ہاتھ کی طرف آئے اور وہی بات دُہرائی۔ آپؐ نے ...... ان سے وہ ٹکڑا لے کر زور سے ان کی طرف پھینکا۔ اگر وہ انھیں لگ جاتا تو زخمی کر دیتا۔ پھر غصے میں فرمایا۔ تم میں کا کوئی شخص اپنا سب کچھ لے کر آتا ہے کہ یہ صدقہ ہے اور پھر خود دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ یاد رکھو بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کو محتاج نہ بنادے۔[1]

اس سے ملتا جلتا واقعہ یہ ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص مسجدِ نبویؐ میں داخل ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کپڑے صدقہ کریں جب پہننے کے کپڑے آگئے تو آپؐ نے حکم دیا کہ اس شخص کو اس میں سے دو کپڑے دے

---

[1] ابوداؤد

دیئے جائیں۔ اس کے بعد پھر آپؐ نے لوگوں کو صدقے پر اُبھارا۔ اب وہی شخص جنھیں دو کپڑے دیئے گئے تھے آگے بڑھے اور ایک کپڑا بطورِ صدقہ زمین پر ڈال دیا۔ آپؐ نے بہ آوازِ بلند ڈانٹ کر فرمایا۔ تم اپنا کپڑا اٹھالو (یعنی آپؐ نے ان کا یہ صدقہ قبول نہیں کیا۔[۱]

ان واقعات سے بھی یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ فقرِ اختیاری کوئی ایسا مقام نہیں ہے جو ہر بزرگ کو حاصل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اب صدیوں سے ایسے بزرگ نظر نہیں آتے جنھیں یہ مقام حاصل ہو۔ اب تو حرص اور طمع اور اسراف و تبذیر سے اجتناب ہی ایک مشکل کام بن گیا ہے۔

زہد

لفظ زہد، عربی لغت میں قلت اور حقارت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں شیٔ زهيد ای قليل - تزاهدوا الحدا ای احتقروها ورأوه زهيدا (۱) صاحب قاموس نے زہد کے لغوی معنی ضد الرغبة (رغبت کی ضد) بتائے ہیں۔ مفردات امام راغب میں ہے کہ زہید شے قلیل کو کہتے ہیں اور زاہد فی الشی کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اس سے اعراض کرنے والا ہو اور اس میں سے قدر قلیل پر راضی رہے۔ اس کے اصطلاحی اور شرعی معنی ابو یحییٰ زکریا انصاری رحمہ اللہ نے یہ بیان کیے ہیں:

هو الاعراض بالقلب عن الدنيا وهو رأس كل طاعة لانه ضد حب الدنيا الذى هو رأس كل خطيئة (۲)	زہد دنیا سے قلبی اعراض کو کہتے ہیں اور یہ ہر طاعت کی اصل ہے کیونکہ یہ حبِ دنیا کی ضد ہے جو ہر خطا و گناہ کی جڑ ہے۔

لفظ زہد، بے رغبتی اور بیزاری کے معنی میں ایک جگہ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے:

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ (یوسف ع۲)	آخر کار انھوں نے اس کو تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا اور وہ

(۱) مجمع بحار الانوار (۲) شرح الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۶۳

ہو رہے تھے اس سے بیزار۔

صوفیہ اور علماء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ زہد کے لیے مال و اسبابِ دُنیا سے صرف قلبی اعراض اور بے رغبتی کافی ہے یا بالفعل اس کا ترک کرنا ضروری ہے اوپر شیخ الاسلام زکریا انصاری کی جو تعریف نقل کی گئی ہے وہ ان لوگوں کی رائے کے مطابق ہے جو صرف قلبی اعراض کو کافی سمجھتے ہیں اور یہی رائے کتاب وسنت کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ قرآن واحادیث میں ایک طرف دُنیا اور مال واسبابِ دُنیا کی مذمت وحقارت میں بیسیوں آیتیں اور حدیثیں موجود ہیں۔ اور دوسری طرف ان میں مال کے لیے خیر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس کی ضرورت واہمیت پر متعدد آیتیں اور حدیثیں موجود ہیں جن لوگوں نے اپنے غلبۂ حال کی وجہ سے صرف ان آیتوں اور حدیثوں کو سامنے رکھ لیا جن میں مذمت وحقارت بیان کی گئی ہے انھوں نے مطلقاً ترک مال و اسباب کو زہد کے لیے ضروری قرار دے دیا اور جن لوگوں نے دونوں طرح کی آیتوں اور حدیثوں کو اپنے سامنے رکھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ مذمت کس پہلو سے کی گئی ہے اور اس کی ضرورت واہمیت اور اس کی مدح کس پہلو سے کی گئی ہے انھوں نے زہد کے لیے صرف اعراض وبے رغبتی کو کافی سمجھا ہے۔ اس طرح تمام آیات واحادیث میں موافقت اور تطبیق پیدا ہو جاتی ہے۔ دُنیا میں انسان اس لیے نہیں بھیجا گیا ہے کہ اسے ترک کر کے گوشہ نشیں ہو جائے بلکہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اس کو اللہ کے احکام اور اس کی مرضیات میں استعمال کر کے آزمائش میں پورا اترے۔ بے شک وہ دنیا ملعون ہے جو انسان کو خدا سے غافل کرنے والی ہو اور جسے انسان اپنی زندگی کا مقصود بنالے اور اسی دنیا کی مذمّت وحقارت سے قرآن بھرا ہوا ہے کیونکہ آخرت کے مقابلے میں یہ دُنیا مچھر کے پر سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ مجھے بچپن سے ایک شعر یاد ہے اور یہ غالباً مولانا روم کا ہے

چیست دُنیا؟ از خدا غافل بدن　　　نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دنیا کیا ہے؟ خدا سے غافل ہونا، سامان اور چاندی اور زن و فرزند کا نام دنیا نہیں ہے۔

اس شعر میں اِس دُنیا کی حقیقت بتادی گئی ہے جو مذموم ہے باقی رہی وہ دُنیا جو مزرعِ آخرت (آخرت کی کھیتی) ہے اس کے مذموم و ملعون ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں یہاں چند احادیث کے ترجمے پیش کرتا ہوں جن میں صراحۃً زہد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے

(۱) ابو العباس سہل بن سعد السعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا یا رسولؐ اللہ آپ مجھے ایسا عمل بتائیں کہ جب وہ عمل کروں تو اللہ مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں۔ حضورؐ نے فرمایا دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ اللہ تم سے محبت کرے گا اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہو جاؤ لوگ تم سے محبت کریں گے (۱)

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس امت کی صلاح کی اوّلین شے یقین اور زہد ہے اور اس کے فساد کی اوّلین شے بُخل اور اَمَل ہے (۲)

یہاں اَمَل کا لفظ، قیامتِ صُغریٰ یعنی موت اور قیامتِ کبریٰ یعنی آخرت سے غفلت اور محض دُنیوی امید و آرزو کے لیے استعمال ہوا ہے، اس حدیث میں یقین کے مقابلے میں بخل اور زہد کے مقابلے میں اَمَل، استعمال کیا گیا ہے۔ جب آخرت کا یقین مغلوب اور دنیا کی محبت غالب آجاتی ہے تو انسان بخل اختیار کرتا ہے یعنی مال میں اللہ تعالیٰ نے جو حقوق مقرر کیے ہیں انھیں ادا نہیں کرتا اور جب زہد ختم ہو جاتا ہے یعنی دنیا کی طرف رغبت بڑھ جاتی ہے تو انسان طرح طرح کی امیدوں اور آرزوؤں میں

---

(۱) ریاض الصالحین بحوالہ ابن ماجہ وغیرہ (۲) مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی

الجھ جاتا ہے۔ اسی چیز کے لیے احادیث میں کہیں امل اور کہیں طولِ امل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

(۳) آپؐ نے فرمایا دُنیا میں زہد، حلال کو حرام کرنے اور مال کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ دُنیا میں زہد یہ ہے کہ تمھارے پاس جو کچھ ہو، اس پر بھروسے کے بجائے تمھیں زیادہ اعتماد اس چیز پر ہو جو اللہ کے پاس ہے (۱)

ان حدیثوں سے زہد کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ دُنیا سے بے رغبتی، بخل اور فضول امیدوں سے پرہیز اور اللہ تعالیٰ کے بے کراں خزانے پر اعتماد کا نام ہے، بالفعل ترکِ مال و اسباب زہد کے لیے ضروری نہیں ہے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دُنیا میں زہد، موٹے اور سخت کپڑے پہننے اور روکھا پھیکا کھانے کا نام نہیں ہے بلکہ دنیا میں زہد، موت اور آخرت سے غافل کرنے والی امیدوں اور آرزوؤں کو ختم کرنے کا نام ہے (۲)

یہی بات امام مالکؒ نے فرمائی ہے:

زید بن حسین کہتے ہیں کہ میں نے امام مالکؒ کو کہتے ہوئے سُنا جب کہ ان سے سوال کیا گیا تھا کہ دُنیا میں زہد کس چیز کا نام ہے انھوں نے کہا کہا کہ حلال اور پاک کمائی اور قصرِ امل یعنی دنیوی آرزو کی کمی زہد ہے (۳)

ایک اور شخص نے امام مالکؒ سے سوال کیا کہ زہد کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا التقویٰ یعنی زہد تقویٰ کا نام ہے (۴)

امام قشیریؒ نے اپنی کتاب میں صوفیہ کے اس گروہ کے اقوال بھی نقل

---

(۱) طیبی شرح مشکوٰۃ (۲) مشکوٰۃ بحوالہ شرح السنۃ (۳) ایضاً بحوالہ بیہقی (۴) احیاء العلوم ج ۴ ص ۱۴۲

کیے ہیں جو ترکِ مال و اسباب کو زہد کی حقیقت سے خارج سمجھتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ زہد کی حقیقت بیان کرنے میں ایک گروہ کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ:

"زہد صرف حرام میں ہوتا ہے اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ نے حلال کو اپنے بندوں کے لیے مباح قرار دیا ہے، جب اللہ نے اپنے کسی بندے کو مالِ حلال مرحمت فرمایا اور اس مال میں اس پر شکر کو واجب قرار دیا ہے تو جس مال کو رکھنے کی اجازت اللہ نے دی اس کو اپنے اختیار و پسند سے چھوڑ دینا کس طرح قابلِ ترجیح ہوگا" شیخ الاسلام تشریح کرتے ہیں کہ اس قول کی بنا پر مال کو ترک کرنا زہد نہیں ہے (۱)

اس مسئلے میں اشتباہ اس لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ فقر مع الصبر اور فقرائے صابرین کی مدح و ثنا میں جو احادیث آئی ہیں انھیں زہد کے باب میں نقل کر دیا جاتا ہے حالانکہ فقر اور زہد مترادف الفاظ نہیں ہیں اسی طرح دُنیا اور مال کی مذمت میں جو احادیث اور آیات ہیں انھیں بھی زہد کے باب میں نقل کر دیا جاتا ہے یہ طریقہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کثیر مال رکھتے ہوئے دُنیا سے بے رغبتی اور قلیل مال کے ساتھ دنیا کی طرف میلان اور اس کی رغبت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو پائی نہ جاتی ہو یا سمجھ میں نہ آتی ہو۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے مال کو ترک نہیں کیا تھا بلکہ خوشنودیِ رب اور اجرِ آخرت کے لیے راہِ خدا میں اسے صَرف کیا تھا اور اپنے لیے انتہائی سادہ زندگی اختیار کی تھی۔

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۶۵

تفکّر

امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء علوم الدین میں تفکّر پر اتنی تفصیل سے لکھا ہے کہ اگر اس کا صرف ترجمہ کیا جائے تو ایک مستقل پمفلٹ تیار ہو سکتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے بھی ریاض الصالحین میں "تفکر" کا ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔ عقل اور فکر ہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ اگر فکر کی قوت استعمال نہ کی جائے تو انسان نہ دُنیوی ترقی حاصل کر سکتا ہے اور نہ اُخروی۔ یہی قوت ہے جو انسان کو اللہ تک پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ و وسیلہ ہے۔ اسے استعمال کیے بغیر ذکرِ الٰہی بھی بے رُوح ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں بار بار تفکر کی ترغیب دی گئی ہے اور کہیں صراحۃً اس کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز میں بکثرت تفکر و تدبر کا حکم دیا ہے اور تفکر کرنے والوں کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے صرف آلِ عمران کے آخری رکوع کی آیت نقل کی ہے۔ امام نوویؒ نے کئی آیتیں نقل کی ہیں میں اُن آیتوں کے ترجمے یہاں پیش کرتا ہوں:

(۱) سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع کی دو آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے

بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اُٹھتے ہیں) پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے پس اے رب ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

(آیت ۱۹۰-۱۹۱)

(۲) اے نبی، ان سے کہو کہ میں تمھیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو، تمھارے صاحب میں آخر ایسی کون سی بات ہے جو جنون کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے۔

(سبا ۴۶)

(۳) بھلا کیا نظر نہیں ڈالتے اونٹوں پر کہ کیسے بنائے ہیں اور آسمانوں پر کہ کیسا اس کو بلند کیا ہے اور پہاڑوں پر کہ کیسے کھڑے کر دیئے ہیں اور زمین پر کہ کیسی صاف بچھائی ہے۔ پس تو سمجھائے جا، تیرا کام تو یہی سمجھانا ہے۔

(الغاشیہ)

(۴) پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انھیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں۔ (یوسف ۱۰۹)

ان آیتوں میں نہ صرف یہ کہ غور و فکر کی ترغیب اور اس کا حکم ہے بلکہ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس تفکر کی ترغیب دی جا رہی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ مخلوقات میں غور و فکر کر کے خالق تک رسائی حاصل کی جائے۔ اس کائنات کے مقصد تخلیق کو سمجھا جائے اور توحید، رسالت اور آخرت کی حقیقتوں کا علم حاصل کیا جائے۔ جو لوگ اس انداز میں کائنات پر غور کرتے ہیں وہ بے اختیار

پکار اٹھتے ہیں "پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے"۔ سورۂ سبا میں جس تفکر کا حکم دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ انفرادی و اجتماعی دونوں طرح ٹھنڈے دل سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور آپ کے پیغام پر غور کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان کے پیغام میں آخر جنون کی کون سی بات ہے۔

بطور دلیل احادیث پیش کرنے کے سلسلے میں امام غزالیؒ نے حضرت عطا اور عبید بن عمیرؒ کی اس حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے جس کا ذکر باب الشکر میں گزرا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گریہ و بکا کو گریۂ تشکر اور آلِ عمران کے آخری رکوع کی آیتوں میں تفکر کا نتیجہ قرار دیا ہے اور امام نوویؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے:

عن ابی یعلی شداد بن اوس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الکیس من دان نفسہ وعمل لما بعد الموت والاحمق من اتبع نفسہ ھواھا وتمنی علی اللہ) (رواہ الترمذی)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ اور موت کے بعد والی دنیا کے لیے عمل کرے اور احمق وہ ہے جو اپنی خواہشِ نفس کی پیروی اور اللہ کی مغفرت و رحمت کی تمنا کرے۔

اس قسم کی تمنا، تمنائے خام اور فریبِ نفس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

بزرگوں کے اقوال

(۱) قال الحسن: تفکر ساعۃ خیر من قیام لیلۃ (۱)

ایک گھنٹے کا تفکر ایک رات کے قیام سے بہتر ہے۔

---

(۱) احیاء العلوم ج ۴ باب التفکر بعد کے اقوال بھی اسی باب سے لیے گئے ہیں۔

(۲) قال الفضیل: الفکر مرآۃ تریك حسناتك و سیئاتك

فکر ایک آئینہ ہے جو تمھیں تمھاری نیکیاں اور برائیاں دکھا دیتا ہے۔

(۳) قیل لابراهیم انك یطیل الفکر فقال نکرۃ مخ العقل

ابراہیم نخعیؒ سے کہا گیا آپ بہت دیر تک سوچا کرتے ہیں، انھوں نے کہا کہ فکر، عقل کا مغز ہے۔

(۴) کان سفیان بن عیینہ کثیرا ما یتمثل بقول القائل

اذا المرء کانت له فکرۃ
ففی کل شئ له عبرۃ

سفیان بن عینیہ اکثر شاعر کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے: اگر انسان سوچنے کی عادت ڈالے تو ہر شے میں اس کے لیے عبرت ہے۔ اس عربی شعر کا مفہوم اردو شعر میں یہ ہو سکتا ہے:

اگر فکر انسان کے پاس ہو۔ تو ہر شے میں عبرت کا احساس ہو

(۵) قال عمر بن عبد العزیز الفکرۃ فی نعم اللہ عز و جل من افضل العبادۃ

عمر بن عبد العزیز نے کہا کہ اللہ عز و جل کی نعمتوں میں غور و فکر بہترین عبادت ہے۔

(۶) قال عبد اللہ بن المبارك یوما لسھل بن علی و رآہ ساکتا متفکرا این بلغت؟ قال الصراۃ

عبد اللہ بن مبارک نے ایک دن سہل بن علی کو خاموش اور متفکر دیکھ کر پوچھا کہاں تک پہنچے؟ انھوں نے کہا پل صراط تک۔

(۷) قال ابو سلیمان عودوا اعینکم البکاء و قلوبکم التفکر

ابو سلیمان نے کہا کہ اپنی آنکھوں کو گریہ کا اور اپنے دلوں کو تفکر کا عادی بناؤ۔

(۸) ”ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ خیر میں غور و فکر اس پر عمل کا داعی ہوتا ہے اور شر پر ندامت اس کے ترک پر آمادہ کرتی ہے۔“

(۹) ابن شریح کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں بیٹھ گئے، چادر اپنے چہرے

پر ڈال لی اور رونے لگے۔ ہم نے پوچھا آپ کیوں رونے لگے انھوں نے کہا، یہ سوچ کر کہ میری عمر گزری جارہی ہے، میرا عمل کم ہے اور میری موت قریب ہے۔"

فکر کی حقیقت اور اس کا ثمرہ

فکر کے معنی یہ ہیں کہ قلب و دماغ میں دو معرفتیں مستحضر کی جائیں تاکہ ان سے ایک تیسری معرفت پیدا ہو۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھنا چاہیے کہ کوئی شخص دنیا کی طرف مائل اور حیاتِ دنیا کو ترجیح دے رہا ہو لیکن چاہتا یہ ہو کہ اسے یہ معرفت حاصل ہو جائے کہ دنیا کے مقابلے میں آخرت قابلِ ترجیح ہے، اس کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ کسی سے یہ سُنے کہ آخرت قابلِ ترجیح ہے، یہ سُن کر وہ اس کی بات مان لے اور اس کی تصدیق کرے اور بغیر کسی بصیرت کے مجرد اس کے قول پر اعتماد کر کے آخرت کی طرف مائل ہو جائے اور اپنے عمل کو اسی کے مطابق بنالے، یہ درحقیقت، تقلید ہوگی معرفت نہیں ہوگی، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ بطورِ خود یہ جانے اور سمجھے کہ جو چیز دائمی اور باقی رہنے والی ہو وہ عارضی اور فانی کے مقابلے میں زیادہ قابلِ ترجیح ہوگی اور یہ بات اپنے ذہن میں مستحضر کرے کہ آخرت دائمی اور پائندہ تر ہے، ان دو معرفتوں سے تیسری معرفت یہ حاصل ہوگی کہ آخرت زیادہ قابلِ ترجیح ہے اس کے مقابلے میں عارضی اور فانی دنیا کو ترجیح نہیں دی جاسکتی، اسی تیسری معرفت کو تفکر، تامل اور تدبر کہتے ہیں۔

علوم، احوال اور اعمال سب اسی تفکر کے ثمرات ہیں۔ اس کا خاص ثمرہ علم ہے لیکن یہ علم جب قلب کو حاصل ہوتا ہے تو اس کی حالت بدل جاتی ہے اور جب دل کا حال بدل جاتا ہے تو اعضاء و جوارح کے اعمال بدل جاتے ہیں، ان علمی مقدمات سے معلوم ہوا کہ عمل، حال کا تابع ہے اور حال، علم کا تابع ہے اور علم، فکر کا تابع ہے لہٰذا یہ

فکر ہی تمام حسنات وخیرات کا مبدء اور اس کی کلید ہے۔ فکر کی اس حقیقت سے اندازہ لگاؤ کہ اسے فضیلت کا کتنا اونچا مقام حاصل ہے، اسی پہلو سے فکر کو ذکر پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایک گھنٹے کا تفکر، ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے کیونکہ یہی چیز انسان کو مکروہات سے مرغوبات کی طرف، اور حرصِ دنیا سے زہد و قناعت کی طرف کھینچ لاتی ہے اور اسی سے مشاہدہ اور تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

فکر کے میدان

فکر کی جولانی کے لیے کوئی ایک ہی میدان نہیں ہے بلکہ یہ بے شمار میدانوں میں دوڑتی اور بے شمار علوم حاصل کرتی ہے اور پھر ان سے اعمال کی شکل میں بے شمار ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں ہم چند میدانوں کی ایک فہرست دیتے ہیں ان میں ہر میدان ایک مستقل نوع ہے جس کے تحت بیسوں فصلیں داخل ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں تفکر (۲) اللہ کی صفات میں تفکر (۳) معاصی میں تفکر (۴) طاعات میں تفکر (۵) مہلکات یعنی ہلاک کرنے والے گناہوں میں تفکر (۶) منجیات یعنی نجات دینے والی نیکیوں میں تفکر۔

تفکر کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ معاصی میں تفکر کرنا ہے۔ اس میں اجمالی تفکر یہ ہوگا کہ ہر معصیت کے بارے میں یہ سوچا جائے کہ اسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے، اور پھر ان سزاؤں کو بھی ذہن میں حاضر کیا جائے جن کی وعید قرآن اور احادیث میں سنائی گئی ہے، ساتھ ہی یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جو چیز ہمارے آقائے ولی نعمت ہمارے معبود و محبوب کو ناپسند ہے وہ ہمیں بھی ناپسند ہونی چاہیے۔ اس کے بعد سوچنے والا شخص اپنے حال پر غور کرے، اگر وہ کسی معصیت میں مبتلا ہے تو فوراً اسے ترک کرے، نادم ہو اور استغفار کرے اور اگر آئندہ مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس سے بچنے کی تدابیر سوچے۔ معاصی میں تفصیلی تفکر یہ ہوگا کہ ہر ہر عضو کے گناہوں پر الگ الگ غور کرے مثلاً

زبان ہے جو ذیل کے گناہوں کا ارتکاب کرتی ہے۔ غیبت۔ اتہام۔ جھوٹ۔ اپنی تعریف و توصیف۔ دوسروں کے ساتھ استہزا اور تحقیر۔ گالی گلوچ اور جھگڑا فساد۔ ہر مسلمان کو سوچنا چاہیے کہ وہ ان گناہوں میں سے کسی ایک یا چند میں مبتلا تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو اسے فوراً ترک کرنا اور استغفار کرنا چاہیے اور کیے ہوئے گناہ کی تلافی کا اہتمام کرنا چاہیے اور اگر آئندہ پھر اس میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس سے بچنے کی تدابیر پر عمل کرنا چاہیے، ایک تدبیر یہ ہے کہ خاموشی اپنے اوپر لازم کرلے یا اپنے منہ میں کنکریاں بھرلے یا پتھر کا کوئی ٹکڑا رکھ لے تاکہ اسے اپنی زبان درازی یاد رہے۔ دوسری تدبیر یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرے جو ان گناہوں پر اسے ٹوک دیں اور جن کی مجلس میں زبان کے ان گناہوں کا ارتکاب نہ ہوتا ہو اور بعض حالات میں یہ تیسری تدبیر بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ ناگزیر ضرورتوں کے علاوہ کچھ دنوں کے لیے تنہائی کی زندگی بسر کرے اور اس میں اللہ کی عبادت اور نیکی کے کاموں میں مشغول رہے اور دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ان گناہوں سے محفوظ رکھے۔

امام غزالیؒ نے ایک اور مثال پیٹ کے گناہ کی دی ہے، انسان اپنے پیٹ میں جو کچھ بطور غذا یا دوا داخل کرتا ہے اسے دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں وہ حرام یا مشتبہ تو نہیں ہے اگر اس کی کمائی حرام یا مشتبہ ہو تو اسے حلال ذریعے سے رزق حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے:

ان العبادات کلھا ضائعۃ مع اکل الحرام وان اکل الحلال اساس العبادات کلھا (۱)	حرام خوری کے ساتھ تمام عبادتیں ضائع ہو جاتی ہیں اور اکلِ حلال تمام عبادات کی بنیاد ہے۔

---

(۱) احیاء العلوم ج ۴ باب التفکر

مسلمان کو خود سوچنا چاہیے کہ اللہ کی جو عبادت اسے حرام خوری جیسے بڑے گناہ سے بھی نہیں روک رہی ہے وہ فی الواقع عبادت ہے بھی یا نہیں؟ اوپر امام غزالیؒ کی عبارت کا منشا یہ نہیں ہے کہ جس مسلمان کا ذریعۂ معاش حرام ہو وہ اللہ کی عبادت ترک کر دے بلکہ یہ ہے کہ حرام ذریعۂ معاش کو ترک کر کے عبادت کو حقیقی عبادت بنائے۔

مراقبہ

مراقبہ، لغت میں نگرانی اور حفاظت کو کہتے ہیں اور تصوف کی اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ بندے کو ہر وقت اپنی تمام حرکات و سکنات میں اس بات کا شعور رہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اور اس کا کوئی عمل اور کوئی حرکت اس کی نگرانی سے باہر نہیں ہے۔ عام طور سے لوگ گردن جھکا کر اور آنکھیں بند کر کے بیٹھنے کو مراقبہ سمجھتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ مراقبہ ایک قلبی عمل ہے جو ہر وقت جاری رہتا ہے اور جاری رہنا چاہیے۔ یہ حقیقت کہ اللہ ہر حرکت کی نگرانی کر رہا ہے مسلمانوں کا مسلّمہ عقیدہ ہے اور اس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہے، قرآن مجید میں بہت سی آیتوں میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے۔ امام نوویؒ نے ۵ آیتوں کے حوالے دیئے ہیں، امام غزالیؒ نے تین مزید آیتیں نقل کی ہیں اور امام قشیریؒ نے عام دستور کے مطابق صرف ایک آیت پر اکتفا کیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ رَّقِيْبًا ۝ — اللہ ہر چیز پر نگراں ہے

(الاحزاب ع ۶)

شیخ الاسلام نے اس آیت کا اضافہ کیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ — یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے

(النساء ع ۱)

امام غزالیؒ نے قرآن کے دو ٹکڑے نقل کیے ہیں:

(۱) اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ (الرعد ع ۵) — پھر کیا وہ جو ایک ایک متنفس کی کمائی پر نظر رکھتا ہے

(۲) اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى (العلق) — یہ نہ جانا کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے

(۳) وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ (المعارج ع ۱) — اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں اور جو اپنی گواہیوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں

امام نوویؒ نے ذیل کی آیتیں نقل کی ہیں:

(۱) وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝ (الشعراء ع ۱۱) — اور اس زبردست اور رحیم پر توکل کرو جو اس وقت تمھیں دیکھ رہا ہوتا ہے جب تم اٹھتے ہو اور سجدہ گزار لوگوں میں تمھاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے

(۲) وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید ع ۱) — اور وہ تمھارے ساتھ رہتا ہے خواہ تم لوگ کہیں بھی ہو۔

(۳) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (آل عمران ع ۱) — زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے

(۴) اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (الفجر) — بے شک تیرا رب گھات میں لگا ہوا ہے

(۵) يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (المومن ع ۲) — اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں

ان آیتوں سے ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم، آنکھوں کی چوری اور دلوں کے ارادے، خیالات اور جذبات سب پر حاوی ہے اور دوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نیک بندے اپنی امانتوں، اور شہادتوں کی پوری رعایت، حفاظت اور نگرانی کرتے ہیں۔

احادیث بہت سی حدیثیں عمل مراقبہ کا ماخذ ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے سب سے پہلے حدیث جبرئیلؑ کا احسان سے متعلق یہ ٹکڑا نقل کیا ہے:۔

(۱) قال فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (مسلم شریف)

جبرئیلؑ نے کہا مجھے بتلائیے کہ احسان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ کی بندگی اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ ضرور تم کو دیکھ رہا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں اور یہ تصوف کا بہت بڑا ماخذ ہے۔ اس میں ملاحظہ و مراقبہ کا جو عمل بتایا گیا ہے اگر مخلصانہ اس کی تعمیل کی جائے تو مومن قرب و رضائے الٰہی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے۔

(۲) حضرت ابوذر اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، اللہ سے ڈرو تم جہاں کہیں بھی ہو، برائی کے بعد نیکی کرو (برائی کے بعد سب سے مقدم نیکی توبہ ہے) وہ اسے محو کر دے گی اور لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق کے ساتھ زندگی بسر کرو (ترمذی)

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں سواری پر حضورؐ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا تو آپؐ نے فرمایا اے لڑکے، میں تمھیں چند باتوں کی تعلیم دیتا ہوں۔ تم اللہ کے حق کی نگرانی

کرو اور فکر مندی کے ساتھ اس کی رضا طلب کرتے رہو۔ تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے یعنی وہ اس کے صلے میں دُنیا اور آخرت کی سختیوں اور مشقتوں سے تمھاری حفاظت کرے گا اور جب تم مانگو تو اللہ سے مانگو اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے طلب کرو اور یقین رکھو کہ تمام اُمّت جمع ہو کر تمھیں کچھ نفع پہنچانا چاہے تو وہ تمھیں صرف وہی نفع پہنچا سکتی ہے جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے اور وہ جمع ہو کر تمھیں کچھ نقصان پہنچانا چاہے تو صرف وہی نقصان پہنچا سکتی ہے جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے، قلم لکھ کر اٹھائے جا چکے اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں (ترمذی)

حدیث نمبر ۲ کا پہلا ٹکڑا "اللہ سے ڈرو تم جہاں کہیں بھی ہو" مراقبے کا ماخذ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں پوری طرح شعور رہنا چاہیے کہ ہر جگہ اللہ کی آنکھ تمھیں دیکھ رہی ہے۔ حدیث نمبر ۳ میں بھی تعلیم کا پہلا جزء مراقبے کا ماخذ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی جگہ خدا کو غائب نہ پاؤ گے اگر تم اس کے حق کی نگرانی کر رہے ہو تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے اور اس کا صلہ تمھیں ضرور دے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کی اس حدیث کے بارے میں سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے فتوح الغیب میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس لائق ہے کہ ہر مومن اس کو اپنے دل کے لیے آئینہ بنا لے تاکہ اس حدیث کے مضمون میں دل کی اچھائی بُرائی اور درستی و نادرستی کا ملاحظہ کرتا رہے، اس حدیث پر مخلصانہ عمل سے اسے دُنیا و آخرت میں سلامتی اور عزت حاصل ہوگی۔

مراقبہ کے بارے میں صوفیہ کے اقوال

صوفیۂ کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے عملِ مراقبہ کو وہی اہمیت دی

ہے جو دین میں اسے حاصل ہے بلکہ بعضوں نے تو بجا طور پر اس کو تصوف کی اصل قرار دیا ہے۔

(۱) جُریری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارا معاملہ (علم تصوف) دو اصلوں پر مبنی ہے ایک یہ کہ تم اپنے اوپر یہ لازم کر لو کہ تمام حرکات و کیفیات میں اس کا لحاظ اور شعور رکھو گے کہ اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے اور دوسری یہ کہ تمھارے ظاہری اعمال و احوال پر شریعت کا علم حاوی ہو یعنی وہ شریعت کی ترازو میں تُلے ہوئے ہوں (۱)

(۲) ابن عطا سے پوچھا گیا طاعات میں سب سے افضل طاعت کونسی ہے؟ انھوں نے کہا، ہر وقت حق تعالیٰ کا مراقبہ سب سے افضل طاعت ہے۔(۲)

(۳) ابو نعمان مغربی کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو حفص نے کہا کہ جب تم لوگوں کو نصیحت کرنے کے لیے بیٹھو تو اپنے قلب اور اپنے نفس کو نصیحت کرو تاکہ لوگوں کو اس میں نفع ہو کیونکہ جب تمھاری نیت خالص ہوگی اور اصل مخاطب تمھاری اپنی ذات ہوگی تو بات دل سے نکلے گی اور دل سے نکلی ہوئی بات مؤثر ہوتی ہے، تمھیں یہ دھوکا نہ ہو کہ لوگ تمھارا وعظ سننے کے لیے تمھارے پاس جمع ہو گئے ہیں کیونکہ وہ تمھارے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور اللہ تمھارے دل کا رقیب (نگراں) ہے (۳)

واعظین کے لیے یہ کتنی اچھی تعلیم ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب عموماً علماء اور صوفیہ کے وعظ و پند کیوں بے اثر ہو گئے ہیں، اصل یہ ہے کہ "ہر چہ از دل خیزد" والی بات غائب ہے تو پھر "بر دل ریزد" کا ظہور کیوں کر ہو۔

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ مع الشرح ج ۳ ص ۹۷ (۲) ایضاً (۳) ایضاً

دو واقعات

(۱) روایت ہے کہ ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سفر میں تھے، انھوں نے ایک جگہ ایک نوجوان لڑکے کو بکریاں چراتے دیکھا، وہ اتنی اچھی طرح بکریوں کی نگرانی کر رہا تھا کہ انھیں تعجب ہوا، انھوں نے جانچنا چاہا کہ اس کا باطن بھی اس کے ظاہر کے مطابق ہے یا نہیں؟ یعنی یہ عمدہ نگرانی محض عادۃً ہے یا اس کا تعلق دین سے ہے۔ انھوں نے اس سے کہا، تم اس ریوڑ میں سے کیا ایک بکری میرے ہاتھ بیچتے ہو؟ اس نے کہا یہ میری بکریاں نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا، ان بکریوں کے مالک سے کہہ دینا کہ ایک بکری بھیڑیا اٹھا لے گیا۔ یہ سن کر اس لڑکے نے کہا فَاَیْنَ اللّٰہِ! جناب، اللہ کہاں غائب ہو گیا؟ حضرت ابن عمرؓ اس جواب سے اتنے خوش اور متاثر ہوئے کہ ایک مدت تک لوگوں سے اس کا ذکر کرتے رہے اور اس کا جملہ "فاین اللہ" دُہراتے رہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے اس کے مالک سے وہ غلام اور ریوڑ خرید لیا، غلام کو آزاد کر دیا اور اسے اس ریوڑ کا مالک بنا دیا (۱)

(۲) بعض مشائخ کے چند شاگرد تھے وہ ان میں سے ایک کی طرف زیادہ توجہ دیتے، دوسرے شاگردوں نے ان سے شکایت کی اور اس مزید شفقت و توجہ کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے کہا آئندہ میں تمھیں اس کا سبب بتاؤں گا۔ پھر ایک دن انھوں نے چند پرندے منگائے اور ہر شاگرد کو ایک پرندہ دے کر کہا وہ اسے ایسی جگہ ذبح کر کے لے

---

(۱) ایضاً

آؤ جہاں کوئی دوسرا اسے نہ دیکھ رہا ہو، تمام شاگرد اپنا اپنا پرندہ ذبح کر کے لے آئے لیکن وہ شاگرد اپنا پرندہ زندہ واپس لایا۔ انھوں نے دوسرے تمام شاگردوں کے سامنے اس سے پوچھا، تم نے کیوں ذبح نہیں کیا اس نے کہا آپ نے حکم دیا تھا کہ میں ایسی جگہ ذبح کروں جہاں کوئی دوسرا نہ دیکھ رہا ہو، میں نے ایسی کوئی جگہ نہ پائی۔ کیونکہ ہر جگہ اللہ دیکھ رہا تھا۔ اب انھوں نے دوسرے شاگردوں سے کہا کہ اس شاگرد کی طرف خاص توجہ کا سبب یہی ہے (۱)

---

(۱) ایضاً

محاسبہ

دینی اور شرعی اصطلاح میں محاسبہ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے کیے ہوئے اعمال کا جائزہ اور سختی کے ساتھ ان کا حساب لے، یہ حساب اعمال کی کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے لینا ضروری ہے۔ کمیت کے معنی یہ ہیں کہ اس پر کتنے کاموں کی ذمہ داری تھی اور اس نے کتنے کام انجام دیئے اور کیفیت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح انھیں انجام دینا چاہیے تھا اسی طرح انجام دیئے ہیں یا کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ یہ جائزہ اور محاسبہ روزانہ ہونا چاہیے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے شریکِ تجارت سے حساب لینے کی مثال سامنے رکھ کر محاسبۂ نفس کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہم یہاں اس کی تلخیص پیش کرتے ہیں:

"اللہ کے بندوں کو دن کے آخری کسی حصے میں اپنے ان اعمال اور حرکات وسکنات کا نفس، سے حساب لینا چاہیے جو دن بھر میں انھوں نے کیے ہیں جس طرح دنیا کی تجارت میں، تاجر لوگ اپنے شرکاءِ تجارت سے حساب لیتے ہیں خواہ وہ سال کے اخیر میں حساب کتاب کرتے ہوں یا ہر ماہ یا ہر روز۔ وہ یہ حساب اس اندیشے سے لیتے ہیں کہ کہیں شرکاءِ تجارت انھیں نقصان نہ پہنچا دیں اور دوسرا محرک یہ ہوتا ہے کہ اپنے نفع کا اندازہ

ہوتا رہے۔ جب اس فانی اور عارضی دنیا کے نفع ونقصان کا حساب
ضروری سمجھا جاتا ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ عاقل انسان
اس حساب سے جان چرائے جس کے نفع ونقصان سے اس کی ابدی
سعادت یا بدبختی وابستہ ہے، کسی شریکِ تجارت سے محاسبہ کے
معنی یہ ہیں کہ راس المال یعنی اصل پونجی اور پھر تجارت میں نفع ونقصان
کا جائزہ لیا جائے۔ اگر نفع ہوا ہو تو شریک سے نفع وصول کیا جائے اور
اس کا شکریہ ادا کیا جائے اور اگر نقصان ہوا ہو تو شریک کو تاوان ادا
کرنے پر مجبور کیا جائے اور آئندہ کے لیے تلافیٔ مافات کا مطالبہ کیا جائے۔
اس مثال کو سامنے رکھ کر سمجھو کہ دین میں بندۂ خدا کا راس المال فرائض
ہیں اور نوافل وفرائض کی حیثیت نفع کی اور معصیت ونافرمانی کی حیثیت
نقصان کی ہے۔ پورا دن اس تجارت کا زمانہ یا موسم ہے اور خود اس کا
اپنا نفس اس کا وہ شریک ہے جس سے حساب لینا ہے۔ سب سے
پہلے فرائض کا حساب لینا چاہیے۔ اگر تمام فرائض اس نے ٹھیک ٹھیک
ادا کیے ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور نفس کو ترغیب دینی چاہیے
کہ اسی طرح وہ آئندہ بھی ادا کرتا رہے، اگر کوئی فرض چھوٹ گیا ہو تو اس
سے قضا کا مطالبہ کرنا چاہیے اور اگر کسی فرض کو ناقص طور پر ادا کیا ہو
تو اس کو مکلف بنانا چاہیے کہ نوافل سے اس کمی کو پورا کرے اور اگر اس
سے کوئی معصیت ہو گئی ہو تو صرف ملامت پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ اس
کی تلافی پر اس کو مجبور کرنا چاہیے جس طرح انسان نقصان کی صورت میں
شریک کو تاوان ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور جس طرح تجارت میں دمڑی
اور چھدام تک کا حساب کیا جاتا ہے اسی طرح یہاں بھی تمام جزئیات

اور چھوٹی چھوٹی باتوں کا حساب لینا چاہیے تاکہ نفس آئندہ کے لیے چوکنا رہے اور غفلت نہ کرے۔ اس حساب میں انسان کو میدانِ حشر کا نقشہ سامنے رکھنا چاہیے اور وہاں کے نفسی نفسی کا عالم اس کے روبرو ہونا چاہیے۔ دن بھر کے تمام اعمال، حرکات و سکنات، نشست و برخاست، سکوت اور گفتگو غرض جو کچھ بھی اس نے کیا ہو سب کا حساب اور جائزہ ضروری ہے (۱)

قرآن میں محاسبے کا حکم

امام غزالی رحمہ اللہ نے سورۂ الحشر کے آخری رکوع کی یہ آیت نقل کی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور ہر متنفس کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کل (قیامت) کے لیے کیا بھیجتا ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

یہ دیکھنا اور اس پر غور کرنا کہ انسان نے کل قیامت کے لیے کیا بھیجا ہے اور کیا بھیج رہا ہے، محاسبۂ نفس ہے، اس محاسبے سے پہلے بھی تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے اور بعد کو بھی، پہلے حکم کا اشارہ اس طرف ہے کہ جب تک انسان کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہو وہ محاسبۂ نفس پر آمادہ ہی کب ہوگا؟ اگر خدانخواستہ دل، خوفِ خدا اور محاسبۂ آخرت سے خالی ہو تو محاسبۂ نفس کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ محاسبے کے بعد تقویٰ کے حکم کا اشارہ اس طرف ہے کہ محاسبہ اللہ سے ڈرتے ہوئے کرنا چاہیے ورنہ انسان کا نفس اتنا بڑا مکار ہے کہ طرح طرح کے بہانے اور عذر تراش کر انسان کو مطمئن کرنے

---

(۱) احیاء العلوم ج ۴ ص ۲۵۳

.... کی کوشش کرتا ہے۔ امام موصوف نے دوسری آیت یہ پیش کی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ۝

(الاعراف ع ۲۴)

جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال اگر انھیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریقۂ کار کیا ہے۔

"چوکنا ہو جانا" محاسبۂ نفس ہی کا اثر ہے۔

محاسبۂ نفس کا ذکر احادیث و آثار میں

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے اور عاجز وہ ہے جو اپنی خواہش نفس کے پیچھے چلے اور اللہ پر تمنا کرے (۱)

(۲) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ازالۃ الخفا میں ابوبکر بن شیبہ، ابو طالب مکی، شہاب الدین سہروردی اور ایک جماعت کے حوالے سے جس میں امام غزالی بھی داخل ہیں حضرت فاروقِ اعظمؓ کا قول محاسبۂ نفس کے بارے میں نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

اس سے پہلے کہ قیامت میں تمھارا حساب کیا جائے اپنے نفس سے محاسبہ کرو اور اس سے پہلے کہ میزانِ حشر میں تمھارے اعمال تولے جائیں یہاں دُنیا میں اپنے اعمال کو تولو اور اللہ کے سامنے اس بڑی پیشی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم خدا کے سامنے پیش کیے جاؤ گے، اور تمھاری کوئی چیز مخفی نہیں

---

(۱) ریاض الصالحین

رہے گی (۱)

کوتاہیوں کا کفارہ

بعض صحیح حدیثوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عہدِ رسالت میں صحابۂ کرامؓ نے اپنی کوتاہیوں کا کفارہ بطورِ خود ادا کیا ہے۔ یہ کفارہ مالی بھی ہوتا تھا اور بدنی بھی، مالی کفارہ کے معنی یہ ہیں کہ اپنا مال صدقہ کر کے کوتاہیوں کی تلافی کی جائے، اور بدنی کفارے کے معنی یہ ہیں کہ تنبیہ کے لیے جسم کو ایسی سزا دی جائے جو حدودِ شرع کے اندر ہو یا بطورِ تلافی کوئی مزید بدنی عبادت وطاعت اپنے اوپر لازم کی جائے۔ صحابہؓ اور دوسرے بزرگوں کے سوانح حیات میں اس طرح کے کفاروں کا ذکر ملتا ہے۔ عقلاً بھی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ انسانی نفس کی مثال سرکش گھوڑے کی ہے، اس کے منہ میں جب تک خاردار لگام نہ ڈالی جائے وہ بمشکل سیدھا ہوتا ہے۔

(۱) حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ایک دن ابو طلحہؓ اپنے ایک باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتنے میں ایک پرندہ اڑا اور باغ سے نکلنے کی جگہ تلاش کرنے لگا، باغ اتنا گھنا تھا کہ اسے نکلنے کی جگہ نظر نہیں آرہی تھی ابو طلحہ کو یہ منظر بہت اچھا لگا اور وہ تھوڑی دیر تک پرندے کو اِدھر اُدھر پرواز کرتے دیکھتے رہے پھر جب وہ اپنی نماز کی طرف متوجہ ہوئے تو یہ بھول چکے تھے کہ انھوں نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔ اب انھیں احساس ہوا کہ وہ اپنے باغ کی وجہ سے ایک فتنے میں مبتلا ہو گئے، نماز سے فارغ ہو کر وہ نبی صلی اللہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اس کے بعد کہا، یا رسول اللہ

---

(۱) ازالۃ الخفاج ۳

وہ باغ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے، آپ جہاں چاہیں اسے صرف فرمائیں۔[1]

(۲) **قبیلۂ انصار کے ایک اور شخص کا واقعہ**

کھجور کے درختوں میں پھل آنے کا زمانہ تھا اور مدینے کی وادیوں میں سے ایک وادی قُف ہے اس میں قبیلۂ انصار کے ایک شخص کا باغ تھا۔ ایک دن وہ اس باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کی نظر کھجور کے درختوں پر پڑی، درخت کھجوروں سے لدے ہوئے تھے اور ایسا نظر آتا تھا کہ انھیں پھلوں کے طوق پہنا دیئے گئے ہیں۔ اس منظر سے ان کا دل بہت خوش ہوا۔ اب جو نماز کی طرف متوجہ ہوئے تو رکعتیں بھول چکے تھے۔ انھوں نے دل میں کہا کہ میرے اس مال نے مجھے فتنے میں مبتلا کر دیا۔ وہ حضرت عثمانؓ بن عفان کے پاس گئے جو اس زمانے میں خلیفہ تھے۔ انھوں نے واقعہ سنایا اور کہا کہ وہ باغ صدقہ ہے آپ اسے خیر و صلاح کے کاموں میں صرف فرمائیں، حضرت عثمانؓ بن عفان نے اس کو پچاس ہزار میں فروخت کیا اس کے بعد اس باغ کا نام ہی خمسین الف (پچاس ہزار) پڑ گیا (۲)

اب میں احیاء العلوم ج ۴ ص ۲۵۵ سے چند مزید واقعات کے ترجمے پیش کرتا ہوں

(۳) ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز عصر کی جماعت فوت ہوگئی اس کے کفارے میں انھوں نے اپنی ایک بہت قیمتی زمین صدقہ کر دی۔

(۴) ہر شب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے قدموں پر دُرّہ مارتے اور کہتے کہ آج

---

(۱) موطا امام مالک باب سیرۃ جمع من الصحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین

(۲) موطا مالک باب ترک مایشغلہ عن ذکر اللہ

دن بھر تم نے کون سے کام انجام دیئے ہیں

(۵) اگر کبھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی نمازِ عشاء کی جماعت چھوٹ جاتی تو وہ رات بھر عبادت کرتے رہتے

(۶) ایک بار حضرت ابن عمرؓ اتنی دیر میں نمازِ مغرب ادا کر سکے کہ ستارے نکل آئے تھے اس کے کفارے میں انھوں نے دو۲ غلام آزاد کیے

(۷) عبداللہ بن قیس کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوے میں تھے، جب دشمن کی فوج سامنے آئی تو مقابلے کا اعلان کیا گیا۔ اس دن تیز و تند ہوا چل رہی تھی، میرے سامنے ایک شخص تھے جو اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے، اے میرے نفس کیا فلاں غزوے کے موقع پر میں حاضر نہ تھا اور کیا تو نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ اپنے اہل و عیال کا خیال کرو، میں نے تیری اطاعت کی، جنگ میں شریک نہیں ہوا اور واپس چلا گیا۔ پھر یاد کر ایک دوسرے غزوے کے موقع پر بھی کیا یہی واقعہ پیش نہیں آیا تھا؟ میں اس دفعہ بھی تیرے بہلاوے میں آگیا تھا، یاد رکھ آج میں تجھے اللہ کے سامنے پیش کروں گا یا تو وہ تجھے قبول کرلے یا نہ قبول کرے۔ عبداللہ بن قیس کہتے ہیں کہ یہ بات چیت سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ آج میں اس شخص کی نگرانی کروں گا۔ دیکھوں یہ کیا کرتا ہے — ہماری فوج کے لوگوں نے دشمنوں پر حملہ کیا اور وہ شخص ان کی صفِ اول میں تھا، پھر دشمنوں نے اسلامی فوج پر حملہ کیا اور تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن وہ شخص اپنی جگہ جما رہا اور لڑتا رہا، کئی بار اس طرح ہوا کہ دشمنوں نے حملہ کیا، لوگ پیچھے ہٹے اور وہ اپنی جگہ جما رہا اور لڑتا رہا۔ خدا کی قسم وہ جم کر لڑتا رہا یہاں تک کہ میں نے دیکھا وہ شہید

ہو کر گر گیا، میں نے اس کے جسم اور اس کے گھوڑے پر زخموں کے نشان شمار کیے تو صرف نیزے کے ساٹھ بلکہ اس سے زیادہ زخم شمار میں آئے۔

(۸) حضرت تمیم داری کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار ان کی تہجد کی نماز قضا ہو گئی تو وہ سال بھر تک زیادہ جاگ کر اس کی تلافی کرتے رہے۔

مُجاہدہ

مجاہدہ اور جہاد کے لغوی معنی ہیں پوری محنت و مشقت کے ساتھ کوشش کرنا، اس کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کے لیے محنت و مشقت کے ساتھ ایسے اعمال اختیار کیے جائیں جن سے بُرے اخلاق دُور ہوں اور اچھے اخلاق حاصل ہوں۔ چونکہ اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی بُرے اخلاق و کردار کے ازالے اور اچھے اخلاق و کردار کے حُصول پر موقوف ہے اس لیے مجاہدہ شرعًا مطلوب ہے اور اسی لیے اسلامی تصوّف میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ رسالہ قشیریہ میں باب توبہ کے بعد مجاہدے ہی کا باب ہے۔ اس ترتیب کا اشارہ غالبًا اس طرف ہے کہ توبہ پر استقامت مجاہدے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ امام قشیری نے مجاہدے کے شرعًا مطلوب ہونے پر ایک آیت اور ایک حدیث پیش کی ہے۔ آیت سورہ العنکبوت کی آخری آیت ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ع	جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقینًا اللہ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ مظہری میں لکھا ہے کہ "وَالَّذِيْنَ

جَاهَدُوْا" سے مُراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفار سے محاربہ اور نفس کی مخالفت میں اپنی پوری قوت صَرف کر دی ہو اور "فِیْنَا" سے مُراد یہ ہے کہ اللہ کی مرضیات کے حصول، اس کے دین کی نصرت و حمایت، اس کے اوامر کی تعمیل اور اس کے نواہی سے اجتناب میں مجاہدہ کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی "صوفی" کفار سے محاربہ اور دین اللہ کی نصرت و حمایت کو اپنے مجاہدے سے خارج کر دے تو اس کا مجاہدہ ناقص ہو گا بلکہ بعض حالات میں اس کی کوششوں پر "مجاہدہ" کا اطلاق ہی صحیح نہ ہو گا۔ "لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" کی تفسیر میں انھوں نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں، حضرت سہل بن عبداللہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ "جو لوگ اقامتِ سُنّت میں کوشش کریں گے ہم انھیں جنّت کے راستے دکھائیں گے" "وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دُنیا میں مجاہدین کی مدد کرے گا اور آخرت میں انھیں ثواب اور مغفرت عطا فرمائے گا۔

بطورِ دلیل جو حدیث امام قشیری نے پیش کی ہے وہ یہ ہے:

عَنْ ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن افضل الجہاد فقال کلمۃ عدل عند سلطان جائر فدمعت عینا ابی سعید (۱)	ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل جہاد کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا انصاف کا کلمہ جو ظالم اقتدار کے سامنے کہا جائے یہ سُن کر حضرت ابو سعیدؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۲۴

تصوف کی کتاب میں بطور دلیل اس حدیث کو پیش کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تصوف میں مجاہدے کی نوعیت کیا ہے؟ خواہ اب کوئی صوفی وقت اس کو سمجھے یا نہ سمجھے اور اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ امام قشیری نے اصل اور بنیادی مجاہدے پر جو کچھ لکھا ہے ہم ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

"اچھی طرح جان لو کہ اصل مجاہدہ یہ ہے کہ نفس کو اس کی خواہشات سے محروم کر دیا جائے، خواہشاتِ نفس کے خلاف عمل کیا جائے نفس میں دو صفتیں ایسی ہیں جو اسے خیر سے روک دیتی ہیں، خواہشات و شہوات میں انہماک اور طاعات سے امتناع و انحراف، لہذا جب وہ کسی ممنوع و مکروہ کے ارتکاب کے لیے سرکشی دکھائے تو اس کے منہ میں تقویٰ کی خاردار لگام ڈال دینی چاہیے اور جب وہ کسی عملِ خیر کی طرف بڑھنے سے رکے تو اس کی خواہش کے خلاف ایڑ لگا کر اسے بڑھنے پر مجبور کرنا چاہیے اور اگر کبھی وہ اپنی بے قدری اور تذلیل کے احساس کی وجہ سے غضب ناک ہو تو حسنِ خُلق سے اُس کے غصّے کی قوت کو توڑ دینا اور نرمی و ملاطفت سے اس کی آگ کو بجھا دینا چاہیے اور اگر کبھی وہ خود پسندی کی وجہ سے اپنے فضائل و مناقب ظاہر کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ اس کی خواہش کو کچل دیا جائے اور اُسے بتایا جائے کہ وہ اپنی اصل کے لحاظ سے کس قدر حقیر اور اپنے افعالِ بد کی وجہ سے کس قدر ذلیل ہے۔"

شیخ الاسلام زکریا انصاری نے اپنی شرح میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے:

امام غزالی نے لکھا ہے کہ سرکش نفس پر قابو تین باتوں سے حاصل ہوتا ہے ایک یہ کہ اس کی خواہش سے اسے محروم کیا جائے اس لیے کہ

سرکش جانور کے چارے میں کمی کر دی جائے تو وہ نرم پڑ جاتا ہے
دوسری یہ کہ اس پر مشقت والی عبادات کا بوجھ ڈالا جائے کیونکہ جب
سرکش جانور کے چارے کو کم کر کے اس پر بوجھ زیادہ لاد دیا جاتا ہے
تو وہ مطیع و فرماں بردار ہو جاتا ہے، تیسری یہ کہ اس معاملے میں اللہ
تعالیٰ سے استعانت طلب کی جائے کیونکہ اس کی مدد کے بغیر نفسِ
سرکش پر قابو حاصل نہیں ہو سکتا، کیا تم نے حضرت یوسف علیہ السلام
کا یہ قول نہیں سنا ہے ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم
ربی (۱) (نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب
کی رحمت ہو)

ذوالنون مصریؒ نے کہا ہے کہ چھ اسباب ہیں جن کی وجہ سے خلقِ خدا میں فساد
رونما ہو گیا ہے:

(۱) الاوّل ضعف النیۃ بعمل الاٰخرۃ: پہلا سبب یہ ہے کہ عمل
برائے آخرت کی نیت میں ضعف آگیا ہے

کھلی بات ہے کہ جب کسی چیز کے لیے عمل کی نیت اور اس کا ارادہ ہی کمزور
ہو جائے تو لامحالہ اس میں اس کی رغبت کم ہو جائے گی۔

(۲) والثانی صارت ابدانهم رهنیۃ لشهواتهم دوسرا یہ کہ ان کے
اعضا و جوارح ان کی خواہشات کے قیدی بن گئے ہیں

یہ دوسرا سبب پہلے سبب کا ثمرہ اور اس کا نتیجہ ہے کیونکہ انسان اپنی خواہشاتِ
نفس کو اسی وقت ترک کرتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی بندگی و اطاعت کی نیت اور

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۴۳۰

عزم قوی ہو اور جب یہ چیز فوت ہو جاتی ہے تو اس کا بدن اس کی خواہشات کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے

(۳) والثالث غلبهم طول الامل مع قرب الاجل تیسرا یہ کہ قربِ اجل کے باوجود طولِ امل نے ان پر غلبہ پا لیا ہے

اَمل کے معنی لغت میں امید کے ہیں لیکن احادیث اور تصوف کی کتابوں میں یہ لفظ دنیوی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس جملے کا مطلب یہ ہوا کہ موت قریب ہونے کے باوجود لوگوں پر دُنیا کی لمبی امیدوں اور تمناؤں نے غلبہ پا لیا ہے۔

(۴) والرابع اٰثروا رضا المخلوقین علی رضا الخالق چوتھا یہ کہ انھوں نے مخلوق کی خوشنودی کو خالق کی خوشنودی پر ترجیح دے رکھی ہے

یہ چیز قلتِ دین اور ضعفِ یقین سے پیدا ہوتی ہے، جب انسان کا یہ یقین کمزور ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نفع اور نقصان پہنچانے والا نہیں ہے تو وہ ہر اس مخلوق کی رضا تلاش کرنے لگتا ہے جسے وہ نفع یا نقصان پہنچانے والا سمجھتا ہے اور پھر اسے اللہ کو خوش رکھنے کی فکر باقی نہیں رہتی۔

(۵) والخامس اتبعوا اھواءھم ونبذوا سنة نبیھم وراء ظھورھم پانچواں یہ کہ انھوں نے اپنی ایجاد کردہ بدعتوں کی پیروی کی اور اپنے نبی کی سنت کو پسِ پشت ڈال دیا

یہ پانچواں سبب دراصل چوتھے سبب کا لازمی نتیجہ ہے۔ انھوں نے مخلوق کو خوش کرنے اور دُنیوی فوائد حاصل کرنے کے لیے دین میں طرح طرح کی بدعتیں رائج کیں اور اپنے عقیدہ و عمل کو بگاڑ کر رکھ لیا۔

(۶) والسادس جعلوا قلیل زلات السلف حجة لانفسھم و

دفنوا کثیر مناقبھم (۱) چھٹا یہ کہ انھوں نے سلف کی قلیل لغزشوں کو اپنے لیے دلیل بنالیا اور ان کے کثیر فضائل ومناقب کو دفن کردیا۔

خواہشِ نفس کی پیروی کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر کسی بدعت یا غلطی پر ٹوکا جائے تو وہ جھٹ سے کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کیا ہیں ہم سے بہت زیادہ افضل فلاں بزرگ نے ایسا کیا ہے۔ یہ لوگ بزرگوں کے بہترین اعمال اور ان کی قابلِ رشک عبادات وطاعات میں ان کی پیروی نہیں کرتے لیکن اگر ان سے کوئی لغزش ہوگئی ہو تو اسے اپنے لیے دلیل اور حجت بنانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ امام قشیری نے باب المجاہدہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنے نفس کو کچلنے کے لیے تیار نہ ہو وہ بندگیٔ رب میں مجاہدے پر آمادہ نہیں ہوسکتا ——

سورۃ العنکبوت ہی کی ابتدائی آیتوں میں فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا	اور جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا
يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ	اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا،
لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝	اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے
عنکبوت ع ۱	بے نیاز ہے

قاضی ثناء اللہؒ اور دوسرے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں جہاد سے اس کی تمام قسمیں مراد ہیں خواہ وہ کفار سے ہو یا نفس سے یا شیطان سے —— اس آیت میں نہ صرف یہ کہ مجاہدے اور جہاد کی ترغیب ہے بلکہ اس میں یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ انسانوں سے مجاہدے کا مطالبہ خود ان کے اپنے فائدے

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۳۶

کے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کو کسی کے مجاہدے کی ضرورت نہیں، اس کی ذات بے نیاز ہے ——— سورۂ مائدہ رکوع ۶ میں ہے:

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرتے رہو اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ اور مجاہدہ کرو اس کی راہ میں تاکہ تمھیں کامیابی نصیب ہو

سورہ الحج کے آخری رکوع میں حکم دیا گیا ہے

"اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ حق ہے جہاد کرنے کا"

جہاد اور مجاہدہ ایک ہی معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان آیتوں میں حکم یہ دیا گیا ہے کہ مومن اپنی پوری طاقت سے ہر اس دشمن کا مقابلہ کرے جو بندگیٔ رب کی راہ میں مزاحم ہو خواہ وہ دشمن کوئی انسان ہو یا شیطان ہو یا خود اس کا اپنا نفس ہو۔

چند احادیث امام محی الدین ابوزکریا نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ریاض الصالحین کے باب المجاہدہ میں ۱۷ حدیثیں نقل کی ہیں ان سب کو یہاں پیش کرنا موجب طوالت ہے، میں ان میں سے چند احادیث کے ترجمے پیش کرتا ہوں:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جس کسی نے میرے کسی ولی سے عداوت کی تو میں اسے آگاہ کرتا ہوں کہ اس کے خلاف میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ بندہ جن چیزوں سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ فرائض ہیں جو میں نے اس پر عائد کیے ہیں اور بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ

وہ میرا محبوب بن جاتا ہے اور جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے
تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی
آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا
ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے
وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو میں اسے دیتا ہوں
اور اگر مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔

(بخاری شریف)

یہ حدیث تصوف کا ایک بنیادی ماخذ ہے اور ائمہ صوفیہ نے اپنی کتابوں کے مختلف ابواب میں اس سے استدلال کیا ہے۔ اس حدیثِ قدسی میں تمثیل کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے، کان، ہاتھ، پاؤں بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ فرائض کی ادائگی اور نوافل کی کثرت سے اللہ کی محبت اتنی غالب آجاتی ہے کہ بندے کی مرضیات، اللہ کی مرضیات میں گم ہو جاتی ہیں پھر وہ اپنی آنکھوں سے وہی کچھ دیکھتا اور کانوں سے وہی کچھ سنتا ہے جو اللہ کو پسند ہو، ہاتھوں سے وہی کچھ پکڑتا ہے جس کا پکڑنا جائز ہو اور اس کے قدم اسی طرف اٹھتے ہیں جہاں جانے کی اللہ نے اجازت دی ہو، گویا اس کے تمام حرکات و سکنات اپنے محبوبِ حقیقی کے اشارۂ چشم و ابرو کے ماتحت ہو جاتے ہیں۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ یہ تصوف کا سب سے اونچا مقام ہے۔ امام نوویؒ نے باب المجاہدہ میں اسے پیش کر کے اس حدیث کے صحیح مطلب کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ فرائض کی ادائگی اور نوافل کی کثرت وہ مجاہدہ ہے جو شرعاً مطلوب ہے اور نفسِ سرکش پر قابو پانے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہے۔ ہر نوعِ عبادت کے نوافل

اسی نوع کے ہوتے ہیں۔ نوافل سے مُراد صرف نماز کے نوافل نہیں ہیں بلکہ ہر فرض عبادت کے نوافل مُراد ہیں۔

(۲) "حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرا بندہ جب میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جب وہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں اور جب وہ میری طرف معمولی چال سے چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں" (بخاری شریف)

اس حدیثِ قدسی میں بھی تمثیل کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ ایک بالشت بڑھنا، ایک ہاتھ بڑھنا اور معمولی چال سے چل کر جانا، اس مجاہدے کو ظاہر کرتا ہے جو بندہ اپنے مالک سے تقرب حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔ ایک بالشت کے جواب میں ایک ہاتھ بڑھنا اور ایک ہاتھ کے جواب میں دو ہاتھ بڑھنا اور معمولی رفتار کے جواب میں دوڑ کر آنا، اللہ تعالیٰ کے اس بے نہایت کرم کو ظاہر کرتا ہے جو وہ اپنے مجاہد بندے پر کرتا ہے۔ اس حدیث میں بھی تقرب الی اللہ کے لیے مجاہدے کی ایسی ترغیب و تشویق موجود ہے جس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) حضرت انس ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں بہت لوگ گھاٹا اٹھاتے ہیں صحت اور فراغت (بخاری شریف)

اس حدیث میں صحت و فراغت کو سرمایۂ حیات سے تشبیہ دی گئی ہے، جس طرح وہ تاجر سخت احمق اور گھاٹا اٹھانے والا ہے جو نفع کمانے کا

بہترین موقع ملنے کے باوجود اپنے سرمایے کو تجوری میں بند رکھتا ہے اور اسے تجارت میں نہیں لگاتا، اسی طرح وہ لوگ بہت بے وقوف اور نقصان اٹھانے والے ہیں جو صحت و فراغت کے باوجود خدا کی بندگی میں سرگرمی نہیں دکھاتے اور آخرت کا اجر و ثواب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے، صحت و فراغت ہوتے ہوئے عملِ خیر نہ کرنے کے لیے آخر کون سا عذر باقی رہتا ہے۔ صحت کی قدر بیماری میں معلوم ہوتی ہے اور فراغت کی قدر مشغولیت میں۔ بیماری اور مشغولیت میں مومن نیکی کے بہت سے کام کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا اور پچھتاتا ہے کہ اس نے صحت اور فراغت کی قدر کیوں نہ کی۔

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ شہوات سے اور جنت مکارہ سے ڈھانک دی گئی ہے (بخاری و مسلم)

"شہوات" شہوت کی جمع ہے ان سے مراد وہ نفسانی خواہشات ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے اور "مکارہ" مکروہ کی جمع ہے، مکروہ پُرمشقت اور ناگوار شے کو کہتے ہیں۔ مکارہ سے مراد یہاں وہ مشقت بھرے اعمال ہیں جو نفس پر شاق اور اسے ناگوار ہوتے ہیں لیکن وہی حصولِ جنت کے ذرائع بھی ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور دوزخ کے درمیان نفسانی خواہشات کو پردہ بنا دیا گیا ہے اگر انسان اس پردے کو اٹھا دے یعنی منہیات و ممنوعات کا ارتکاب کرنے لگے تو وہ دوزخ میں داخل ہو جائے گا۔ اسی طرح انسان اور جنت کے درمیان پُرمشقت اعمالِ خیر، پردہ بنا دیئے گئے ہیں اگر وہ یہ پردہ اٹھا دے یعنی ان اعمالِ خیر کی تعمیل شروع کر دے تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا، یہ حدیث اپنے ظاہری الفاظ ہی سے حصولِ جنت

کے لیے مجاہدے کو ضروری قرار دے رہی ہے۔

مجاہدے میں اتباعِ سُنّت

وہ تمام اعمال جو تقربِ الٰہی، خوشنودیٔ رب اور حصولِ جنّت کے لیے ضروری ہیں، اسی طرح وہ تمام اعمال جو انسان کو خدا سے دُور کرتے اور اسے غضبِ الٰہی اور دوزخ کا مستحق بناتے ہیں، قرآن و حدیث میں بیان کر دیئے گئے ہیں اس لیے اب کسی کو کوئی نیا عمل ایجاد کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدے میں بھی ہمارے لیے اُسوہ اور نمونہ ہیں کیونکہ آپؐ کی زندگی توازن و اعتدال کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ تصوّف کی کتابوں اور بزرگانِ دین کے سوانح میں ہمیں بہت سے ایسے مجاہدے ملتے ہیں جو اتباعِ سُنّت سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں اس لیے ہمیں خود تصوّف ہی کے مسلّمہ اصول کی بنیاد پر انھیں نظر انداز کر دینا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے آپ کو اس مجاہدے پر آمادہ بھی کرنا چاہیے جو کتاب و سنّت میں موجود ہے۔

اہم ترین مجاہدہ ممنوعات سے اجتناب ہے

شریعت کے احکام اوامر و نواہی میں منقسم ہیں، کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ممنوعات سے اجتناب مجاہدے کی اہم ترین قسم ہے یہ بات کتاب و سنت سے بھی ثابت ہے اور صوفیہ کے اقوال میں بھی یہ بات ملتی ہے۔ "عبادات" کی کثرت آسان ہے لیکن اپنے آپ کو بُرے اخلاق سے پاک صاف کرنا مشکل ہے، اگر کوئی شخص اپنے آپ کو ممنوعات و محرمات سے بچا کر صرف فرائض و واجبات انجام دے رہا ہو وہ اُس شخص سے بڑا صوفی"

سے جو رات بھر جاگ کر عبادت کرتا ہے لیکن ساتھ ہی کبر، غصّہ، عجب نفس، حسد، غیبت، دُنیا کی محبت، بدگوئی اور اسی طرح کے دوسرے محرمات و ممنوعات میں مبتلا ہے، امام قشیری لکھتے ہیں:

"بھوک برداشت کرنا اور شب بیداری اختیار کرنا آسان ہے لیکن پست اخلاق سے اپنے آپ کو نکال کر اچھے اخلاق کی بلندی تک پہنچنا سخت مشکل ہے" (۱)

کتاب و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ "عبادات" کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کو ممنوعات و محرمات سے پاک صاف کریں، اگر عبادات سے یہ مقصد حاصل نہ ہو رہا ہو تو وہ عبادتیں بے رُوح ہیں۔ نماز جیسی اعلیٰ ترین عبادت کے بارے میں کہا گیا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ (۲) (یقیناً نماز فحش اور بُرے کاموں سے روکتی ہے) رمضان کے روزوں کا مقصد بتایا گیا ہے لعلکم تتقون (۳) (تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو)

انسان کا نفس دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو "اچھا" اور "بڑا" سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔ غیبت اور بے ہودہ گوئی سے دلچسپی لیتا ہے۔ دُنیا کی محبت اس کے اندر سرایت کیے ہوئے ہے، حسد سے اسے مسرت ہوتی ہے، دوسروں کا مال ہڑپ کر کے پھولا نہیں سماتا، دوسروں کو تکلیفیں پہنچا کر ڈینگیں مارتا ہے، یہ تمام چیزیں اس کی مرغوبات و مطلوبات ہیں، ان سے اسے روکنا اور اس کے منہ میں تقویٰ کی خاردار لگام ڈالنا کس قدر مشکل اور پُرمشقت کام ہے لیکن یہی مجاہدہ انسان کو دُنیا اور آخرت دونوں ہی جگہ

---

(۱) الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۳۱ (۲) عنکبوت ع ۶ (۳) البقرہ ع ۲۳

کامیاب کرے گا اور یہی مجاہدہ تقربِ الٰہی کے بند دروازے کھولے گا
توبہ اور مجاہدہ دو ایسے مقامات ہیں جو زندگی کے آخری لمحے تک جُدا نہیں
ہوتے وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (۱) (اپنے رب کی بندگی
کیے جاؤ یہاں تک کہ تمھیں موت آجائے) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ
اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۲) (اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر اور اس سے
استغفار کر وہ بہت معاف کرنے والا ہے)

اس آیت میں حمد، تسبیح اور استغفار کا یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو دیا گیا تھا، جب حضورؐ اپنا کارِ رسالت مکمل کر چکے تو وفات سے کچھ پہلے
سورہ اذا جاء نصر اللہ نازل ہوئی اور اس میں آپؐ کو یہ حکم دیا گیا۔ حمد، تسبیح
اور استغفار آپ پہلے بھی کر رہے تھے۔ اس حکم کا مطلب یہ ہوا کہ اب
اس میں اور اضافہ کیجیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی مومن زندگی کے آخری
لمحے تک مجاہدے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

---

(۱) سورہ الحجر کی آخری آیت (۲) النصر

محبّت

اللہ تعالیٰ کی محبت، تمام مقامات کی غایت اور تمام درجات میں سب سے بلند چوٹی ہے، محبتِ الٰہی پا لینے کے بعد، ہر مقام اس کے ثمرات میں سے ایک ثمرہ اور اس کے توابع میں سے ایک تابع ہے، جیسے شوق، انس، رضا، مناجات۔ اور محبتِ الٰہی کے ادراک سے پہلے ہر مقام اس کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ ہے، جیسے توبہ، صبر، زہد اور اس طرح کے دوسرے تمام مقامات (۱)

امام غزالی نے محبتِ الٰہی کے بارے میں جو بات لکھی ہے، یہی دوسرے الفاظ میں علامہ حمید الدین فراہی نے بھی لکھی ہے:

"جس طرح ہر ایک کام کی ایک غرض اور انتہاء ہوتی ہے جس پر وہ کام ختم ہو جاتا ہے اسی طرح ایمان اور تعلیمِ قرآن کی انتہاء محبتِ الٰہی ہے، تمام نبیوں کی تعلیم کا مرکز اور مغز یہی تھا اور روحانی زندگی اسی کا نام ہے، قرآن تو اس تعلیم سے لبریز ہے مگر توریت و انجیل میں بھی یہ حکم صاف صاف سنا دیا گیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ توریت کے احکام میں سب سے اعلیٰ حکم کیا ہے تو

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴

فرمایا: خدا کی محبت تمام دل تمام رُوح تمام عقل سے کرنا یہی سب سے اوّل اور اعظم حکم ہے (متی ۲۲) جس طرح محبتِ الٰہی دین کی غایت ہے اسی طرح اس محبت کی جان اخلاص ہے۔ منہ سے محبت کا دم بھرنا اور چیز ہے اور اخلاصِ محبت اور

خلقے زبان بدعویٔ عشقش کشادہ اند　　اے من غلام آنکہ دلش با زباں یکے است (۱)

محبت کے باب میں بھی علماء و صوفیہ کی کتابوں میں مختلف قسم کی بحثیں کی گئی ہیں میں نے اس کتاب میں فلسفیانہ بحثوں سے احتراز کا ارادہ کیا ہے اس لیے یہاں صرف وہ باتیں پیش کروں گا جو قرآن و احادیث سے ثابت ہیں اور صوفیہ کے وہ احوال و اقوال نقل کروں گا جو کتاب و سُنّت سے آگے نہیں بڑھتے۔

محبّتِ الٰہی قرآن میں قرآنِ کریم میں حُبّ اور مَحَبّۃ اور اس کے ہم معنی وُدّ اور مَوَدَّۃ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ میں آگے جو کچھ لکھ رہا ہوں اس میں حُبّ، محبت اور وُدّ کی آیتیں نقل کروں گا۔ مَوَدَّۃ کا لفظ متعدد آیتوں میں آیا ہے۔ مثلاً سورہ الشوریٰ میں ہے:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى (الشوریٰ ر۳)

اے نبی ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں۔

سورہ الروم میں ہے:

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ (الروم ر۲)

اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔

---

(۱) تفسیر سورۂ اخلاص ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی

اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت یہ ہے کہ وہ اس کی والہانہ اطاعت میں سرگرم، اس کی رضا و قرب کا طالب اور اس کی نگاہِ لطف و کرم کا آرزومند ہو جائے اور بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت کے معنی یہ ہیں کہ دُنیا میں وہ اس کا حامی، ناصر اور کارساز ہو اور آخرت میں وہ اس پر اپنے رضوان کی نعمت انڈیل دے اور اس کو اپنے دیدارِ جاں نواز سے سرفراز فرمائے اور اس کا دیدار جنت اور اس کی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے۔

دنیا میں محبت، صرف محبوب کے دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ محبت، دل لبھانے والی گفتار سے بھی جاگ اُٹھتی ہے۔ جامی نے کہا ہے:

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد　　بسا کیں دولت از گفتار خیزد

عشق صرف دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات گفتگو سے بھی جاگ اٹھتا ہے شاید حضرت موسیٰ علیہ السلام، دلربا، شیریں و سرمدی آواز ہی سن کر پکار اٹھے تھے رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ۔ سورۂ اعراف کی اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے:

> اور جب وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی "اے رب مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں"، فرمایا تو مجھے نہیں دیکھ سکتا، ہاں ذرا سامنے پہاڑ کی طرف دیکھ اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا چنانچہ اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی کی اور اسے پارہ پارہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا جب ہوش آیا تو بولا "پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں۔
>
> (الاعراف آیت ۱۴۳)

یہ وہ مقام ہے جس کی حقیقت ہم نہیں جان سکتے بس اتنی بات سمجھ میں آتی ہے کہ محبوب

حقیقی کی باتیں سُن کر حضرت موسیٰ کے دل میں محبت کا سمندر جوش مارنے لگا اور وہ بے اختیار دیدارِ الٰہی کی التجا کر گزرے (۱) محبوبِ حقیقی نے اپنے شیفتۂ جمال کو پہاڑ پر تجلی کر کے یہ بات سمجھائی کہ انسان کی آنکھیں دُنیا میں اس کے جمالِ جہاں سوز کا نظارہ نہیں کر سکتیں، دیدارِ الٰہی کی جنت سے بڑی نعمت آخرت میں نصیب ہوگی، شبِ انتظار کی صبحِ صادق وہاں طلوع ہوگی۔

وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ (القیامۃ: ۲۲-۲۳)

اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ ان کے لیے صراحت کے ساتھ "محبت" کا ذکر کیا گیا ہے

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ (طٰہٰ: ۳۹)

اور ہم نے تجھ پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی

اس کا متبادر مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں حضرت موسیٰؑ کی محبت ڈال دی، اسی کا اثر تھا کہ فرعون بھی اپنے محل میں ان کی پرورش پر راضی ہو گیا تھا اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی کسی خاص محبت سے نوازا تھا۔ الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں کہ یہ دونوں مفہوم مُراد لیے جا سکتے ہیں۔

محبتِ الٰہی کا ذکر بصیغۂ خبر

اللہ تعالیٰ کی محبت ایمان اور جذبۂ شکر و سپاس کا ثمرہ ہے اس لیے قرآن میں بصیغۂ امر اللہ سے محبت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ بصیغۂ خبر بتایا گیا ہے کہ ایمان والے لوگ اللہ سے

---

(۱) کوہِ طور کے واقعات قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں بیان کیے گئے ہیں ان میں محبتِ الٰہی کی بجلیاں بھی کوند رہی ہیں ان واقعات کو قرآن کی سورتوں میں تلاش کر کے پڑھنا اور سمجھنا چاہیے۔

شدید محبت رکھتے ہیں وَالَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔ سورہ البقرہ کی اس پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے:

> اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مد مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں ــــــ کاش جو کچھ عذاب کو سامنے دیکھ کر انھیں سوجھنے والا ہے آج ہی ان ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری طاقتیں اور سارے اختیارات اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔
>
> (البقرۃ : ۱۶۵)

اس آیت نے پوری طرح کھول کر یہ بتا دیا ہے کہ محبت کا اصلی حق دار صرف اللہ ہے اور کسی مخلوق کی ایسی محبت جیسی اللہ سے ہونی چاہیے، شرک ہے، نیز یہ کہ اللہ پر ایمان لانے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ ہی سے محبت رکھتے ہیں ہر دوسری محبت اللہ کی محبت پر قربان کی جا سکتی ہے لیکن مومن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اللہ کی محبت کو کوئی آنچ پہنچے۔ انبیاء و اولیاء تک کی محبتیں محبتِ الٰہی کے تابع ہیں ان میں سے کسی کی محبت میں اتنا غلو کہ اللہ کی محبت کے برابر ہو جائے یا اس سے بڑھ جائے، شرک اور منشر کا اعمال کی جڑ ہے، مومن کو اس سے پناہ مانگنی چاہیے ــــــ تمام محبتیں، محبتِ الٰہی کے تابع ہیں! اس جملے کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی مخلوق کے ساتھ کوئی ایسا عقیدہ رکھا اور کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جا سکتا جو محبوبِ حقیقی اللہ رب العزت کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف ہو۔

محبتِ الٰہی کے ذکر میں سورہ المائدہ کی آیات ۵۴ تا ۵۶ قابلِ مطالعہ ہیں۔ ان آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ اللہ اپنے فرماں بردار بندوں سے محبت کرتا ہے اور

فرماں بردار بندے اپنے مالکِ حقیقی سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ سے محبت رکھنے والوں کی چند اہم صفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے محبت کرنے والے فرماں بردار بندوں کو "حزب اللہ" کے جاں نواز لقب سے نوازا ہے۔ ہم یہاں ان تین آیتوں کے ترجمے نقل کرتے ہیں۔

اے ایمان لانے والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ، اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا، جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے، جو اللہ کی راہ میں جد و جہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسولؐ اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔

اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہلِ ایمان کو اپنا رفیق بنالے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔

(المائدہ ۵۴ تا ۵۶)

مہربان مالک کا کرم یہ ہے کہ پہلے اس نے اپنے فرماں بردار بندوں سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے، اس کے بعد یہ خبر دی ہے کہ فرماں بردار بندے بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ سے محبت کرنے والوں کی جن بنیادی اور اہم صفات کا ذکر ان آیات میں ہے وہ یہ ہیں:

(الف) مومنوں پر نرم (ب) کافروں پر سخت (ج) اللہ کی راہ میں جہاد کرنے

والے (د) کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈرنے والے (ہ) نماز قائم کرنے والے (و) زکوٰۃ دینے والے (ز) خدا کے سامنے جھکے رہنے والے۔

یہاں ان صفات کا ذکر اس بات کا کھلا اشارہ ہے کہ اگر کسی مُدعیٔ محبت میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اللہ سے محبت کے دعوے میں سچا نہیں ہے۔

"مومنوں پر نرم" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اہلِ ایمان کے مقابلے میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہ کرے، اس کی ذہانت۔ اس کی ہوشیاری، اس کی قابلیت، اس کا رسوخ واثر، اس کا مال، اس کا جسمانی زور، کوئی چیز بھی مسلمان کو دبانے اور ستانے اور نقصان پہنچانے کے لیے نہ ہو، مسلمان اس کو اپنے درمیان ایک نرم خو، رحم دل، ہمدرد اور حلیم انسان ہی پائیں۔ "کفار پر سخت" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن آدمی اپنے ایمان کی پختگی، دین داری کے خلوص، اصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے مخالفین اسلام کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کے مانند ہو کہ کسی طرح اپنے مقام سے ہٹایا نہ جا سکے، وہ اسے کبھی موم کی ناک اور نرم چارہ نہ پائیں۔ انھیں جب بھی اس سے سابقہ پیش آئے ان پر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کا بندہ مر سکتا ہے مگر کسی قیمت پر بک نہیں سکتا اور کسی دباؤ سے دب نہیں سکتا (۱)

"اللہ کی راہ میں جد و جہد کریں گے"، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے یا غالب رکھنے کے لیے تمام مخالفینِ حق سے جو بھی لڑائی لڑیں گے خواہ یہ مخالف ان کا اپنا نفس ہو یا شیطان یا کفار۔

---

(۱) تفہیم القرآن ج ۱

"کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈریں گے" اس کا مطلب یہ ہے:

یعنی اللہ کے دین کی پیروی کرنے میں، اس کے احکام پر عمل درآمد کرنے میں، اور اس دین کی رُو سے جو کچھ حق ہے اسے حق اور جو کچھ باطل ہے اسے باطل کہنے میں انھیں کوئی باک نہ ہوگا، کسی کی مخالفت، کسی کی طعن و تشنیع، کسی کے اعتراض اور کسی کی پھبتیوں اور آوازوں کی وہ پروانہ کریں گے۔ اگر رائے عام اسلام کی مخالف ہو اور اسلام کے طریقے پر چلنے کے معنی اپنے آپ کو دنیا بھر میں نکّو بنا لینے کے ہوں تب بھی وہ اُسی راہ پر چلیں گے جسے وہ سچّے دل سے حق جانتے ہیں (۱)

اللہ کی محبت پر غیر اللہ کی محبت کو غالب کر دینا اور اللہ کی راہ میں جد و جہد کرنے سے جی چُرانا کسی مومن مخلص کو زیب نہیں دیتا۔ یہ چیز ایمان کی عین ضد ہے یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیت ۲۳-۲۴ میں اس پر سخت وعید سُنائی گئی ہے۔ ان دونوں آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔

اے نبیؐ! کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے عزیز و اقارب اور تمھارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمھارے وہ کاروبار

---

(۱) تفہیم القرآن ج ۱

جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمھارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمھارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔
(التوبہ: ۲۳-۲۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کی راہ کی جدو جہد کے مقابلے میں کسی اور کو محبوب تر رکھنا مومنوں کا کام نہیں بلکہ فاسقوں کا کام ہے تقریباً اسی مضمون کی آیت سورۂ المجادلہ میں بھی ہے:

تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی یا ان کے اہلِ خاندان یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک رُوح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں (المجادلہ آخری آیت)

یہ آیت نہ صرف ایمان بلکہ تصوّف کے لیے بھی ایک کسوٹی ہے، جو ایمان اس کسوٹی پر کھرا اُترے وہ حقیقی ایمان اور جو تصوف اس پر کھرا ثابت ہو وہی اسلامی تصوف ہے اور جو تصوف اس پر کھوٹا ثابت ہو وہی غیر اسلامی تصوف ہے۔

اللہ کے محبوب و مبغوض

اللہ کن لوگوں سے محبت کرتا ہے اور کن لوگوں کو ناپسند کرتا ہے اس کا اعلان و اظہار قرآن عزیز کی بہت سی آیتوں میں کیا گیا ہے۔ اللہ سے محبت رکھنے والے لوگوں کے لیے ان تمام آیتوں کا مطالعہ بے حد مفید ہوگا۔ ان آیتوں سے ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا صفات ہیں جن سے آراستہ ہونا محبوبِ حقیقی کی نگاہِ لطف و کرم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں اور دُوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا صفات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے۔ اللہ سے محبت رکھنے والوں کو ان کے قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہیے۔ یہاں ان تمام آیتوں کو نقل کر کے ان کی تشریح کرنا موجب طوالت ہے۔ میں یہاں آیتوں کے حوالوں کے ساتھ صرف فہرست پیش کرتا ہوں، قرآن کریم اور اس کی تفسیروں میں ان آیتوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

وہ لوگ جن سے اللہ محبت کرتا ہے

(۱) اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۝
(البقرہ رکوع ۲۴ آیت ۱۹۵)

بے شک اللہ محسنوں سے محبت کرتا ہے۔

جس شخص میں "احسان" کی صفت ہوتی ہے وہ "محسن" ہوتا ہے۔ اللہ صفتِ احسان کو پسند فرماتا ہے اور جن لوگوں میں یہ صفت ہو اُن سے محبت کرتا ہے۔

(۲) اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ۝
(البقرہ ر ۲۸ آیت ۱۲۲)

بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

توبہ اور پاکیزگی، اللہ کو پسند ہے اور وہ ان سے متصف لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۳) اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ۝
(آل عمران ر ۱۷ آیت ۱۵۹)

بے شک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

توکل اللہ کو پسند ہے اور وہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(۴) إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ٥ — بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
(المائدہ ر۶ آیت ۴۲)

قسط یعنی انصاف اللہ کو پسند ہے اور وہ منصفوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۵) إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ٥ — بے شک اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے
(التوبہ آیت ۴)

تقویٰ اللہ کو پسند ہے اور وہ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔

(۶) وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ٥ — اور اللہ صابروں سے محبت کرتا ہے
(آل عمران ر۱۵ آیت ۱۴۶)

صبر اللہ کو پسند ہے اور وہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۷) إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ (الصف) — بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔

"قتال فی سبیل اللہ" یعنی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیئے دشمنانِ حق سے جنگ کرنا اللہ کو پسند ہے۔

احسان۔ توبہ۔ پاکیزگی۔ توکل۔ عدل وانصاف۔ تقویٰ۔ صبر۔ قتال فی سبیل اللہ۔ یہ وہ صفات ہیں جو رؤف ورحیم اللہ کو پسند ہیں اور جو لوگ ان صفات سے متصف ہوں وہ ان سے محبت کرتا ہے۔

وہ لوگ جن کو اللہ پسند نہیں کرتا

(۱) فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ٥
(آل عمران ر۴ آیت ۳۲)

بے شک اللہ ایسے لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔

جس طرح "ایمان"، تمام صفاتِ حسنہ کی اصل ہے۔ اس کے بغیر کوئی صفت اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب نہیں اسی طرح "کفر و شرک" تمام "صفاتِ سیئہ" کی جڑ اور ناقابلِ معافی ہیں، اللہ تعالیٰ کفر و شرک کو سخت ناپسند کرتا ہے اور وہ منکرینِ حق کا دشمن ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○ — بے شک اللہ کافروں کا دشمن ہے۔

(البقرۃ: ۹۸)

(۲) فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ — بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔

(البقرۃ ر۲۴ آیت ۱۹۰)

"اعتداء" یعنی زیادتی و سرکشی اللہ کو ناپسند ہے اور وہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۳) اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ○ — یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص سے محبت نہیں رکھتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے

(النساء ر۶ آیت ۳۶)

"اختیال اور فخر" یعنی اترانا اور ڈینگیں مارنا اللہ کو ناپسند ہے اور وہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔

(۴) اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ○ (النساء ر۶ آیت ۱۰۷) — بے شک اللہ ایسے شخص کو ناپسند کرتا ہے جو خیانت کار اور معصیت پیشہ ہو۔

خیانت کار اور معصیت پیشہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے خیانت اور گناہ کو عادت بنا لیا ہو، اللہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔

(۵) اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ○ — بے شک اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

(انفال: ۵۸)

(۶) اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ٥ (الحج ر ۵ آیت ۳۸)	یقیناً اللہ کسی خائن، کافرِ نعمت کو پسند نہیں کرتا۔
(۷) اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ٥ (القصص ر ۸ آیت ۷۶)	یقیناً اللہ گھمنڈ میں پھولے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
(۸) اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ٥ (لقمان : ۱۸)	بے شک اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اترانے والا، بڑائیاں کرنے والا۔
(۹) اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ٥ (القصص : ۷۷)	بے شک اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔
(۱۰) لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء ر ۲۱ آیت ۱۴۸)	اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔
(۱۱) اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ٥ (الانعام ر ۱۷ آیت ۱۴۱)	اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
(۱۲) اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ ٥ (النحل ر ۳ آیت ۲۳)	اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو غرورِ نفس میں مبتلا ہوں۔
(۱۳) اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ٥ (الشوریٰ : ۴۰)	بے شک اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

ان آیتوں میں جن صفات کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:
کفر۔ زیادتی۔ غرور۔ خود پسندی۔ خیانت۔ گناہوں پر اصرار۔ کفرانِ نعمت۔ بدگوئی۔ فساد۔ اسراف۔ ظلم۔ یہ وہ صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں اور یہ انسان کو اللہ کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں اس لیے اللہ سے محبت کرنے والے اور اللہ کی محبت کے طلب گار ہر مومن کو ان سے دور بھاگنا چاہیے۔

محبتِ الٰہی کی کسوٹی

اللہ کی محبت کا دعویٰ کرنے والے بہت ہیں، یہود و نصاریٰ بھی خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور عہدِ رسالت میں منافقین بھی اس کے مدعی تھے اس لیے یہ جاننے کی سخت ضرورت تھی کہ محبتِ الٰہی کی کسوٹی کیا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جس پر جانچ کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ اللہ سے کہ محبت کا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا؟ یہی بتانے کے لیے یہ دو آیتیں نازل ہوئیں

تو کہہ، اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تاکہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمھارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

تو کہہ، حکم مانو اللہ کا اور رسولؐ کا پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت نہیں ہے کافروں سے (آل عمران ر ۴ آیت ۳۱ - ۳۲)

اتباعِ رسولؐ اور اطاعتِ خدا و رسولؐ وہ کسوٹی ہے جس پر جانچ کر یہ دیکھا جائے گا کہ اللہ سے محبت کے دعوے میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟

صوفیہ اور علماء کے امام حضرت حسن بصریؒ نے ان آیتوں کی یہ تفسیر کی ہے:

زعم اقوام علی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم انهم یحبون الله فاراد ان یجعل لقولهم تصدیقاً من عمل فمن ادعی محبته وخالف سنته رسوله فهو کذاب وکتاب الله یکذبه (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چند گروہوں نے گمان کیا کہ وہ بھی اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اللہ نے ان کے قول کی عملی تصدیق کے لیے ان کے سامنے یہ کسوٹی رکھ دی پس جو شخص اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا اور اس کے رسولؐ کی سنت کی مخالفت کرتا ہے وہ بڑا جھوٹا ہے اور اللہ کی کتاب اس کے دعوے کی تکذیب کرتی ہے۔

---

(۱) حاشیہ تفسیر جلالین

دوسری آیت کا آخری ٹکڑا ایک لرزا دینے والا ٹکڑا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اتباع محمدی اور اطاعتِ خدا و رسولؐ سے اعراض کرتے ہوئے محبتِ الٰہی کا دعویٰ تو دُور کی بات ہے ایسا شخص مومن ہی نہیں ہے۔ اس کی روش کافروں کی روش ہے۔ اسی کے ساتھ پہلی آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اتباع و اطاعت مومن کو مقامِ محبوبیت پر فائز کر دیتی ہے۔ یہ مژدۂ رُوح پرور مومن کے لیے وجد آور ہے۔ یہ دونوں آیتیں، انذار و تبشیر اور ترغیب و ترہیب کا لازوال خزانہ ہیں۔

دُنیا میں محبّتِ الٰہی کا ایک صِلہ

اللہ رب العالمین سے سچی محبت رکھنے والے خوش نصیب جب مقامِ محبوبیت پر فائز ہو جاتے ہیں یعنی جب ان کا مالکِ حقیقی ان سے محبت کرنے لگتا ہے تو ایسے خوش نصیب لوگوں کو آخرت میں جو صلے اور انعامات ملیں گے ان کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، دُنیا میں اللہ تعالیٰ انھیں جو صلے عطا کرتا ہے ان میں کا ایک صلہ دیندار لوگوں کے درمیان ان کی مقبولیت ہے۔ ہزاروں لاکھوں دین دار و صالح اشخاص ان سے محبت کرتے، ان سے عقیدت رکھتے اور ان کا احترام کرتے ہیں، اس صلے کا بیان قرآن میں بھی ہے اور احادیث میں بھی۔ سورۂ مریم کے آخری رکوع میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝

یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عملِ صالح کر رہے ہیں عنقریب رحمٰن ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔

یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی تھی اور اس کے اوّل مصداق صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے لیکن ایمان اور عملِ صالح کا یہ اجر ان کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ قیامت تک جو لوگ بھی ایمان اور عملِ صالح کے اعلیٰ درجات پر پہنچے اور پہنچیں گے انھیں

اچھے لوگوں کے درمیان حُسنِ قبول حاصل ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس آیت کی تفسیر میں ذیل کی حدیث بھی پیش کی گئی ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیلؑ کو پکار کر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تو بھی اس سے محبت رکھ، پھر جبرئیلؑ اس سے محبت کرتے ہیں اور آسمان والوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم لوگ بھی اس سے محبت رکھو تو اہلِ آسمان اس سے محبت کرتے ہیں پھر اس شخص کے لیے زمین میں حُسنِ قبول پیدا کر دیا جاتا ہے (۱)

جب آسمان سے کسی بندے کے لیے حُسنِ قبول نازل ہو جاتا ہے تو پھر اس شخص کے حاسدوں کی کوئی تدبیر اس حُسنِ قبول کو زک نہیں پہنچا سکتی ایسے حاسد خود ہی دُنیا میں ذلیل ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی خائب و خاسر ہوں گے۔

محبّتِ الٰہی کے بارے میں صوفیہ کے اقوال و احوال

(۱) حضرت ابویزید بسطامی نے کہا:

"محبت یہ ہے کہ تم اپنی کثیر خدمت کو قلیل، اور محبوب کے قلیل انعام کو کثیر سمجھو"

اس کی شرح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی معرفت کے کمال کا ثمرہ یہ ہے کہ بندہ، اس کی عظمت و جلال کے پیشِ نظر اپنی کثیر عبادتوں اور اطاعتوں کو بھی بہت ہی قلیل سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے لیے کسی معمولی سے معمولی انعام کو اپنی حقارت و ذلت کے پیشِ نظر کثیر و عظیم قرار دیتا ہے۔

---

(۱) ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم باب علامات حب اللہ العبد

(۲) حضرت سہل تستری نے کہا:

"اللہ تعالیٰ کی علی الدوام اور مسلسل اطاعت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے ہمیشہ کے پرہیز و اجتناب کا نام محبت ہے"

(۳) حضرت ابو عبداللہ القرشی نے کہا:

"محبت کی حقیقت یہ ہے کہ تم جس سے محبت کرو اس کو اپنا سب کچھ دیدو، اپنی کسی چیز کو بچا کر نہ رکھو۔

(۴) حضرت ابو علی روذباری نے کہا:

"محبوب کے امر و نہی میں اس کی موافقت کا نام محبت ہے"

مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے محبوبِ حقیقی کے ہر حکم کی تعمیل اور اس کی منع کی ہوئی ہر چیز سے پرہیز کرے۔

(۵) حضرت سمنون نے کہا:

"اللہ سے محبت کرنے والوں نے دنیا و آخرت دونوں کا شرف حاصل کرلیا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "المرء مع من اَحَبَّ" (انسان اس کے ساتھ ہے جس سے محبت کرتا ہے) لہذا انھیں اللہ کی معیت حاصل ہے"

شیخ الاسلام زکریا انصاری اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ جس طرح محبت کرنے والے ہمیشہ اس کے ساتھ ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی ہمیشہ ان کے ساتھ ہے، اس نے خود فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝ (سورہ النحل کی آخری آیت)

اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ ہے جو محسن ہیں

"تقویٰ" تمام طاعات کے لیے ایک جامع اسم ہے اور "احسان" یہ ہے کہ

تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

(٦) حضرت یحییٰ بن معاذ نے کہا:

"جس نے اللہ کی محبت کا دعویٰ کیا اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی حفاظت نہ کی وہ اپنے دعوے میں سچا نہیں ہے"

"حدود" سے مراد اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہیں۔

(٧) حضرت حارث محاسبی نے کہا:

"محبت یہ ہے کہ تم اپنے تمام وجود کے ساتھ کسی کی طرف مائل ہو جاؤ پھر تم اس کو اپنے نفس، اپنی روح اور اپنے مال پر ترجیح دو، پھر جلوت و خلوت میں اس کے امر و نہی میں اس کی موافقت کرو اور اسی کے ساتھ ساتھ تمھیں اس کا احساس رہے کہ تم اس کی محبت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہو"

حاشیہ میں سید مصطفیٰ عروسی نے یہ دو مشہور اشعار نقل کیے ہیں

تعصی الالٰہ وانت تظھر حبه — ھذا العمری فی القیاس بدیع

لو کان حبك صادقا لاطعته — ان المحب لمن یحب مطیع

تم معبود کی نافرمانی کرتے اور اس کی محبت کا اظہار کرتے ہو، قسم بجاں یہ بات عقلاً نرالی ہے اگر تمھاری محبت سچی ہوتی تو یقیناً تم اس کی اطاعت کرتے کیونکہ محب اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔

(٨) کہا گیا ہے کہ:

"محبت وہ آگ ہے جو دل میں بھڑکتی ہے اور مرادِ محبوب کے ماسویٰ سب کچھ جلا دیتی ہے"

(۹) یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

"محبت محبوب کے اشاروں پر چلنے کا نام ہے اور محبوب اپنے مُحب کے بارے میں جو چاہے کرے"

مطلب یہ ہے کہ محبوب اپنے مُحب پر کرم کرے یا ستم، اسے اس کا اختیار ہے لیکن مُحب ہمیشہ اس کی اطاعت ہی کرتا ہے۔

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

(۱۰) قال عبد الله المبارك من اعطی شیئاً من المحبة ولم یعط مثله من الخشیه فهو مخدوع

عبداللہ بن مبارک نے کہا جس کو محبت کا کچھ حصّہ دیا گیا اور اسی کے برابر خوف نہیں دیا گیا وہ بتلائے فریب ہے۔

شیخ الاسلام نے اس کی یہ شرح کی ہے کہ نعمت کوئی بھی ہو اگر اس کے زوال کا خوف دل میں موجود نہ رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ صاحبِ نعمت، اس نعمت پر مغرور ہے اور ایسا شخص فریب خوردہ ہوتا ہے۔

(۱۱) حضرت یحییٰ بن معاذ نے کہا:

"محبت کی ایک رائی مجھے محبوب تر ہے ستر سال کی اس عبادت سے جو محبت کے بغیر ہو"

ظاہر ہے کہ جس عبادت کی محرک محبت ہو اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

صوفیہ کا متفقہ قول

"صوفیۂ کرام کے اقوال تقریباً اس پر متفق ہیں کہ محبت، محبوب کی موافقت کا نام ہے اور موافقتوں میں سب سے بڑی موافقت، دل کی موافقت ہے"

مطلب یہ ہے کہ کامل شرحِ صدر اور دل کی گہرائی سے اللہ کی مرضیات پوری کرنے اور اور اس کے احکام کی تعمیل کا نام محبت ہے۔

(۱) حضرت فضیل بن عیاض کے خادم ابوالعباس نے بیان کیا کہ ایک بار حضرت فضیل کو حبسِ بول (پیشاب بند ہونے) کی شکایت ہوگئی، انھوں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور دعا کی "اے اللہ، مجھے تجھ سے جو محبت ہے اس کے صدقے میں مجھے شفا دے" یہ دعا مانگتے ہی حبسِ بول کی شکایت دور ہوگئی ـــــ اس طرح یہ بشارت بھی مل گئی کہ ان کی محبت، سچی محبت تھی (۱)

(۲) حضرت ابراہیم بن ادہمؒ ایک بار سیاحت کر رہے تھے، راستے میں کہیں کسی پہاڑ پر ایک شخص نے دو شعر پڑھے۔ شاعر نے اپنے محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "تیری ہر بات ہم نظر انداز کردیتے ہیں لیکن ہم سے تیری بے رخی ناقابلِ برداشت ہے" یہ سن کر ابراہیم بن ادہمؒ پر اضطراری کیفیت طاری ہوگئی یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہوگئے اور ایک رات دن بے ہوش رہے جب ہوش آیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے پہاڑ کی طرف سے یہ آواز سنی "یا ابراہیم کن عبدا" (اے ابراہیم بندہ بن کر رہو) یہ سنتے ہی مجھے ہوش آگیا اور اضطراب دور ہوگیا (۲)

حضرت جنید بغدادیؒ سے روایت ہے کہ ایک بار ہمارے استاذ سری سقطیؒ بیمار پڑ گئے۔ ہمیں اس کا کوئی سبب معلوم نہیں ہوسکا اور نہ یہ جان سکے کہ کون سی دوا دی جائے۔ لوگوں نے ایک طبیبِ حاذق کا پتہ بتایا۔ ہم اپنے استاذ کا قارورہ لے کر ان کے پاس گئے، انھوں نے تھوڑی دیر غور سے قارورہ دیکھا اور مجھ سے کہا، میرا خیال ہے کہ یہ کسی عاشق کا قارورہ ہے۔ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ یہ سن کر میں نے چیخ ماری، قارورہ میرے ہاتھ سے گر گیا اور میں بے ہوش ہوگیا ہوش

---

(۱) تمام اقوال رسالہ قشیریہ اور اس کی شرح سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔
(۲) احیاء العلوم ج ۴ ص ۲۰۹ مطبع مجتبائی میرٹھ

آیا اور واقعہ سُنایا، وہ مسکرائے اور طبیب کی مہارت و حذاقت کی تعریف کی (۳)

(۳) حضرت سہل تستری کا حال یہ تھا کہ جب کسی شخص سے گفتگو کرتے تو کہتے یا حبیب (اے دوست) کسی نے ان سے کہا کہ آپ ہر شخص کو اے دوست سے کیوں خطاب کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ دوست نہ ہو، انھوں نے اس کے کان میں کہا،

دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ شخص مومن ہوگا یا منافق ـــــ اگر مومن ہوگا تو اللہ کا حبیب ہے اور منافق ہوگا تو شیطان کا دوست ہے۔ (۴)

---

(۳) ایضاً (۴) ایضاً

استقامت

الرسالۃ القشیریہ اور بعض دوسری کتابوں میں صوفیہ کرام نے "استقامت" پر مستقل ایک باب لکھا ہے اور اس باب میں قرآن کریم کی وہ آیتیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات نقل کیے ہیں جن میں استقامت کا حکم دیا گیا ہے اور صاحب استقامت بندگانِ حق کی توصیف کی گئی ہے اور ان کا اجر بھی بیان کیا گیا ہے میں پہلے اس تحریر کی تلخیص پیش کرتا ہوں جو السید مصطفیٰ العروسی نے لکھی ہے:

بعض صوفیہ سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والا راستہ کون سا ہے؟ اس سوال کا انھوں نے یہ جواب دیا:

اچھی طرح سمجھ لو کہ تمام امور کی ابتدا جس چیز سے ہوتی ہے اور جس کے بغیر کسی دوسری شے سے نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا وہ عقل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عقل عطا کی ہے۔ جو اُن کے لیے نور بھی ہے اور زینت بھی، اسی سے بندوں کو یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اللہ ان کا خالق ہے اور وہ مخلوق ہیں، وہ مدبر ہے اور بندوں کے تمام معاملات اسی کی تدبیر سے وابستہ ہیں، وہ باقی ہے اور بندے فانی ہیں اسی عقل کی دلیل سے انھیں حُسن و قبح کا علم حاصل ہوتا ہے

اور وہ اچھے اور بُرے میں تمیز پیدا کرتے ہیں اسی کے ذریعے وہ جانتے ہیں کہ جہل تاریکی ہے اور علم نور ہے اسی سے انھیں معرفت حاصل ہوتی ہے کہ اللہ نے انسانوں کو محض کھیل کے طور پر عبث پیدا نہیں کیا ہے۔ یہی عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ خالق کو بعض چیزیں پسند ہیں اور بعض چیزیں ناپسند ہیں۔ کچھ چیزیں اس کی اطاعت و فرماں برداری میں داخل ہیں اور کچھ اس کی معصیت اور نافرمانی میں ۔ یہاں تک عقل انسان کو پہنچا دیتی ہے لیکن وہ چیزیں کیا ہیں جن سے خدا خوش یا ناخوش ہوتا ہے اور اس کی اطاعت کن چیزوں میں ہے؟ اور نافرمانی کن چیزوں میں؟ یہ بات عقل بطورِ خود نہیں جان سکتی۔ یہاں آکر اس کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا ذریعۂ علم صرف وہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں پر نازل فرماتا ہے اسی سے اللہ کے امر و نہی اور وعدہ و وعید کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب تک ایمان نہ لائے وحیِ الٰہی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ایمان لائے بغیر وہ حق و باطل کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ مومن کی عقل ہی اسے یہ بتاتی ہے کہ صبر کا بوجھ اس وقت تک ہلکا نہیں ہو سکتا جب تک انسان اللہ کے افعال سے اپنے آپ کو راضی نہ کرلے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ رضا بقضا سے صبر کی تلخی کم ہو جاتی ہے۔ عقل ہی مومن کو زہد و تقویٰ اور صدق و یقین کے مقامات تک رہنمائی کرتی ہے۔

اس تفصیل سے ہمیں معلوم ہوا کہ عبادت کی باگ عقل کے ہاتھ

میں ہے۔ وحیِ الٰہی دلیلِ راہ اور ایمان چراغِ راہ ہے، عمل سے راہ طے ہوتی ہے اور صبر اللہ سے قریب کرنے والی قوت ہے۔ جو صبر نہیں کر سکتا وہ کمزور ہو جاتا ہے اور جو کمزور ہو جاتا ہے وہ عمل نہیں کرتا اور جو عمل نہیں کرتا اس کا نور مکمل نہیں ہوتا اور جس کی روشنی غائب ہو جاتی وہ اندھا ہو جاتا اور سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے خوش نصیب بندے ہوتے ہیں جو ابتدائے شعور سے موت تک اللہ کی اطاعت پر ثابت قدم رہتے ہیں، گنہگاری اور معصیت کاری کا کوئی دور ان کی زندگی میں نہیں آتا لیکن اکثر لوگ وہی ہوتے ہیں جنھیں اپنے گناہوں سے توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور پھر استقامت کی دولت سے نوازے جاتے ہیں۔ بہر حال، استقامت سعادت کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے دوستوں کو استقامت عطا فرمائے۔ (۱)

یہ تحریر بابِ استقامت کی ایک اچھی تمہید ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ انسان جب تک انصاف کے ساتھ اپنی عقل استعمال نہ کرے کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

"استقامت" عربی میں کجی اور ٹیڑھے پن کی ضد کو کہتے ہیں یعنی کسی چیز کا سیدھا اور درست ہونا۔ طریقِ مستقیم اس راستے کو کہتے ہیں جو خطِ مستوی کی طرح سیدھا ہو، اسی مناسبت سے دینِ اسلام کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے یعنی وہ دین جس میں کوئی کج و پیچ، بے اعتدالی اور انحراف نہیں۔

---

(۱) نتائج الافکار القدسیہ ج ۳ ص ۱۲۳

انسان کی استقامت کے معنی یہ ہیں کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک اسلام کی صراطِ مستقیم پر چلتا رہے اور اس سے منحرف نہ ہو۔ تصوف کی اصطلاح میں استقامت سلوک الی اللہ کی راہ میں اعتدال کی روش اختیار کرنے کو کہتے ہیں ایسا اعتدال جس میں کسی دوسری طرف جھکاؤ نہ پایا جائے (۱) تصوف میں "سلوک" کی اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اس راستے پر چلے جس پر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم چلے تھے، وہ بدعت اور ہر اس چیز سے بچے جس سے سنتِ رسول کی مخالفت لازم آتی ہو۔ (۲) "استقامت" کا سبب شرعی احکام سے کامل واقفیت اور خواہشاتِ نفس کی مخالفت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص شرعی احکام کی کامل واقفیت نہیں رکھتا یا خواہشاتِ نفس کی مخالفت نہیں کرتا تو اسے استقامت نصیب نہیں ہو سکتی۔ استقامت کا ثمرہ اور اس کا نتیجہ آخرت میں مناقشۂ حساب اور عذاب سے سلامتی اور دنیا میں شریفانہ اور اچھے اخلاق سے آراستگی ہے (۳) استقامت کے مطلوب ہونے کی دلیل کے طور پر رسالۂ قشیریہ اور اس کی شرح میں قرآن کی یہ دو آیتیں پیش کی گئی ہیں:

(۱) اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ٥ (حٰمٓ السجدہ ع ۴)	جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو، نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

(۱) شرح رسالہ قشیریہ ج ۲ (۲) نتائج الافکار ج ۳ (۳) شرح رسالہ ج ۳

اس آیت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں "استقامت" کی تفسیر اور اس کی شرح خود حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ امام قشیری نے اپنے رسالے میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل کی ہے۔ میں یہاں اس آیت کی وہ تفسیر نقل کرتا ہوں جو مولانا مودودی مدظلہٗ نے تفہیم القرآن جلد ۴ میں کی ہے وہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، یعنی محض اتفاقاً کبھی اللہ کو اپنا رب کہہ کر نہیں رہ گئے اور نہ اس غلطی میں مبتلا ہوئے کہ اللہ کو اپنا رب کہتے بھی جائیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنا رب بناتے بھی جائیں بلکہ ایک مرتبہ یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اس پر قائم رہے اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ اختیار نہ کیا نہ اس عقیدے کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش کی اور اپنی عملی زندگی میں بھی عقیدۂ توحید کے تقاضوں کو پورا کرتے رہے۔

توحید پر استقامت کا مفہوم کیا ہے اس کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ رضؓ نے اس طرح کی ہے:

حضرت انس رضؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "قَدْ قَالَهَا النَّاسُ ثُمَّ كَفَرَ أَكْثَرُهُمْ فَمَنْ مَاتَ عَلَيْهَا فَهُوَ مِمَّنْ اِسْتَقَامَ" بہت سے لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا مگر ان میں سے اکثر کافر ہو گئے، ثابت قدم وہ شخص ہے جو مرتے دم تک اس عقیدے پر جما رہا۔ (ابن جریر، نسائی، ابن ابی حاتم)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: لم یشرکوا

باللہ شیئًا لم یلتفتوا الی الٰہ غیرہ پھر اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ بنایا، اس کے سوا کسی دوسرے معبود کی طرف توجہ نہ کی (ابن جریر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ منبر پر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا "خدا کی قسم استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے لومڑیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑتے نہ پھرے۔" (ابن جریر)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اپنے عمل کو اللہ کے لیے خالص کر لیا۔" (کشاف)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اللہ کے عائد کردہ فرائض فرماں برداری کے ساتھ ادا کرتے رہے۔" (کشاف) (۱)

مصطفی عروسی نے مفسر ابوالسعود کے حوالے سے آیت کے پہلے ٹکڑے کی جامع تفسیر چند جملوں میں یہ کی ہے:

"جن لوگوں نے اللہ کی ربوبیت کا اعتراف اور اُس کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے یہ کہا کہ "اللہ ہمارا رب ہے" پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یعنی اس اقرار اور اس کے تقاضوں پر قائم رہے باقی رہی خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی تشریح، ایمان پر ثبات، اخلاصِ عمل اور ادائے فرائض تو یہ اسی کلی معنی کی جزئیات ہیں" (۲)

اس آیت میں ثابت قدم بندگانِ حق پر فرشتوں کے نزول کا بھی ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے اللہ کے صاحبِ استقامت بندوں کے دینی و دنیوی امور میں بطریقِ الہام ان کی مدد کرتے، ان میں شرحِ صدر کی کیفیت پیدا کرتے اور ان کے دل و

---

(۱) تفہیم القرآن جلد ۴ ص ۴۵۴ (۲) نتائج الافکار ج ۳ ص ۱۲۶

دماغ سے خوف و حزن دور کرتے ہیں۔ جس طرح کافروں کے ساتھی شیاطین ہوتے ہیں جو برائیوں کو مزین کر کے ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اسی طرح اللہ کے ثابت قدم بندوں کے ساتھی فرشتے ہوتے ہیں جو ہر آڑے وقت پر ان کو ڈھارس دیتے ہیں۔(۱)

استقامت کے سلسلے میں اس معنی کی آیت سورہ الاحقاف ع ۲ میں بھی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (آیت ۱۳)

یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اس پر جم گئے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

امام قشیری نے دوسری یہ آیت پیش کی ہے:

(۲) فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَکَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

(سورۂ ہود آیت ۱۱۲)

پس اے محمدؐ! تم اور تمھارے وہ ساتھی جو کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف پلٹ آئے ہیں ٹھیک ٹھیک راہِ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمھارا رب نگاہ رکھتا ہے۔

مصطفی عروسی نے اپنے حاشیے میں مفسر ابو السعود کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق عقائد سے بھی ہے، اُن اعمال سے بھی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے درمیان مشترک ہیں اور اُن اعمال سے بھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھے جیسے احکامِ شرعیہ کی تبلیغ، فرائضِ نبوت کی ادائگی اور

---

(۱) نتائج الافکار ج ۳ ص ۱۲۶

رسالت کی ذمہ داریوں کا تحمل، مختصر یہ کہ استقامت کا یہ حکم تمام اصلی و فرعی احکام اور تمام نظری و عملی کمالات کو شامل ہے اور اس بات کو بھی شامل ہے کہ احکام کی تعمیل سے اس طرح عہدہ برآ ہونا جیسا کہ حکم دیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا (۱)

مسلمانوں کو جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے اس کی حقیقت اس کے بعد والی آیت سے واضح ہوتی ہے، اس میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ:

"ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمھیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمھیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی" (سورۂ ہود آیت ۱۱۳)

یہ شیر کا زہرہ آب کرنے والی استقامت ہے اس میں ظالموں سے یارانہ تو دور کی بات ہے ان کی طرف میلان پر بھی عذاب جہنم اور اللہ کی نصرت و حمایت چھن جانے کی دھمکی دی گئی ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے جب امام نے یہ آیت پڑھی تو انھیں غش آگیا، جب بے ہوشی سے افاقہ ہوا تو لوگوں نے وجہ پوچھی، انھوں نے جواب دیا: "جب ظلم کی طرف میلان کی یہ سزا ہے تو ظالم کی سزا کیا ہوگی"۔

حدیث :

ریاض الصالحین کے باب استقامت میں امام نووی نے مسلم کے حوالے سے حضرت سفیان ابن عبداللہ کی وہ حدیث نقل کی ہے جس میں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کی ایک جامع تعلیم کے بارے میں سوال کیا تھا اور

---

(۱) نتائج الافکار ج ۳ ص ۱۲۶

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب میں فرمایا تھا قل اٰمنت باللہ ثم استقم (کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر ثابت قدم رہو)

بزرگوں کی تصریحات

امام قشیری لکھتے ہیں کہ "استقامت وہ درجہ ہے جس سے شرعی امور کی تکمیل ہوتی اور جس کے وجود پر تمام خیرات و حسنات کا حصول موقوف ہے جس شخص کو استقامت نصیب نہیں ہوئی اس کی تمام کوششیں ضائع ہوئیں اور اس کا حال اس عورت جیسا ہوا جس کے بارے میں کہا گیا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (النحل ع ۱۳)	اور اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے محنت سے سوت کاتا پھر اس کو توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

امام قشیری لکھتے ہیں کہ میں نے استاذ ابو علی دقاق کو کہتے ہوئے سنا کہ استقامت کے تین درجے ہیں" اس قول کا حاصل اجمال کے ساتھ یہ ہے کہ پہلا درجہ اصلاحِ ظاہر کا ہے یعنی اپنے ظاہری اعضا و جوارح کو شرعی احکام کے مطابق ٹھیک کیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے جن اعمال کا مکلف قرار دیا ہے ان کی تعمیل پر انھیں آمادہ کیا جائے۔ دوسرا درجہ اصلاحِ باطن کا ہے یعنی قلب کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ شرعی احکام کی تعمیل میں اخلاص پیدا کرے تاکہ ہر نیک کام کا مقصد اللہ کی رضا ہو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ تمام وارداتِ قلبی کو سنتِ محمدی کی ترازو میں تولا جائے اگر وہ اس کے مطابق ہوں تو ان پر عمل کیا جائے ورنہ ترک کر دیا جائے (۱)

ابو علی جوزجانی کہتے تھے کہ صاحبِ استقامت بنو، طالبِ کرامت نہ بنو کیونکہ

---

(۱) نتائج الافکار القدسیہ ج ۳

تمھارا نفس کرامت کا خواہاں ہے اور تمھارا رب تم سے استقامت کا مطالبہ کرتا ہے۔ تم ثابت قدم رہو اس طرح تم اپنے رب کا مطالبہ پورا کرو گے بخلاف اس شخص کے جو حصولِ کرامت کے لیے عمل کرتا ہے اس کا عمل اللہ کے لیے نہیں ہوتا اس لیے وہ مخلص نہیں ہے حالانکہ اسے اخلاص کا حکم دیا گیا ہے:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ (البینۃ)

اور ان کو حکم تو یہی ہوا تھا کہ اخلاصِ عمل کے ساتھ خدا کی عبادت کریں یکسو ہو کر۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری لکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو استقامت حاصل نہ ہو اور وہ مدعیِ کرامت ہو تو دو صورتیں ہوں گی یا تو وہ جھوٹ بول رہا ہوگا یا استدراج کے فتنے میں مبتلا ہوگا جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُکِّرُوْا بِہٖ فَتَحْنَا عَلَیْھِمْ اَبْوَابَ کُلِّ شَیْءٍ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰھُمْ بَغْتَۃً فَاِذَا ھُمْ مُّبْلِسُوْنَ ○

(الانعام ع ۵)

پھر جب انھوں نے اس نصیحت کو جو انھیں کی گئی تھی فراموش کر دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب اُن چیزوں سے جو اُن کو دی گئی تھیں خوب خوش ہو گئے تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس وقت مایوس ہو کر رہ گئے۔

استدراج:۔ استدراج کے لغوی معنی کسی کو کسی چیز سے بتدریج قریب کرنے کے ہیں۔ صوفیہ اور علماء استدراج ان خارق عادت چیزوں کو کہتے ہیں جو ایسے شخص سے صادر ہوں جو معصیت پر اصرار کر رہا ہو یا صاحبِ استقامت نہ ہو مثلاً اگر کوئی جوگی یا گناہوں میں مبتلا کوئی انسان ہوا میں اُڑتا یا پانی پر چلتا ہو تو اس واقعہ کو استدراج کہیں گے۔ یہ لفظ کتبِ تصوف میں "کرامت" کے مقابلے میں استعمال

ہوتا ہے۔ "کرامت" ان خارق عادت واقعات کو کہتے ہیں جو اللہ کے فرماں بردار اور صاحبِ استقامت نیک بندوں سے صادر ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی مومن متقی ہوا میں اڑتا یا پانی پر چلتا ہو تو اسے کرامت کہیں گے۔

استدراج کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نافرمان بندوں کو پہلے مصائب میں بتلا کرتا ہے تاکہ وہ متنبہ ہوں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں جب وہ اس سے متنبہ نہیں ہوتے تو وہ ان پر خوش حالیوں اور نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے، وہ ان نعمتوں کو مزید نافرمانیوں اور معصیتوں کا ذریعہ بناتے ہیں اور اس طرح بتدریج خدا کے غضب اور اس کے عذاب کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور جب ان کی مدتِ مہلت ختم ہو جاتی ہے تو قدرت کا دستِ انتقام ان کی گردن دبوچ لیتا ہے۔ سورہ الاعراف میں فرمایا گیا ہے:

"وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ" ۝

(الاعراف ع ۲۳)

اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کو بتدریج اس طریقے سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہوگا۔ اور میں ان کو مہلت دیے جاتا ہوں۔ میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔

استدراج کا لفظ ایک حدیث میں بھی استعمال ہوا ہے:

عقبہ بن عامرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا: جب دیکھو کہ دنیا میں بندے کو گناہوں پر اصرار کے باوجود اس کی محبوب و مطلوب چیزیں دی جا رہی ہیں تو سمجھ لو کہ یہ استدراج ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ والی آیت تلاوت فرمائی۔ (تفسیرِ مظہری ج ۳)

سورہ الاعراف کی آیت اور اس حدیث ہی سے "استدراج" کی وہ اصطلاح اخذ کی گئی ہے جو کتبِ تصوف میں مستعمل ہے۔

صوفیۂ کرام کے دو قول

متبع شریعت صوفیۂ کرام نے استقامت کو سب سے بڑی کرامت کہا ہے اور ان کا یہ قول صدفی صد صحیح ہے کیونکہ شیطان اور نفس پر قابو پائے بغیر استقامت حاصل نہیں ہوتی اور ان دو سرکشوں پر قابو حاصل کرنے سے بڑی کرامت اور کیا ہو گی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی خانقاہ میں ایک شخص آکر مقیم ہوا اور مہینوں وہاں رہا لیکن اس نے ان سے نہ کوئی تعلیم حاصل کی اور نہ ان سے اپنی کسی ضرورت کا اظہار کیا۔ جب وہ خانقاہ سے واپس جانے لگا تو انھوں نے خود اس سے پوچھا کہ تم یہاں بہت دنوں رہے اور اب واپس جا رہے ہو لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ کیوں آئے تھے اور اب کیوں واپس جا رہے ہو؟ اُس نے کہا، میں نے سُنا تھا کہ آپ بہت بڑے بزرگ آدمی ہیں، میں بہت دنوں یہاں رہا لیکن میں نے آپ سے کوئی کرامت صادر ہوتے ہوئے نہیں دیکھی اس لیے اب مایوس ہو کر واپس جا رہا ہوں۔ حضرت جنیدؒ نے اس سے سوال کیا یہ بتاؤ کہ اتنے دنوں میں تم نے مجھے کوئی ایسا کام کرتے ہوئے دیکھا جو سُنّت کے خلاف ہو؟ اس نے کہا میں نے آپ کو شریعت کے خلاف کوئی کام کرتے نہیں دیکھا۔ تب انھوں نے اس سے کہا کہ بھائی! اس سے بڑی کرامت اور کیا دیکھتے؟ —— ایک شاعر نے دوسرے انداز سے یہی بات کہی ہے: ؎

بیرونِ قبر لاف کرامت چہ میزنی ! ایماں اگر بگور بری صد کرامت است[1]

---

(۱) قبر سے باہر کرامت کی ڈینگ کیا مارتا ہے، اگر تو قبر میں اپنے ساتھ ایمان لے جائے تو یہ سب سے بڑی کرامت ہے۔

صوفیۂ کرام کا دوسرا قول یہ ہے: الاستقامۃ فوق الکرامۃ (استقامت، کرامت سے اونچے درجے کی چیز ہے) جب تک تصوّف کا یہ صحیح تصور قائم رہا وہ علوم شریعت ہی میں سے ایک علم تھا لیکن جب اس میں کشف و کرامت اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کو اصل کی حیثیت دے دی گئی تو وہ اختلاف اور بحث و نزاع کی آماجگاہ بن گیا۔

دعا

قرآن اور احادیث کی روشنی میں

دعا کی حقیقت

دعا کے لغوی معنے ہیں پکارنا، بلانا، مانگنا اور سوال کرنا اور شرعی اصطلاح میں دعا کے معنے ہیں اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں استغاثہ اور عرض معروض کرنا۔ دعا کی حقیقت دو چیزوں سے مرکب ہے۔ اللہ کے حضور اپنی عبودیت، غلامی، احتیاج، عاجزی اور ضعف وذلت کا اظہار اور اس کی الوہیت، ربوبیت، قدرت، رحمت اور عظمت وجلال کا اقرار۔ انسان جب اپنی بندگی وپستی اور اللہ رب العالمین کی آقائی وبالادستی کے زندہ شعور واحساس کے ساتھ اس کی بارگاہ میں عرض نیاز کرتا اور اس سے کچھ مانگتا اور کچھ چاہتا ہے تو دعا کی حقیقت وجود میں آتی ہے۔ وہ اپنے مالک کو کبھی دل ہی دل میں پکارتا ہے اور اکثر اس کی زبان بھی اس کے دل کا ساتھ دیتی ہے۔ کبھی ہاتھ پھیلائے بغیر اس سے مانگتا ہے اور اکثر دست سوال

دراز کر کے اس کے حضور گڑگڑاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کا اظہار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو مغز عبادت بلکہ عین عبادت قرار دے کر کیا ہے۔

عن انس بن مالک عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الدعاء مخ العبادۃ (ترمذی ج ۲ ابواب الدعوات)	انس بن مالک سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دعا مغز عبادت ہے۔

حضورؐ نے دعا کو مغز عبادت یا روح عبادت اس لئے فرمایا ہے کہ دعا کرنے والا ماسوی اللہ سے اپنی تمام امیدیں منقطع کر کے اللہ کو پکارتا ہے اور یہی توحید اور اخلاص کی حقیقت ہے اور توحید و اخلاص سے بلند تر کوئی عبادت نہیں ہے۔ محی الدین ابن عربی کہتے ہیں کہ جس طرح جسم کے تمام اعضاء ہڈیوں کے مغز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح دعا وہ مغز ہے جس سے عابدوں کی عبادت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں حضورؐ نے قرآن کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے دعا کو عین عبادت بھی کہا ہے۔ ہم یہ حدیث آگے "دین میں دعاء کی اہمیت" کے تحت نقل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ دعا کو عبادت یا مغز عبادت اسی وقت قرار دیا جا سکتا ہے جب دونوں کی حقیقت ایک ہو۔ کتاب و سنت کے بیسیوں دلائل و شواہد سے ثابت ہے کہ عبادت کی حقیقت بھی وہی ہے جو دعا کی ہے یعنی یہ کہ انسان اپنی عبودیت کا اظہار اور اللہ کی معبودیت کا اعتراف و اقرار کرے۔ تمام عبادتیں اسی اظہار و اقرار کے مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم اللہ کی پرستش کریں یا اس کی اطاعت، ہماری ہر پرستش اور ہر اطاعت اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کی معبودیت کا اقرار ہے۔

دین میں دعا کی اہمیت

دین میں دعا کی اہمیت یہ ہے کہ اس کائنات کے معبود برحق نے اپنی کتاب قرآن مجید میں جس طرح بہت سے احکام و اوامر نازل فرمائے ہیں اسی طرح دعا کا حکم بھی نازل فرمایا ہے، اس کا اپنے بندوں سے مطالبہ ہے کہ وہ اس سے اور صرف اسی سے دعا مانگیں اور مدد کے لئے اسی کو پکاریں اس لئے کہ سب کچھ اسی کے دست قدرت میں ہے اور اس کائنات میں اس کی مشیت کے بغیر ایک پتّا بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ اور اس لئے بھی کہ دعا عبادت ہے اور عبادت کسی دوسرے کی جائز نہیں ـــــ سورہ المومن ر ۶ آیت ۶۰ میں حکم دیا گیا ہے:۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِیْ	اور تمہارا رب کہتا ہے
أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِیْنَ	مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں
یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ	قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ
سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ	میری عبادت سے گھمنڈ کرتے ہیں
دَاخِرِیْنَ ۝	وہ عنقریب ذلت و خواری کے
(المومن ۶۰)	ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔

اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کو عین عبادت قرار دیا ہے۔

عن النعمان بن بشیر عن النبی	نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال الدعاء	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دعا
ھو العبادة ثم قرا وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِیْ	عین عبادت ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت
أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ	تلاوت فرمائی اور تمہارا رب کہتا ہے

عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ۔

(ترمذی ابواب تفسیر القرآن ابن حبان۔ احمد۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ حاکم)

مجھے پکارو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ میری عبادت سے گھمنڈ کرتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔

یہ حدیث امام ترمذی نے ابواب الدعوات میں بھی روایت کی ہے۔ اس آیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے دین میں دعا کی اہمیت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ سے دعا کا صرف حکم ہی نہیں دیا گیا ہے بلکہ ترکِ دعا پر شدید وعید بھی سنائی گئی ہے۔

سورۂ الاعراف میں کچھ تفصیل سے دعا کا حکم دیا گیا ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

۵۵-۵۶

اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے یقیناً وہ حد سے گذرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔

ان دو آیتوں میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) اپنے رب سے دعا کرو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ اس ہدایت میں دعا کی حقیقت اور اس کے ادب کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔ ہم آگے دعا کے آداب ایک مستقل عنوان کے تحت لکھیں گے۔

(۲) اس کو پکارو خوف اور امید کے ساتھ۔ خوف اس کے عذاب کا اور امید

اس کے فضل وکرم کی نیز ڈر اس بات کا کہ دعا میں کسی کوتاہی کی وجہ سے وہ رد نہ کر دی جائے اور امید اس بات کی کہ اللہ اپنے بندے کے عجز وقصور کو دیکھتے ہوئے اسے قبول فرمالے گا۔

(۳) دوسرے اعمال کی طرح دعا میں بھی حد سے تجاوز نہ کرو۔ اس لیے کہ اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ دعا میں حد سے تجاوز کی صورتیں ہم آئندہ آداب دعا کے تحت بیان کریں گے۔

(۴) اصلاح کے بعد زمین میں فساد نہ مچاؤ۔ سب سے بڑا فساد یہ ہے کہ اللہ سے منھ موڑ کر دوسروں کو اپنا ملجا وماویٰ بنایا جائے، ان کو مدد کے لیے پکارا جائے اور ان کے نام کی دہائی دی جائے۔

(۵) جو لوگ خوف اور امید کے ساتھ صرف اللہ کو پکارتے اس سے دعائیں کرتے ہیں وہ محسن ہیں۔ اور اللہ کی رحمت محسنوں سے قریب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی دعا بندے کو درجۂ احسان تک پہنچا دیتی ہے۔ سورۂ اعراف ہی میں دوسرے مقام پر کہا گیا ہے:۔

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی	اللہ کے بہت سے اچھے نام ہیں تو
فَادْعُوْہُ بِہَا (ر۲۲۔۔۔۱۸۰)	تم اسے انہیں ناموں سے پکارو۔

اللہ کے اسمائے حسنیٰ قرآن میں بھی ہیں اور احادیث میں بھی اور چونکہ اس کی صفات بے شمار ہیں اس لیے کتنے ہی ایسے نام ہوں گے جن کا علم صرف اسی کو ہے۔ چنانچہ ایک دعا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ اس آیت کی بھی بہترین تفسیر ہیں۔ اس دعا کا متعلقہ ٹکڑا یہ ہے:۔

اسئلك بكل اسم هو لك	میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے
سميت به نفسك او انزلته في	ہر اس نام سے جس سے تو نے اپنے آپ کو

كتابك او علمته احدا من خلقك او استاثرت به فى علم الغيب عندك.

(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ط ۲۶۹)

موسوم کیا ہے یا وہ نام تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس کا علم عطا کیا ہے یا اسے تو نے اپنے ہی علم غیب میں اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔

سورہ البقرہ میں فرمایا گیا:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝

(۲ر ۲۳ — ۱۸۶)

میرے بندے جب تم سے میرے متعلق پوچھیں تو میں ان سے قریب ہی ہوں ۔ قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے۔ لہٰذا انہیں چاہیئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ راہ راست پالیں۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے کہ میں اپنے بندوں سے دُور نہیں ہوں کہ انھیں زور سے مجھے پکارنے کی ضرورت پڑے۔ میں تو ان کے قریب ہی ہوں۔ مجھے نہ زور سے پکارنے کی ضرورت ہے اور نہ میری بارگاہ میں درخواست پیش کرنے کے لیے کسی دوسری ہستی کے واسطے کی حاجت ہے۔ میرا ہر بندہ بلا واسطہ مجھ سے دعا کر سکتا ہے۔ میں اس کی دعا کو صرف سنتا ہی نہیں ہوں بلکہ اسے قبول بھی کرتا اور اس کے بارے میں فیصلہ بھی کرتا ہوں۔ جب ایسا ہے تو میرے بندوں پر بھی لازم ہے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ آیت کے اس ٹکڑے سے معلوم ہوا کہ یہ بڑی نادانی ہوگی کہ انسان اللہ کی اطاعت تو نہ کرے لیکن یہ توقع رکھے کہ اس کی دعائیں قبول کی جائیں گی۔

دراصل اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت ہی انسان کو اس کا مستحق بناتی ہے کہ اس کی دعا قبول کی جائے۔

رسول خدا کو دعا کا حکم

اوپر کی آیتوں میں بالعموم تمام بندوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے رب سے دعا مانگیں اور اسے پکاریں۔ اب ہم ایسی آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں اللہ نے اپنے سب سے مقرب، سب سے محبوب اور سب سے بلند مرتبہ بندے کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اس سے دعا مانگیں۔ دین میں دعا کی اہمیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا گیا اور آپ نے اس حکم کی ایسی تعمیل کی جس کی کوئی مثال تاریخِ انسانی میں موجود نہیں ہے۔

اضافۂ علم کی دعا

وَقُل رَّبِّ زِدنِي عِلمًا۔ (طٰہٰ ر۶ — ۱۴)

اور دعا کرو کہ اے پروردگار، مجھے مزید علم عطا کر۔

ابتدا میں جب حضورؐ پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپ مشتاقانہ عجلت میں حضرت جبریل کے ساتھ ساتھ اسے دہراتے جاتے اس اندیشے سے کہ کہیں کوئی لفظ ذہن سے نکل نہ جائے۔ آپؐ کو اس مشقت سے اللہ نے روک دیا اور اس کا ذمہ خود لے لیا کہ قرآن آپؐ کو یاد رہے گا۔ البتہ سورۂ طٰہٰ میں یہ حکم دیا کہ تم مجھ سے اضافۂ علم کی دعا کیا کرو۔ مزید علم کی دعا سے ایک مراد یہ ہے کہ قرآن کے جو حصے ابھی نازل نہیں ہوئے ہیں اسے بھی عطا فرما اور دوسری مراد

یہ ہے کہ جو حصے نازل ہوئے ہیں اس کے معانی و مسائل و معارف کا بیش از بیش فہم عطا فرما۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اللہ کو اپنے بندے کی دعا بے حد محبوب ہے اور دوسری یہ کہ علم دین میں اضافہ انتہائی پسندیدہ چیز ہے۔ اس چھوٹی سی آیت سے دین میں دعا اور علم دونوں ہی کی اہمیت و فضیلت پر روشنی پڑتی ہے۔

غلبہ واقتدار کی دعا

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا۔ (بنی اسرائیل — ۸۰)

اور دعا کرو کہ پروردگار جہاں بھی تو لیجا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور مجھ کو اپنے پاس سے ایسا غلبہ دے جس کے ساتھ تیری نصرت ہو۔

جب مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا زمانہ قریب آیا تو اللہ نے اپنے آخری رسول کو یہ حکم دیا کہ غلبہ و اقتدار کی دعا مانگیں اس لیے کہ آپ کی ہجرت اللہ کے باغیوں سے جنگ کا پیش خیمہ تھی اور اس کے لیے تین چیزیں ضروری تھیں۔

(الف) اس بات کی واضح دلیل اور کھلا ہوا بینہ کہ آپ ہی سچائی کے علمبردار ہیں اور جو دین آپ پیش کر رہے ہیں وہی دین حق ہے اور وہی اس کا مستحق ہے کہ دوسرے باطل ادیان پر غالب ہو۔

(ب) حکومت کا اقتدار تاکہ اس کے ذریعے نیکی کو فروغ دیا جائے اور بدی کو مٹایا جائے۔

(ج) اللہ کی نصرت کیونکہ اس کے بغیر دشمنوں پر فتح حاصل نہیں کی جا سکتی۔ سلطانا نصیراً کے فقرے میں یہ تینوں چیزیں داخل ہیں۔ ظاہر ہے کہ غلبہ و اقتدار

کے بغیر نہ دین باطل کو شکست دی جا سکتی ہے اور نہ قرآن کے تمام فرائض، احکام اور حدود کی تنفیذ ممکن ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے :- ان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن (اللہ تعالےٰ حکومت کے اقتدار سے ان چیزوں کا سد باب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا)

طلبِ حکومت کی لطیف دعا

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝	دعا کرو اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے جسے چاہے عزت بخشے اور جسے چاہے ذلت دے تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

(آل عمران ۳ - ۲۶)

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کا حکم دیا گیا تھا تو دشمنانِ اسلام کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صرف جزیرۃ العرب ہی نہیں بلکہ فارس و روم کی حکومتیں بھی مسلمانوں کو ملنے والی ہیں۔ مدینہ کے یہودی اور منافقین مسلمانوں کو چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہوا دیکھ کر ان پر طنز و تعریض کے تیر برساتے تھے وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مدینہ کی یہ چھوٹی سی ہیئت اجتماعیہ روم و فارس کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لے گی۔ ایسے موقع پر اللہ نے اپنے رسول کو اس دعا کی تلقین کی جس میں ان کے طنز و تعریض کا انتہائی لطیف جواب بھی دے دیا گیا ہے۔

ابن جریر نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے درخواست کی تھی کہ فارس اور روم کی سلطنت آپؐ کی امت کو عطا کردی جائے۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور امام رازی نے حسن بصری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس آیت میں اللہ نے اپنے نبی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ فارس اور روم کی حکومت طلب کریں اور موجودہ زمانے کے بعض ذی علم مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں بشارت دی گئی ہے کہ امامت وسیادت کا وہ منصب جس پر بنی اسرائیل اب تک فائز رہے ہیں اب وہ بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ بہرحال اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت لطیف انداز میں امامت، سیادت اور حکومت طلب کرنے کی دعا کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت طلبی کی یہ دعا دنیا پرستی کے لئے نہیں سکھائی گئی ہے بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ اور اللہ کے نازل کئے ہوئے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے سکھائی گئی ہے اور اس مقصد کے لیے حصول اقتدار کی دعا عین امر الٰہی کی تعمیل ہے۔ اسی مقصد کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے لیے ایک ایسی بے مثال حکومت کی دعا مانگی تھی جو ان کے سوا کسی کو نہ دی گئی ہو۔

ہدایت پر استقامت کی دعا

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ (الزمر ۵ - ۴۶)	(اللہ سے دعا میں) کہئے کہ اے اللہ آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے غائب اور حاضر کے جاننے والے آپ ہی اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ فرمائیں گے جن میں وہ باہم اختلاف کرتے تھے۔

اس دعا میں یہ لطیف انداز اختیار کیا گیا ہے کہ اس میں صرف اللہ کی حمد وثنا کی گئی ہے اور اس کی حاکمیت کا اظہار کیا گیا ہے اور دعائیہ جز مخفی رکھا گیا ہے۔ اس مخفی جز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں ظاہر فرما دیا ہے۔ حضرت عائشہ رض کی ایک روایت میں ہے کہ حضور ص نماز تہجد کے افتتاح میں سورہ زمر کی یہ آیت فیما کانوا فیہ یختلفون تک پڑھتے تھے۔ اس کے بعد یہ دعائیہ فقرہ کہتے تھے:

اھدنی لما اختلف فیہ	حق کے بارے میں جو اختلاف پیدا
من الحق باذنک انک تھدی	کیا گیا ہے اس میں مجھے ہدایت پر قائم رکھ
من تشاء الی صراط مستقیم۔	بلاشبہ تو جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی
(مسلم بحوالہ ابن کثیر ج ۴ صفحہ ۵۶)	طرف ہدایت دیتا ہے۔

ابن کثیر نے مسند احمد کے حوالے سے متعدد ایسی حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن میں حضور ص نے اپنے صحابہ کو اس آیت کے ابتدائی کلمات کے ساتھ دعائیں سکھائی ہیں ان میں کی ایک دعا میں بروز قیامت اللہ کی رحمت کا سوال کیا گیا ہے۔ ان احادیث کو سامنے رکھ کر ہم آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں کہ اس آیت میں طلب و درخواست کا مخفی جز یہ ہے: اے اللہ! دنیا کے اندر ہمیں ان اختلافات کے ہجوم میں صراط مستقیم پر قائم رکھ اور آخرت میں ہمیں سرخروئی اور اپنی خوشنودی عطا فرما!

ہر برائی سے پناہ مانگنے کی دعا

انسان کو ہر قسم کی برائیوں پر ابھارنے والا شیطان اور اس کا جرگہ ہے۔ اس عدو مبین کی شرارتوں سے پناہ مانگنے کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیا گیا تھا۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔

(الاعراف ر۲۴، ۱۹۹-۲۰۰)

اے نبی! نرمی اور درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

حق کی وصیت، نیکی کی تلقین اور برائی سے اجتناب کی نصیحت ایسی چیزیں نہیں ہیں جو ہمیشہ ٹھنڈے پیٹوں قبول کرلی جائیں بلکہ اس راہ میں داعیانِ حق پر زیادتیاں بھی کی جاتی ہیں اور جاہلوں کی اشتعال انگیزیوں سے بھی انھیں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں تواصی بالحق کے ساتھ صبر، عفو و درگزر اور جاہلوں سے اعراض کا حکم بھی دیا گیا ہے لیکن یہ تدبیریں انسانوں کی شرارتوں کے مقابلے میں کارآمد ہوتی ہیں۔ شیطان کی اکساہٹوں اور اشتعال انگیزیوں سے بچنے کی تدبیر صرف یہ ہے کہ داعی حق اس سے اللہ کی پناہ مانگے جس کی قدرت شیطان پر بھی حاوی ہے۔ سورۂ حٰم السجدہ میں بھی انہیں الفاظ کے ساتھ آپؐ کو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے اور سورہ المومنون میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شیطان سے کس طرح اللہ کی پناہ مانگی جائے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنَ۔

(المومنون ر۶، ۹۶ تا ۹۸)

برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہترین ہو جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں اور دعا کرو کہ پروردگار میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں بلکہ اے میرے رب میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ان آیتوں میں بھی پہلے حکم دیا گیا ہے کہ برائی کو بھلائی سے دفع کرو اور اس کے بعد شیطان کی اکساہٹوں سے پناہ مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے اس لئے کہ اس کا علاج صرف اللہ کے دست قدرت میں ہے۔ ان آیتوں کے علاوہ قرآن کی سب سے آخری سورہ شیاطین جن وانس کی وسوسہ اندازیوں سے استعاذہ کے لئے ہی نازل کی گئی ہے۔ اس میں پناہ مانگنے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اس کے الفاظ بھی سکھائے گئے ہیں۔ سورۂ الناس سے پہلے سورۂ الفلق میں ہر شر اور ہر برائی سے اللہ کی پناہ مانگنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اسی لئے ان دونوں سورتوں کا نام "المعوذتین" ہے۔ ان دو مستقل سورتوں کو نازل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ استعاذہ اور تعوذ یعنی اللہ کی پناہ مانگنے کی دعاؤں کو دین میں کیا مقام حاصل ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے۔ غصے اور غضب کو دور کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھنے کی تعلیم دی ہے اور قرآن کی تلاوت شروع کرنے سے پہلے بھی "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

طلب مغفرت کی دعا

کسی کم درجہ کے انسان کی معمولی کوتاہی نظر انداز کی جا سکتی ہے لیکن کسی بڑے درجے کے انسان کی معمولی کوتاہی بھی قابل گرفت بن جاتی ہے۔ نزدیکاں را بیش بود حیرانی، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ اصولی بات یاد رکھنی چاہیئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو استغفار کا جو حکم دیا گیا ہے وہ ان کے بلند درجات کی مناسبت سے دیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ استغفار سے صرف کوتاہیاں معاف نہیں ہوتیں بلکہ اس سے درجات بھی بلند ہوتے ہیں۔ ان دونوں

باتوں کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی استغفار کا حکم دیا گیا ہے کہیں صرف اپنے لئے اور کہیں اپنے لئے بھی اور مسلمانوں کے لئے بھی۔

(۱) وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ۔
(المومنون ۱۱۸)

اور کہیئے اے میرے رب (میری خطائیں) معاف کر اور رحم کر اور تو سب رحم کرنیوالوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت سے پہلے مشرکین کے انکار آخرت اور معبودان باطل سے ان کی دعاؤں کی تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ غیر اللہ کو پکارنے اور ان کی دہائی دینے والے کافروں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد حضورؐ کو اپنے رب سے مغفرت اور رحمت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ صرف اللہ سے دعا توحید کی تکمیل بھی ہے۔

(۲) فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ۔
(المومن ۷ - ۵۵)

پس اے نبی، صبر کرو بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے قصور کی معافی چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے نصرت و حمایت کا جو وعدہ کیا ہے وہ سچا ہے اس لئے آپ صبر کے ساتھ اس کا انتظار کیجئے۔ اپنی کوتاہی کی معافی چاہتے رہیئے اور ہمیشہ اپنے رب کی حمد و تسبیح میں مشغول رہیئے۔

(۳) فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ۔
(محمد ۲ - ۱۹)

پس تم جان رکھو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور اپنے گناہ کی مغفرت طلب کرو اور مسلمان مرد اور عورتوں کے لیے بھی استغفار کرو۔ اللہ کو معلوم ہے

تمہاری بازگشت اور تمہارا گھر۔

استغفار کے حکم کی تعمیل حضورؐ نے اس طرح کی ہے کہ نمازوں کے اندر آپ جو استغفار کرتے تھے اس کے علاوہ بھی بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ روزانہ ستر بار اور بعض میں آتا ہے کہ روزانہ سو بار استغفار کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دعائیں، استعاذے اور استغفار مروی ہیں۔ اگر ان سب کو تشریح کے ساتھ جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب آسانی کے ساتھ تیار کی جا سکتی ہے۔

(۴) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝ — پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے مغفرت طلب کیجیے۔ بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔ (النصر)

جب حضور کی وفات کا زمانہ قریب آیا تو سورۂ اذا جاء نصر اللہ والفتح نازل ہوئی اور آپ کو اس میں بھی حمد و تسبیح اور استغفار کا حکم دیا گیا۔ صحیح احادیث میں مروی ہے کہ سورۂ النصر میں آپ کو زمانۂ وفات کے قریب ہونے کی خبر دی گئی تھی اور صحیح احادیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ نمازوں کے اندر بھی اور دوسرے اوقات میں بھی سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ (اے اللہ! اے ہمارے رب میں حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتا ہوں۔ اے اللہ مجھے بخش دے) پڑھا کرتے تھے۔

فرشتوں کو دعا کا حکم

قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ فرشتے ہر کام امر الٰہی کے تحت کرتے ہیں۔ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (فرشتے وہی کام کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے) اس کے پیش نظر یہ بات یقینی ہے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے جو دعا وہ کرتے

ہیں وہ بھی امر الٰہی کے ماتحت ہی ہے۔ فرشتوں کو بھی اللہ نے حکم دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے دعا کرتے رہیں۔ اللہ تعالےٰ کے اس حکم سے بھی دین میں دعا کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ فرشتوں کی طویل دعا سورہ المومن کی ابتدا میں ہے۔ میں یہاں اس کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:

"عرش الٰہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں۔ سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب تو اپنی رحمت اور علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچالے ان لوگوں کو جنھوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کرلیا ہے۔ اے ہمارے رب اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے) اور بچا دے ان کو برائیوں سے جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے بڑا رحم کیا یہی بڑی کامیابی ہے۔" (۱ آیۃ ۷ تا ۹)

ان آیتوں سے ایک طرف دین میں دعا کی اہمیت اور فضیلت معلوم ہوتی ہے اور دوسری طرف ان میں اپنے گناہوں سے تائب اور راہ حق پر چلنے والے مسلمانوں کے عظیم فضل و شرف کا ذکر ہے۔ تسلی یہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ کے مقرب ترین فرشتے خود اس کے حکم کے تحت ان کے لئے مغفرت اور دخولِ جنت کی دعا کر رہے ہیں تو پوری توقع ہے کہ ان کی دعا قبول کی جائے گی اور فضل و شرف یہ ہے کہ

بارگاہ الٰہی میں حاضر مقرب ترین فرشتے تک ان سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی طرف متوجہ ہیں اور بارگاہ الٰہی میں ان کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔

احادیث میں بھی متعدد مواقع پر اس کا ذکر ہے کہ فرشتے مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ایک موقع کی حدیث یہ ہے کہ جب مسجد میں نمازی، نماز باجماعت سے فارغ ہو جاتا ہے تو جب تک وہ اپنی نماز گاہ (مصلّیٰ) پر موجود رہتا ہے فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں اللھم صل علیہ اللھم ارحمہ (اے اللہ اس پر اپنی رحمت نازل فرما اے اللہ اس پر رحم فرما!) ایک حدیث میں ہے جب تک وہ مسجد میں کسی کو تکلیف نہیں دیتا جب تک وہ باوضو رہتا ہے فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔ بعض حدیثوں میں ہے کہ وہ اللھم اغفر لہ اللھم تب علیہ (اے اللہ اس کو بخش دے اے اللہ اس کی توبہ قبول کر) کہتے رہتے ہیں۔

غیر اللہ سے دعا شرک ہے

چونکہ دعا کی حقیقت عین توحید اور خود دعا عقیدہ توحید کا ایک بڑا مظہر ہے اس لئے قرآن نے غیر اللہ سے دعا کو شرک قرار دیا ہے اور اللہ تعالٰے نے اپنے بندوں کو صراحۃً اس سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے اس سلسلے کی بھی چند آیتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:۔

(۱) وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت کے لئے رواں دواں ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب، بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ کو چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو وہ

پرکاہ کے برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں پکارو
تو وہ تمہاری دعا نہیں سنیں گے اور اگر سن لیں تو تمہیں اس کا
جواب نہیں دے سکیں گے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار
کریں گے اور باخبر (اللہ) کی طرح تمہیں اس حقیقت کی صحیح خبر کوئی
نہیں دے سکتا۔ (الفاطر ۱۳-۱۴)

اس آیت میں غیر اللہ سے دعا کو بالفاظ صریح شرک کہا گیا ہے کیونکہ اس
سے پہلے ان کے مشرکانہ اعمال میں سے غیر اللہ سے دعا ہی کا ذکر ہے اور اس کے
بعد یہ کہا گیا ہے کہ قیامت میں وہ تمہارے شرک کا انکار کریں گے۔ بلاشبہ شرک
میں غیر اللہ کی پرستش، نذر و نیاز اور چڑھاوا سبھی داخل ہے لیکن آیت کا
سیاق بتا رہا ہے کہ یہاں اس سے اولین مراد غیر اللہ سے دعا ہی ہے۔ سورۂ الفاطر
ہی میں دوسری جگہ کہا گیا ہے:

(۲) (اے نبی!) ان سے کہو کبھی تم نے دیکھا بھی ہے اپنے
شریکوں کو جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہو؟ مجھے بتاؤ انھوں نے
زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ آسمانوں میں ان کی کیا شرکت ہے؟ (اگر
یہ نہیں بتا سکتے تو ان سے پوچھو) کیا ہم نے انھیں کوئی تحریر لکھ کر دی
ہے جس کی بنا پر یہ (اپنے شرک کے لیے) کوئی صاف سند رکھتے
ہوں؟ نہیں بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے
دیئے جا رہے ہیں۔ (فاطر ۴۰)

اس آیت میں بھی غیر اللہ سے دعا کرنے اور اس کی دہائی دینے کو شرک
قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کے پاس اس شرک کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ
حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ فریب میں

مبتلا کرنے والے جاہل پیر، دنیا دار فقیر، زر پرست پروہت اور مجاور ہیں جو اپنے معتقدین کو جھانسے دیتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح نذر نیاز اور چڑھاوے کی آمدنی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ نہ تو کوئی آسمان و زمین کی تخلیق میں اللہ کا شریک ہے اور نہ اس نے کسی کو یہ اختیار دیا ہے کہ لوگوں کی قسمت بنا یا بگاڑ سکے۔ اس لئے اللہ کے سوا کسی اور سے دعا کرنا یا اس کی دہائی دینا حماقت اور شیطان کے اغوا کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (یونس ۱۰۶)	اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اگر تو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہو گا۔

اس آیت میں غیر اللہ سے دعا کرنے اور اس کی دہائی دینے کی صریح ممانعت کے ساتھ وہ حقیقت بھی بتا دی گئی ہے جس کی وجہ سے لوگ ایسا کرتے ہیں۔ انسان اپنی حماقت اور شیطان کے اغوا کی وجہ سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کے پاس بھی اختیار و اقتدار اور ایسی قدرت ہے کہ وہ کسی دوسرے کو نقصان اور نفع پہنچا سکتا اور اس کی قسمت کو بنا اور بگاڑ سکتا ہے اس لئے اللہ نے اس آیت میں بھی اور متعدد دوسری آیتوں میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اس طرح کا اقتدار اللہ کے سوا کسی اور کے پاس نہیں ہے اور اس کی مشیت کے بغیر کوئی کسی کو نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسی طرح اس نے یہ حقیقت بھی کھول دی ہے کہ اگر اللہ کی طرف سے کوئی ضرر پہنچے تو اس کو اس کے سوا اور کوئی دفع نہیں کر سکتا اور اگر وہ کسی خیر کا ارادہ کرے تو کوئی نہیں جو اسے نفع پہنچانے سے روک سکے۔ سورہ یونس

کی آیت ۱۰۷ میں کہا گیا ہے:

"اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔"

قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اگر کوئی شخص غیر اللہ کی دہائی دیتا اور اس سے دعائیں مانگتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کو اپنا معبود بنا رہا اور اللہ کے ساتھ اس کو شریک قرار دے رہا ہے۔ غیر اللہ کی عبادت کرنے اور اس سے دعا مانگنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کی حقیقت ایک ہے۔

(۴) فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ (الشعراء ۲۱۳) — پس اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو، ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔

معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارنا اس کو معبود کی حیثیت دینا ہے اور اللہ کا قانون بے لاگ ہے، اس شرک میں جو بھی مبتلا ہوگا وہ اللہ کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

دعا کی اہمیت و فضیلت احادیث میں

دعا کے بارے میں اس کثرت سے احادیث مروی ہیں کہ کتب احادیث میں اس کے لئے مستقل ابواب مخصوص کرنے پڑے ہیں۔ میں پہلے دعا کی اہمیت و فضیلت کے سلسلے میں چند حدیثیں پیش کرتا ہوں:۔

دعا کا تاکیدی حکم

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کثرت

سے دعائیں مانگی ہیں کہ آپ کی دعاؤں سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔
اس کے علاوہ آیات قرآنی کے پیش نظر آپ نے اپنی امت کو اللہ سے دعا کرنے کا موکد حکم دیا ہے۔

(۱) ابن عمر رفعہ: ان الدعاءَ ینفع مما نزل و مما لم ینزل ولا یرد القضاء الا الدعاء فعلیکم بالدعاء

جمع الفوائد بحوالہ ترمذی (ابواب الدعوات)

حضرت ابن عمرؓ نے حضورؐ سے روایت کی ہے کہ دعا ان مصیبتوں اور بلاؤں کو دُور کرنے میں بھی نافع ہے جو نازل ہو چکی ہوں . . . . اور ان میں بھی جو نازل نہیں ہوئی ہوں اور قضا کو دعا کے سوا کوئی چیز ٹال نہیں سکتی پس تم پر لازم ہے کہ دعا کرو۔

"فعلیکم بالدعاء" (تم پر لازم ہے کہ دعا کرو) ایک موکد حکم ہے۔

(۲) ابن مسعودؓ رفعہ: سلوا اللہ مِن فَضلِہ فان اللہ یحب ان یسئل وافضل العبادۃ انتظار الفرج

(جمع الفوائد بحوالہ ترمذی)

ابن مسعودؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ سے اس کا فضل مانگو اس لیے کہ اللہ (اپنے بندوں کے) سوال کو پسند کرتا ہے اور تنگی میں کشائش کا انتظار بہترین عبادت ہے۔

تنگی و ترشی کی حالت میں یا کسی بھی مصیبت و بلا کے وقت کشادگیِ رزق اور دفع بلا کے انتظار کو بہترین عبادت اس لیے کہا گیا ہے کہ بندہ مومن اپنے آقا و مولا سے اس کے فضل و کرم کی بھیک مانگتا رہتا ہے وہ نہ اس سے تھکتا ہے نہ اکتاتا ہے اور نہ کشادگی و رفع بلا کے لیے کوئی غلط ذریعہ یا غلط طریقہ اختیار کرتا ہے بلکہ صرف اللہ کے فضل کی آس لگائے رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں بندے کا صبر و توکل

بہترین عبادت ہے۔

(۳) ابوھریرۃ رفعہ: من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (جمع بحوالہ ترمذی)

جو اللہ سے دعا نہیں کرتا اللہ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔

اس حدیث میں جو خبر دی گئی ہے وہ دعا کے بارے میں انتہائی مؤکد حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس حدیث کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے آپ کو غضب الٰہی سے بچانا چاہتا ہو اسے اللہ سے دعا مانگنا چاہیئے۔ یہ حدیث ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔ من لم یدع اللہ غضب علیہ

اسی اہمیت کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اوقات میں صحابہ کرامؓ کو دعاؤں کی باضابطہ تعلیم دی ہے اور ان کے الفاظ تک سکھائے ہیں۔

تکثیرِ دعا کا حکم

حضورؐ نے اپنے مقدس ساتھیوں کو تکثیرِ دعا کی بھی ترغیب دی ہے۔

(۱) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اقرب مایکون العبد من ربہ وھو ساجد فاکثروا الدعاء (ریاض الصالحین بحوالہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے پس تم بکثرت دعا مانگو۔

(۲) ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو دعا کے فوائد بتائے تو ان میں سے بعض نے عرض کیا ــ "تب تو یارسول اللہ ہم بکثرت دعا مانگیں گے۔" حضورؐ نے جواب دیا ــ "اللہ کا فضل تمہاری دعاؤں سے بہت زیادہ ہے" یعنی اللہ کا خزانہ فضل وکرم بے کراں ہے۔ اس لیے تمہاری کثیر دعاؤں کو قبول کرنے

کے بعد بھی اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ حضورؐ کے اس جواب میں تکثیر دعا کی کتنی دل آویز ترغیب ہے۔ یہ حدیث امام ترمذی نے حضرت عبادہ بن الصامتؓ سے ابواب الدعوات میں روایت کی ہے۔ پوری حدیث کا ترجمہ آگے ایک عنوان کے تحت آرہا ہے۔

دعا کی فضیلت

اذکار و عبادات میں دعا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باوقعت اور مکرم شے ہے۔

عن ابی ھریرۃؓ عن النبیؐ لیس شیئ اکرم علی اللہ من الدعاء (ترمذی)	اللہ کے نزدیک کوئی چیز دعا سے زیادہ مکرم نہیں ہے۔

یہ حدیث ابن ماجہ، احمد، بخاری (فی الادب المفرد) ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کی ہے۔ دعا کی فضیلت میں اگر اس ایک حدیث کے سوا کوئی دوسری حدیث نہ ہوتی جب بھی یہ کافی تھی۔ دعا کی جو حقیقت اس سے پہلے اس کتاب میں بیان کی گئی ہے اس کو سامنے رکھا جائے تو اس حدیث کو سمجھنا دشوار نہیں ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ جس طرح اللہ کو اپنے بندوں کا غرور، گھمنڈ اور تکبر سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ اسی طرح اس کو اپنے سامنے اپنے بندوں کی عاجزی، احتیاج اور عبودیت کا اظہار و اقرار سب سے زیادہ پسند ہے۔

(۲) دعا بندہ مومن کو اللہ کی رحمتوں کا مستحق بناتی ہے۔

ابن عمر رفعہ: من فتح لہ باب الدعاء فتحت لہ ابواب الرحمۃ۔ (جمع الفوائد بحوالہ ترمذی)	حضرت ابن عمرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا اس کے لیے

رحمت کے دروازے کھل گئے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ سے دعا مانگنے کی توفیق مل گئی اور جس کو دعا کا ذوق پیدا ہو گیا اس نے اپنے آپ کو اللہ کی رحمتوں کا مستحق بنا لیا وہ اس کو اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔

(۳) دعا سے درجات بلند ہوتے ہیں۔

ابوھریرۃ رفعہ: ان اللہ تعالیٰ لیرفع للرجل الدرجۃ فیقول انّٰی لی ھٰذا، فیقول بدعاء والدک لک (جمع، بحوالہ بزار)	حضرت ابوہریرہ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کا درجہ بلند فرماتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے یہ درجہ کہاں سے ملا۔ اللہ فرماتا ہے کہ اس دعا کے بدلے میں جو تیری اولاد نے تیرے لیے کی۔

ظاہر ہے کہ جب دعا سے والدین کے درجے بلند ہوں گے تو کیا دعا کرنے والی اولاد کے اپنے درجات بلند نہ ہوں گے؟ اسی معنے کی ایک حدیث موطا امام مالک میں بھی ہے۔

دعا کے شرائط و آداب

اب تک کی تفصیل سے ہمیں معلوم ہوا کہ دین میں دعا کی بڑی اہمیت ہے اور یہ ایک ایسی عبادت ہے جس سے اعراض اللہ رب العالمین کو سخت ناپسند ہے اور اب ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کے شرائط و آداب کیا ہیں۔ قرآن و احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عبادت شرائط و آداب سے خالی نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہم عبادات کے نتائج و ثمرات تو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن ان

کے شرائط و آداب کی تکمیل کی طرف دھیان نہیں دیتے۔

قرآن و احادیث میں دعا کے جو شرائط و آداب مذکور ہیں وہ تین قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔ کچھ شرائط و آداب دعا سے پہلے ہیں۔ کچھ اس کے اندر ہیں، اور کچھ اس کے بعد ہیں۔ اگر ہم مثال کے طور پر نماز کو اپنے سامنے رکھ لیں تو ان شرائط و آداب کو سمجھنا آسان ہو جائے گا کیونکہ نماز کے لیے بھی کچھ شرائط و آداب اس سے پہلے ہیں، کچھ اس کے اندر ہیں اور کچھ اس کے بعد ہیں۔ دعا سے پہلے کی دو شرطیں بڑی اہم ہیں :-

(۱) دین کو اللہ کے لیے خالص کر لینا

یہ ایک ایسی شرط ہے جو اللہ رب العزت کی تمام عبادتوں میں لگی ہوئی ہے۔ کوئی عبادت اس شرط کو پورا کیے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی کو شریک نہ کیا جائے۔ پرستش صرف اسی کی اور پیروی و اطاعت صرف اسی کے احکام و اوامر کی کی جائے۔ اس کے حکم کے علی الرغم کسی کی اطاعت نہ کی جائے اور جو کچھ کیا جائے صرف اسی کی رضا حاصل کرنے اور اسی کے حکم کی تعمیل کی نیت سے کیا جائے۔ کوئی عمل محض دکھاوے کے لیے نہ کیا جائے۔ ہر عبادت اور ہر اطاعت شرک اور ریا کی آمیزش سے پاک ہو۔ قرآن میں متعدد مقامات پر صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی عبادت کی جائے اور اس سے دعا مانگی جائے۔ اگر کوئی شخص اس شرط کی خلاف ورزی کر کے یہ توقع کرے کہ اس کی عبادت اور اس کی دعا بارگاہ الٰہی میں قبول کی جائے گی تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ عبادت کے بارے میں فرمایا گیا ہے :

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ (الزمر ۲-۳)

(اے محمدؐ!) یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے۔ لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے۔

اسی سورۂ زمر میں دوسری جگہ کہا گیا ہے:

قُلِ اللّٰهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِي ۝ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ (زمر ۱۴-۱۵)

کہدو کہ میں اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں گا تم اس کے سوا جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔

یہ ایک سخت تنبیہی انداز ہے جو غیر اللہ کی بندگی کرنے پر مشرکین کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح کی آیتیں قرآن میں اور بھی ہیں۔ مخصوص طور پر دعا کے لیے سورۂ الاعراف میں کہا گیا ہے:

وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (آیت ۲۹)

اور پکارو اس کو خالص اس کے فرماں بردار ہو کر۔

سورۂ المومن میں ہے:

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (آیت ۱۴)

پس اللہ ہی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے خواہ تمہارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بندگی و طاعت کو اللہ کے لیے خالص کر کے صرف اسی کو پکارنا، اس کی دہائی دینا اور اس سے دعا کرنا کافروں کو سخت ناگوار

ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی پکارسنا اور ان کی دہائی دینا پسند کرتے ہیں۔

سورۂ المومن ہی میں دوسری جگہ ہے :

هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مخلصین له الدین الحمد للہ رب العلمین (آیت ۶۵)	وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے۔ ساری تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

آج بہت سے مسلمانوں کا بھی حال یہ ہے کہ ان کی بندگی و اطاعت اللہ کے لیے خالص رہی ہے اور نہ ان کی دعا۔ وہ اوامر الٰہی کے علی الرغم دوسروں کی اطاعت بھی کر رہے ہیں اور اللہ کے ساتھ دوسروں کی دہائی بھی دے رہے ہیں۔ کاش وہ من گھڑت تاویلات کو ترک کر کے ان آیات پر غور کرتے۔

(۲) اکل حلال وکسب حلال

قبولیت دعا کے لیے دوسری اہم شرط یہ ہے کہ دعا کرنے والے کا رزق حلال ہو اور اس کی کمائی یا ذریعہ معاش بھی حلال ہو، حرام خوری کے ساتھ دعا قبول نہیں ہوتی۔ یہ شرط صراحت کے ساتھ صحیح حدیث میں مذکور ہے اور اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی دو آیتوں سے استشہاد فرمایا ہے۔ اس لیے کہنا چاہیے کہ اکل حلال وکسب حلال کی شرط اشارۃً خود قرآن میں مذکور ہے۔

امام مسلم نے کتاب الزکوٰۃ میں اور امام ترمذی نے سورۂ البقرہ کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت کی ہے کہ :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اے لوگو! بلاشبہ اللہ تمام نقائص وعیوب سے پاک ہے اور صرف حلال

اور پاک چیزوں ہی کو قبول فرماتا ہے اور اس کے متعلق اس نے مومنوں کو وہی حکم دیا ہے جو اپنے رسولوں کو دیا ہے۔ اللہ نے اپنے رسولوں سے فرمایا ہے: "اے میرے پیغمبرو تم پاک اور حلال غذا کھاؤ اور صالح عمل کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو میں پوری طرح اس سے باخبر ہوں۔" اور اپنے مومن بندوں سے اس نے کہا ہے۔

"اے ایمان لانے والو، تم میری دی ہوئی روزی میں سے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ۔"

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیہ الی السماء یارب یارب ومطعمہ حرام ومشربہ حرام وملبسہ حرام وغذی بالحرام فانی یستجاب لذالک۔

پھر آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو (کسی مقدس مقام میں) لمبا سفر طے کرکے آتا ہے پریشان مو اور غبار آلود مگر حال یہ ہوتا ہے کہ اس کا کھانا حرام، لباس حرام اور اس کا جسم حرام غذا سے پلا ہوا بس اس شخص کی دعا کس طرح قبول ہو۔

حضورؐ نے اپنے ارشاد میں جن دو آیتوں کا حوالہ دیا ہے ان میں سے پہلی سورۃ المومنون کی آیت ۵۱ ہے اور دوسری سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۲ ہے۔ قبولیت دعا کی اس شرط سے بھی مسلمان جو غفلت برت رہے ہیں اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دعا کے اندر کی شرطیں

قرآن اور احادیث میں دعا کے اندر کی تین اہم شرطیں مذکور ہیں۔

حضورِ قلب، تضرع، خوف و رجاء۔

حضورِ قلب کا مطلب یہ ہے کہ دعا کے وقت داعی کا دل اللہ کی طرف متوجہ اور اس کی بارگاہ میں حاضر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ زبان سے تو دعا کے الفاظ نکل رہے ہوں اور دل کہیں اور کی ہوا کھا رہا ہو۔ دعا کے وقت اگر دل غافل ہو تو وہ قبول نہیں ہوتی۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے:

واعلموا ان اللہ لا یستجیب دعاء من قلب غافل، لاہ	اور جان لو کہ اللہ دعا قبول نہیں کرتا کسی غافل دل کی۔ (کنز العمال جلد ۲)

اسی معنے کی حدیث طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے۔ اگر دل ہی حاضر نہ ہو تو پھر تضرع اور خوف و رجا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ جب آدمی دعا کر رہا ہو تو اسے شعور ہونا چاہیئے کہ وہ کیا کر رہا ہے، کیا کہہ رہا ہے اور کس سے کہہ رہا ہے۔

تضرع کی شرط صراحتاً قرآن میں مذکور ہے۔ اس مقالے کی پہلی قسط میں سورہ الاعراف کی آیت ۵۵۔۵۶ نقل کی گئی ہے اس کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ آیت ۵۵ کا پہلا ٹکڑا یہ ہے۔ اُدْعُوا ربکم تضرعًا (اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے) یہاں تضرع کا مطلب یہ ہے کہ دعا کرنے والا اللہ کے سامنے اپنی ذلت، عاجزی، پستی اور ضعف کے زندہ شعور اور تازہ احساس کے ساتھ دعا کرے۔ اس کا مطلب زور زور سے چیخ چیخ کر دعا کرنا نہیں ہے کیونکہ اس کی صراحتاً ممانعت آئی ہے اور یہ آدابِ دعا کے خلاف ہے جیسا کہ آئندہ صفحات میں آئے گا۔ مفسرین نے اس لفظ کی تفسیر تذلل تخشع اور استکانت کے الفاظ سے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے سامنے اپنے بندے کی عاجزی کو بے حد پسند فرماتا ہے۔ وہ جب اپنے آقا و مولیٰ کے سامنے گڑگڑا کر دستِ سوال دراز کرتا ہے تو

اس کے مالک کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ قرآن میں کفار و مشرکین کی جن کیفیات و حالات کی مذمت کی گئی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس کے سامنے گڑگڑائے۔

وَلقد اخذ ناهم بالعذاب	اور ہم نے ان کو آفت میں پکڑا
فما استكانوا لربهم وما	پھر نہ انھوں نے اپنے رب کے سامنے
يَتَضَرَّعُونَ ٥ (المومنون ر ۴)	عاجزی کی اور نہ گڑگڑائے۔

اور قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں تضرع اور اخلاص وہ چیز ہے جو دنیا میں کفار و مشرکین کو بھی بعض مصیبتوں سے بچا لیتی ہے۔ مشرکین پر ان کے شرک کی حماقت واضح کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے:

"اے محمدؐ! ان سے پوچھو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے؟ کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے تو نے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکر گذار ہوں گے۔ کہو! اللہ تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے۔ پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھیراتے ہو۔ (الانعام ۶۳، ۶۴)

مشرکین سے یہی سوال النمل میں اس طرح کیا گیا ہے:-

کون ہے جو بے زار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ اور (کون ہے جو) تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔ (آیت ۶۲)

ان آیتوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں تضرع اور اضطرار و بیقراری

کی کیفیت اسے بارگاہ الٰہی میں قابل قبول بنا دیتی ہے۔ دعا اور ذکر دونوں ہی میں تفرع اور خوف و رجا کا مقام وہی ہے جو نماز میں خشوع اور خضوع کا ہے۔ ذکر الٰہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے :

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ	اے نبیؐ! اپنے رب کو یاد کیا کرو۔
تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً	دل ہی دل میں گڑگڑاتے ہوئے اور
(الاعراف)	خوفِ خدا کے ساتھ۔

خوف اور امید کے ساتھ دعا کرنے کی تعلیم بھی الاعراف آیت ۵۶ میں صراحۃً موجود ہے۔ وادعوہ خوفاً وطمعاً (اور اس کو پکارو خوف کے ساتھ اور امید کے ساتھ) اللہ کے عذاب کا خوف اور اس کے ثواب کی امید وہ چیز ہے جو مومن کو راہ اعتدال پر قائم رکھتی ہے۔ وہ نہ اسے بے پروا اور نڈر ہونے دیتی ہے اور نہ اسے مایوس اور دل شکستہ بناتی ہے۔ خاص دعا کے لحاظ سے اس بات کا اندیشہ کہ کسی کوتاہی کی وجہ سے دعا رد نہ کر دی جائے۔ اسے دعا کے شرائط و آداب کی طرف متوجہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بیکراں کا خیال اسے قبولیت دعا کا امیدوار بناتا ہے۔ قرآن میں انبیاء کرام علیہم السلام اور صالح بندوں کی دعا و عبادت کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے اس میں خوف و رجاء کا خاص طور پر ذکر ہے۔ ایک مقام پر انبیاء کے مختلف حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ	یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ
فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّ	کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے
رَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ۝	ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے
(الانبیاء ۹۰)	جھکے ہوئے تھے۔

ایک جگہ صالحین کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (السجدہ ۱۶)

ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

ہمیں اپنی عبادتوں اور دعاؤں کو ان آیات کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہیے اور انھیں کھرا بنانے کی سعی کرنا چاہیے۔ یہی حقیقی تدبیر ہے ان کے نتائج و ثمرات حاصل کرنے کی۔

چند قابل احتراز چیزیں

چند چیزیں ایسی ہیں جن سے دعا میں احتراز کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ آداب دعا کے خلاف ہیں۔ میں اختصار کے ساتھ انھیں یہاں درج کرتا ہوں:-

(۱) دعا میں اللہ تعالےٰ کی مشیت کی شرط لگانا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ جو کچھ مانگنا ہو پوری قطعیت اور عزم کے ساتھ مانگنا چاہیے۔ بخاری شریف میں ہے:-

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دعا احدکم فلا یقل اللھم اغفر لی ان شئت اللھم ارحمنی ان شئت ولکن لیعزم المسئلۃ فان اللہ لا مکرہ لہٗ

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرے تو یوں نہ کہے کہ اے اللہ مجھے بخش دے اگر تو چاہے اے اللہ مجھ پر رحم کر اگر تو چاہے بلکہ بغیر شرط قطعیت کے ساتھ دعا کرے۔ اس لیے کہ اللہ پر جبر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر اللہ نہ چاہے تو زبردستی اس سے کوئی چیز حاصل نہیں

کی جا سکتی۔ اس لیے اس کے چاہنے کی شرط لگانا بے کار ہے اور ادب دعا کے خلاف بھی ہے۔

(۲) دعا میں تصنع اور تکلف کرکے مسجع و مقفّیٰ الفاظ استعمال کرنا غلط ہے کیونکہ اس طرح دعا کی روح اس سے غائب ہو جاتی ہے۔ نہ حضور قلب باقی رہتا ہے اور نہ تضرع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ذہن قافیے اور سجع کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک بار اپنے شاگرد حضرت عکرمہ کو چند ہدایتیں دیں، ان میں سے ایک یہ تھی:

فانظر السجع من الدعاء فاجتنبه فانی عهدت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ لا یفعلون ذالک (بخاری)

دعا میں سجع سے اجتناب کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو ایسا کرتے نہیں پایا۔

البتہ اگر بلا تکلف مسجع و مرصع الفاظ زبان سے نکلیں تو دعا ایک پارۂ ادب بھی بن جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر دعائیہ کلمات، بہترین پارہ ہائے ادب بھی ہیں۔

(۳) دعا میں اعتدار یعنی حد سے تجاوز کرنا بھی ایک غلط کام ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۵۵ میں فرمایا گیا ہے "اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

دعا میں حد سے تجاوز کرنے کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں:-

(الف) ناروا چیزوں کی طلب

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالےٰ سے ایسی چیزوں کی دعا کرنا جو ناروا اور ناجائز ہیں۔ اعتدار فی الدعا (دعا میں حد سے تجاوز کرنا) ہی کی ایک قسم ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دعا میں حد سے تجاوز کی یہ بدترین شکل ہے۔ ایسا کرنا حقیقت

دعا کی عین ضد ہے اور اس طرح کی دعاؤں سے انسان اللہ کے غضب میں گرفتار ہوسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک مسلمان جو سودی کاروبار کر رہا ہے اگر وہ اپنے اس کاروبار کی ترقی کے لیے اللہ سے دعا کرتا ہے تو وہ احمق اپنے آپ کو خدا کے غضب کا مستحق بنا رہا ہے اس لیے کہ قرآن میں سود خواروں کو اللہ و رسول سے جنگ کا چیلنج دیا گیا ہے۔ اللہ سے صرف ایسی ہی چیز مانگنی چاہیئے جس کے بارے میں پورا علم ہو کہ وہ جائز ہے۔

(ب) بلا ضرورت زور زور سے دعا کرنا

بلا ضرورت بآواز بلند دعا کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کی دو دلیلیں تو سورۂ الاعراف کی آیت ۵۵ میں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں چپکے چپکے دعا کرنے کا حکم ہے اور اصل قاعدے کے لحاظ سے ہر امر (حکم) وجوب کے لیے ہوتا ہے اور اگر اس کو وجوب کے لیے نہ مانا جائے تو کم سے کم اس کا پسندیدہ اور مستحب ہونا تو ثابت ہوتا ہی ہے۔ دوسری دلیل ان اللہ لا یحب المعتدین (اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا) کے ٹکڑے میں ہے۔ کلبی اور ابن جریج نے کہا ہے کہ اس آیت میں اعتداء سے مراد رفع الصوت فی الدعاء ہے یعنی دعا میں آواز بلند کرنا حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اس آیت کے علاوہ دوسری آیات و احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے ذکر اور دعا دونوں ہی میں آہستگی پسندیدہ ہے۔ اللہ کے ذکر میں آہستگی کا حکم سورۂ اعراف کی آیت ۲۰۵ میں ہے:

"اے نبی اپنے رب کو یاد کیا کرو دل ہی دل میں گڑگڑاتے ہوئے اور خوف کے ساتھ۔"

حضرت زکریا علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے ان کی ایک خاص دعا کا بیان قرآن میں اس طرح ہے:۔

إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُۥ نِدَآءً خَفِيًّا (مریم - ۳) جبکہ انھوں نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ اس آیت سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ آہستگی کے ساتھ دعا کرنا مستحب ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام بآواز بلند تکبیر کہنے لگے تو حضورؐ نے انھیں اس سے روکا اور فرمایا کہ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ ایک ایسی ذات کو پکار رہے ہو جو سمیع و قریب ہے اور وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔

امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ :-

"حضرت حسن بصریؒ کہتے تھے کہ کوئی شخص پورا قرآن حفظ کر لیتا تھا لیکن اس کے پڑوسی کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی تھی، اسی طرح کوئی شخص تہجد کی طویل نمازیں پڑھتا تھا اور اس کے پاس لیٹے ہوئے شخص کو اس کا شعور بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ ہم نے ایسے لوگوں کو پایا ہے جو اعمال خیر کے اخفاء میں مبالغہ کرتے تھے۔ ہم نے ان مسلمانوں کو دیکھا ہے جو دعا میں پوری محنت صرف کرتے تھے لیکن ان کی آواز بلند نہیں ہوتی تھی اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اپنے رب کو یاد کرو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔"

اس کے علاوہ انسان کا نفس دکھاوے اور شہرت طلبی کی طرف میلان رکھتا ہے اس لیے بآواز بلند دعا کرنے میں اندیشہ ہے کہ اس میں ریا کی آمیزش ہو جائے۔ اس سے بچنے کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ چیخ چیخ کر دعا نہ کی جائے۔ آجکل جلسوں میں اور مسجدوں میں زور زور سے دعا مانگنے کا جو رواج ہو گیا ہے وہ دعا کے اس ادب سے لاعلمی کی دلیل ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو سنن و نوافل سے فارغ ہو کر بآواز بلند دعا مانگنے لگتے ہیں۔ انھیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ دوسرے

دوسرے لوگوں کو جو ابھی نماز میں مشغول ہیں پریشانی ہو گی۔ البتہ اگر کوئی ضرورت داعی ہو تو درمیانی آواز کے ساتھ دعا مانگی جا سکتی ہے۔

(ج) دعا میں غیر ضروری الفاظ بڑھانا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ خود جامع دعائیں پسند فرماتے تھے بلکہ آپ نے غیر ضروری الفاظ بڑھانے پر تنبیہ بھی کی تھی۔ ہم یہاں اس طرح کی چند حدیثیں نقل کرتے ہیں:

عن عائشۃؓ قالت کان	حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم جامع دعائیں پسند
یستحب الجوامع من الدعاء ویدع	فرماتے تھے اور غیر جامع کو ترک کر دیتے
ماسوی ذالک (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)	تھے۔

"جامع دعا" کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آپ دنیا اور آخرت دونوں ہی کی بھلائیاں طلب فرماتے تھے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی دعاؤں کے الفاظ کم لیکن معانی بہت ہوتے تھے یعنی آپ اپنی دعاؤں کو غیر ضروری الفاظ بڑھا کر طویل نہیں کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے دعا کے اس ادب کو اچھی طرح ذہن نشین کیا تھا اور وہ غیر ضروری الفاظ کے اضافے کو دعا میں اعتداء (حد سے تجاوز) قرار دیتے ہیں۔ ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ حضرت سعد بن وقاصؓ نے اپنے ایک بیٹے کو دعا مانگتے ہوئے سنا وہ کہہ رہے تھے:

"اے اللہ! میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں اور اس کی نعمتیں،

اور اس کا ریشم اور یہ، اور یہ، اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں دوزخ

سے اور اس کی زنجیروں سے اور اس کے طوق سے۔"

جب وہ دعا ختم کر چکے تو حضرت سعد نے ان سے کہا تم نے خیر کثیر کی دعا

کی اور بہت سے شر سے پناہ مانگی اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو دعا میں حد سے تجاوز کریں گے اور بعض حدیثوں میں ہے کہ لوگ وضو میں اور دعا میں حد سے تجاوز کریں گے۔ جنت کی طلب میں اس کی تمام نعمتوں اور آسائشوں کی طلب خود بخود داخل ہے۔ اسی طرح دوزخ سے استعاذہ میں اس کی تمام سزاؤں اور زحمتوں سے استعاذہ خود بخود داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سعد نے جنت کی دعا کے ساتھ اس کی نعمتوں کی تفصیل اور جہنم سے استعاذے کے ساتھ اس کی سزاؤں کے ذکر کو ناپسند کیا اور ان غیر ضروری الفاظ کے اضافے کو ادب دعا کے خلاف قرار دیا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل نے اپنے بیٹے کو کہتے ہوئے سنا:

"اے اللہ میں تجھ سے قصر ابیض (سفید محل) مانگتا ہوں جنت کے داہنے جانب۔"

یہ سن کر انھوں نے کہا۔ جنت مانگو اور جہنم سے پناہ چاہو۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ عنقریب اس امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو وضو اور دعا میں حد سے تجاوز کریں گے۔ اس دعا میں انھوں نے غیر ضروری قید اور شرط کو ادب دعا کے خلاف قرار دیا۔ وضو میں حد سے تجاوز کی ایک صورت یہ ہے کہ بلاضرورت ہر عضو کو تین بار سے زیادہ دھویا جائے۔ اگر کسی شخص کو اپنی کوئی خاص اور وقتی حاجت و ضرورت کی دعا مانگنی نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ "دعاء ماثورہ" یعنی قرآن اور احادیث میں مذکور دعائیں مانگے۔ ان میں خاص برکت بھی ہے اور وہ ان تمام بے اعتدالیوں سے محفوظ بھی ہیں جو دعا میں انسان سے ہو سکتی یا ہو جایا کرتی ہیں۔

(د) دعا کو تقریر بنا دیا

جب دعا میں غیر ضروری الفاظ کا اضافہ بھی آداب دعا کے خلاف اور حد سے تجاوز کرنا ہے تو دعاؤں کو تقریر بنا دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ آج کل دیکھا جا رہا ہے کہ بعض لوگوں نے دعا کو خطابت کا ایک فن بنا دیا ہے۔ دعا اور ایک لمبی تقریر میں کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے۔ یہ دعا کے ساتھ بڑی بے ادبی کا رویہ ہے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

(ہ) اپنی حیثیت سے زیادہ کی طلب

دعا میں حد سے تجاوز کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان اپنی حیثیت سے بلند چیزوں کی دعا کرے۔ مثال کے طور پر اگر ہم اللہ سے تقرب کا وہ درجہ مانگیں جو انبیاء کرام کا ہے تو یہ آداب دعا کے خلاف ہوگا، یا کوئی مسلمان ایک طرف تو اللہ کی نافرمانیاں کئے جا رہا ہو اور دوسری طرف اس سے جنت کی دعا بھی مانگ رہا ہو حالانکہ اس کو سب سے پہلے نافرمانیوں سے باز آنا چاہیئے، توبہ کرنی چاہیئے اور اللہ سے اطاعت و عبادت کی توفیق مانگنی چاہیئے۔

آدابِ دعا

دعا کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ سینے تک اٹھا کر دعا مانگے اور دعا ختم کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیر لے۔ اگر دعا کرنیوالا باوضو اور قبلہ رو ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ فرض نمازوں کے بعد یا سنن و نوافل کے بعد جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان میں ان آداب پر بآسانی عمل کیا جا سکتا ہے اور مسلمان ایسا کرتے بھی ہیں۔ دعا سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا اور دعا کے بعد آمین کہنا بھی آداب دعا میں داخل ہے۔ دعا کے یہ

آداب، احادیث رسولؐ سے ثابت ہیں۔ میں طوالت کے خوف سے وہ حدیثیں یہاں نقل نہیں کررہا ہوں۔

دعاؤں کے لیے بہتر اوقات و حالات

دعاؤں کے لیے شریعت نے پنج وقتہ نمازوں کی طرح کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا ہے۔ دعا ہر وقت کی جا سکتی ہے لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاؤں کے لیے بہتر اوقات و حالات کا انتخاب کرنے سے ان کی مقبولیت کی زیادہ توقع پیدا ہو جاتی ہے۔ امام غزالی اور دوسرے علماء و صوفیاء نے ان اوقات و حالات کو یکجا کرکے بیان کیا ہے۔

ایک وقت تو پورے سال میں ایک بار آتا ہے جیسے یوم عرفہ۔ اور سال کے بارہ مہینوں میں ایک مہینہ رمضان المبارک اور بالخصوص شب قدر۔ بعض اوقات ہر ہفتہ آتے ہیں جیسے جمعہ کی رات اور جمعہ کا دن۔ بالخصوص نماز جمعہ کے دو خطبوں کے درمیان اور سورج ڈوبنے سے تھوڑی دیر پہلے ــــ بعض اوقات روزانہ آتے ہیں جیسے آخر شب میں سحر کا وقت۔ فرض نمازوں کے بعد۔ اذان و اقامت کے وقت اور اذان و اقامت کے درمیان۔ بارش کے وقت۔ سجدے کی حالت میں تکثیر دعا کی ترغیب دی گئی ہے۔ روزہ دار کے لیے افطار کا وقت۔ مسافر کے لیے ابتدائے سفر کا وقت اور حالت سفر میں۔ حالت اضطرار میں۔ اس حالت میں جب اللہ تعالےٰ کی عظمت اور قیامت کی ہولناکی کے تصور سے جسم پر لرزہ طاری ہو۔ دعاؤں کے لیے ان اوقات و احوال کے بہتر ہونے کے ثبوت میں قرآن کی آیات اور صحیح احادیث موجود ہیں۔ میں طوالت کے خوف سے انھیں یہاں نقل نہیں کررہا ہوں۔

مقبولیت دعا کی ایک اور شرط

دعا کے بعد اس کی مقبولیت کی ایک اور شرط یہ ہے کہ دعا کرنے والا اس کے لیے جلدی نہ مچائے۔ امام بخاری و مسلم دونوں ہی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے جو شخص بھی دعا کرے اس کی دعا اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جب تک وہ جلد بازی کر کے یہ نہ کہنے لگے کہ میں نے دعا کی لیکن وہ قبول نہیں کی گئی۔

امام مسلم کی روایت میں یہ ہے :۔

بندے کی دعا اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے اور جب تک وہ جلدی نہ مچائے۔ پوچھا گیا کہ استعجال (جلد بازی) کا مطلب کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دعا گو کہنے لگے کہ میں نے دعا کی پھر دعا کی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ قبول ہو گی اور پھر وہ دعا کرنا ترک کر دے۔

مقبولیت دعا میں جلد بازی چند نادانیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک نادانی یہ ہے کہ دعا کرنے والا دعا کی حقیقت ہی سے ناواقف ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ غلام، تسلیم و رضا کا پیکر بنا ہوا اپنے مہربان آقا کے دامن سے چمٹا رہے اور اس کے سامنے احتیاج کا ہاتھ پھیلائے رہے۔ دعا عبادت بلکہ مغز عبادت ہے اور عبادت کے اجر کا محل اصلاً یہ دنیا نہیں ہے بلکہ آخرت ہے۔ جلد باز دعا گو کی دوسری نادانی یہ ہے کہ وہ اپنی دعا کو ہر طرح قابل قبول سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہے وہ کیوں نہیں سمجھتا کہ مقبولیت دعا کی جو شرطیں ہیں وہ پوری نہ ہوئی

ہوں ۔ وہ جانتا ہے کہ آقا اس کا بخیل نہیں ہے اور نہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے ۔ وہ رحمٰن و رحیم بھی ہے، عادل بھی ہے، حکیم بھی ہے اور جواد و فیاض بھی ہے۔ اب اگر اس کی مانگی ہوئی چیز نہیں مل رہی ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہو گی ـــ تیسری نادانی یہ ہے کہ وہ مقبولیت دعا کا صحیح مطلب نہیں جانتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بندہ جو کچھ مانگے وہ ہر حال میں اسے دے ہی دیا جائے. خواہ اس کی مصلحت کے مطابق ہو یا نہ ہو، بلکہ دعا کی مقبولیت اللہ کی حکمت اور بندے کی مصلحت کے ساتھ مربوط ہے۔

انسان کی فطرت میں چونکہ جلد بازی داخل ہے اس لیے اس کے بُرے اثرات سے بچانے اور مطمئن کرنے کے لیے دعا کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتا دیا ہے کہ مومن کی دعا کبھی رد نہیں کی جاتی بلکہ ہمیشہ قبول کی جاتی ہے۔ البتہ قبول کرنے کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔

مومن کی دعا رد نہیں کی جاتی

(۱) عن سلمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ربکم حیی کریم یستحی من عبد اذا رفع یدیہ الیہ ان یردھما صفرا	حضرت سلمان فارسی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ تمہارا رب صفت حیا سے متصف اور کریم ہے جب اسکا بندہ اس کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے تو اسے حیا آتی ہے کہ ان ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔
(ترمذی، ابوداؤد، بیہقی)	

اس سے معلوم ہوا کہ بندہ مومن کے دعا میں اُٹھے ہوئے ہاتھ کبھی محروم اور خالی واپس نہیں آتے بلکہ اپنے مولائے کریم سے کچھ نہ کچھ لے کر لوٹتے ہیں لیکن

یہ بات ذہن سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہیے کہ قبولیت دعا کے آداب و شرائط کا لحاظ ضروری ہے۔ ان آداب و شرائط کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

(۲) عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم مامن مسلم یدعو بدعوۃ لیس فیہا اثم ولا قطیعۃ رحم الا اتاہ اللہ بہا احدی ثلٰث اما ان یعجل لہ دعوتہ واما ان یدخرھا لہ فی الاٰخرۃ واما ان یصرف عنہ من السوء مثلہا قالوا اذا نکثر قال اللہ اکثر

(ترغیب و ترہیب بحوالہ مسند احمد و بزار و ابویعلی)

حضرت ابوسعید خدری رضؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ جب کوئی مسلمان ایسی دعا کرتا ہے جس میں کوئی گناہ یا رشتے کو کاٹنے والی بات نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز عطا فرماتا ہے۔ (۱) جو کچھ اس نے مانگا ہے دنیا ہی میں اسے دے دے۔ (۲) اس کا اجر آخرت کے لیے ذخیرہ کر دے۔ (۳) جو خیر اس نے مانگی تھی اسی کے مثل کوئی شر اس سے دور کر دے۔ صحابہ نے کہا تب تو ہم بکثرت دعائیں مانگیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا: اللہ کا خزانہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

اسی مضمون کی حدیثیں حضرت عبادہ بن الصامت رضؓ، حضرت ابوہریرہ رضؓ، اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔ ان حدیثوں میں بھی قبولیت دعا کی ایک شرط مذکور ہے یعنی یہ کہ اس کی دعا میں کسی گناہ کی طلب یا قطع رحمی کی کوئی بات نہ ہو۔ دعا میں قطع رحمی کی ایک صورت یہ ہے کہ رشتہ داروں کے حق میں دعائے خیر کے بجائے بددعا کی گئی ہو۔

یہ حدیثیں مجھ جیسے عجلت پسند انسان کو اطمینان دلاتی ہیں کہ شرائط و آداب کے ساتھ کوئی بھی مخلصانہ دعا رد نہیں کی جاتی۔ ہم دنیا میں کوئی بھلائی مانگتے ہیں

اور وہ نہیں ملتی یا کسی مصیبت اور تکلیف کو دُور کرنے کی دعا کرتے ہیں اور وہ دُور نہیں ہوتی تو ہم دل شکستہ اور مایوس ہونے لگتے ہیں۔ یہ حدیثیں اس دل شکستگی اور مایوسی کو ختم کر دیتی ہیں اور ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ مانگنے کے باوجود دنیا میں ہمیں جو کچھ نہیں ملا اس کا بدلہ آخرت میں ضرور ملے گا اور وہاں جو کچھ ملے گا وہ بہتر بھی ہوگا اور پائندہ تر بھی۔

دعا کے بارے میں ایک بڑی غلطی کا ازالہ

فلسفۂ یونان کے اثر سے جب اسلامی عقائد اور اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات میں بحثیں شروع ہوئیں تو اسلامی لٹریچر میں ایک نئے علم 'علم کلام' کا اضافہ ہوا، اور تصوف بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فلسفہ اور علم کلام نے جو سب سے بڑا نقصان پہنچایا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی نگاہ سے قرآن اور احادیث کے دلائل اوجھل ہو گئے اور انھوں نے بھی فلسفیوں کی طرح عقلی و دماغی تیر تکے چلانے شروع کر دیئے۔ کتاب و سنت کے معقول دلائل انسان کے دل میں اطمینان اور یقین کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف فلسفہ کے عقلی دلائل قلب کو شک اور تردد میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بہرحال فلسفیانہ بحث و مباحثہ کی زد "دعا" پر بھی پڑی اور اس کے بارے میں بھی لوگوں نے عقلی تیر تکے چلانے شروع کر دیئے۔ تصوف میں بھی اس مسئلے میں متعدد اقوال پیدا ہو گئے۔ رسالہ قشیریہ میں جو تصوف کی قدیم اور مستند کتاب ہے وہ اقوال نقل کیے گئے ہیں۔

(۱) دعا کرنا افضل ہے۔ (۲) خاموش اور راضی برضائے الٰہی رہنا افضل ہے۔ (۳) بہتر یہ ہے کہ بندے کی زبان دعا گو رہے اور قلب راضی برضا رہے۔ (۴) مختلف اوقات و حالات کا حکم مختلف ہے۔ بعض حالات میں دعا کرنا خاموش

رہنے سے افضل ہے اور اس وقت کا یہی ادب ہے اور بعض حالات میں خاموش رہنا دعا کرنے سے افضل ہے اور اس وقت کا یہی ادب ہے۔ اس کا معیار یہ ہے کہ اپنے قلب کو دیکھے اگر وہ دعا کا اشارہ کرے تو دعا افضل ہو گی اور اگر سکوت کا اشارہ کرے تو سکوت افضل ہو گا۔ (۵) اپنے حال کا لحاظ کرے۔ اگر دعا کے وقت کیفیت بسط میں زیادتی محسوس کرے تو دعا افضل ہو گی اور اگر اس وقت کسی قسم کی اکتاہٹ اور "قبض" کی کیفیت محسوس ہو تو سکوت افضل ہو گا اور اگر نہ "بسط" میں زیادتی ہو اور نہ "قبض" میں تو دعا اور ترک دعا کا معاملہ برابر رہے گا۔ (۶) اگر ارادۂ دعا کے وقت "علم" غالب ہو تو دعا افضل ہے اس لیے کہ وہ عبادت ہے اور اگر اس وقت "معرفت" "حال" اور "سکوت" غالب ہو تو خاموش رہنا افضل ہو گا۔ (۷) جس دعا میں مسلمانوں کا حصہ ہو یا حق تعالےٰ کا اس میں حق ہو تو دعا بہتر ہے اور اگر اس میں خود تمہارے اپنے لیے حظ و نصیب ہو تو سکوت اولیٰ ہے۔

ان اقوال میں فلسفیانہ تصوف کی چند اصطلاحیں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ وقت، حال، اشارہ، بسط، قبض، علم، معرفت، سکوت —— دعا کے بارے میں قرآن و حدیث کی جو تصریحات اوپر گذریں انھیں پڑھیے اور پھر رسالہ قشیریہ میں منقول ان اقوال پر نظر ڈال لیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام اقوال تصوف میں فلسفے کو داخل کر دینے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم نہ فلسفۂ یونان کی افادیت کے قائل ہیں اور نہ ہمیں اجنبی عناصر سے مخلوط تصوف سے دلچسپی ہے اس لیے ان اقوال و اصطلاحات کی توضیح بے کار ہے۔ البتہ ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے جس کا تعلق حدیث نبوی سے ہے۔ دعا کے سلسلے میں دوسرا قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ خاموش اور راضی بقضا یا راضی برضائے الٰہی رہنا افضل ہے۔ اس قول کی دلیل کے طور پر رسالہ قشیریہ میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے:

وقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خبرا عن اللہ تعالےٰ من شغلہ ذکری عن مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین۔ (الرسالۃ القشیریۃ ص۱۱۹ مطبوعہ مصر)

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے جس شخص کو میرے ذکر نے مشغول کردیا مجھ سے سوال کرنے سے، میں اس کو دوں گا اس سے بہتر جو سوال کرنے والوں کو دیتا ہوں۔

راقم الحروف نے مشکوٰۃ، جمع الفوائد، ترغیب وترہیب اور کنز العمال میں یہ حدیث تلاش کی لیکن ناکام رہا البتہ قرآن کریم کی فضیلت کے بیان میں امام ترمذی اور دارمی نے یہ حدیث روایت کی ہے:۔

عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الرب تبارک وتعالےٰ من شغلہ القرآن عن ذکری ومسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین وفضل کلام اللہ علی سائر الکلام کفضل اللہ علی خلقہ (ھذا حدیث حسن غریب ترمذی قبیل ابواب القرأت)

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رب تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے جس کو قرآن نے مشغول کردیا میرے ذکر اور دعا سے میں اس کو عطا کروں گا اس سے بہتر جو سوال کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں پس دوسرے کلاموں پر کلام اللہ کی فضیلت ایسی ہے جیسے اللہ کی فضیلت اس کی مخلوق پر۔

امام دارمی نے یہ حدیث باب فضل کلام اللہ علی سائر کلام اللہ میں روایت ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

من شغلہ قراءۃ القرآن عن مسئلتی وذکری اعطیتہ

جس کو قرآن کی تلاوت نے مشغول کردیا مجھ سے سوال کرنے اور میرے ذکر

ثواب السائلین وفضل کلام اللہ علیٰ سائر الکلام کفضل کلام اللہ علیٰ خلقہ۔	سے میں اس کو دوں گا سوال کرنیوالوں سے بہتر اجر اور اللہ کے کلام کی فضیلت بقیہ دوسرے کلاموں پر ایسی ہے جیسے اللہ کی فضیلت اس کی مخلوق پر۔

یہ ایک ضعیف حدیث ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے کلام قرآن مجید کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اگر قرآن کی تلاوت میں اس درجہ مشغولیت رہی کہ قاری قرآن، اللہ کا کوئی اور ذکر اور اس سے دعا نہ کر سکا تو وہ اسے مانگنے والوں کے مقابلہ میں افضل اور بہتر چیز عطا کرے گا اور اس کی یہ وجہ بھی اس میں بیان کر دی گئی ہے کہ اللہ کا کلام چونکہ دوسرے تمام کلاموں سے افضل ہے۔ اس لیے اس کا اجر اور اس کی برکت بھی سب سے زیادہ ہو گی اس ضعیف حدیث میں شاغل (مشغول کرنے والا) قرآن ہے اور مشغول عنہ (مشغولیت کی وجہ سے جس کی طرف توجہ نہیں کی جاسکی) ذکر بھی ہے اور دعا بھی ہے۔ اسی حدیث میں کسی نے تحریف کر کے ان صوفیوں کو سُنا دی جو ترک دعا کو افضل قرار دیتے تھے اور انھوں نے بلا تحقیق اسے قبول کر لیا اور پھر صاحب رسالہ قشیریہ نے بھی اسے اپنی کتاب میں نقل کر دیا۔ تحریف کرنے والے نے تلاوت قرآن کو حذف کر کے ذکر کو شاغل اور دعا کو مشغول عنہ بنا دیا حالانکہ اس حدیث میں ذکر اور دعا دونوں ہی مشغول عنہ اور قرآن شاغل تھا۔

اصل میں رضا بقضا یعنی اللہ کے فیصلے اور اس کی مرضی پر راضی رہنے کا مطلب ان لوگوں نے صحیح نہیں سمجھا جو ترک دعا کو افضل کہتے ہیں ان کے خیال میں اللہ سے اپنے لیے کچھ مانگنا مقام تسلیم و رضا کے خلاف ہے حالانکہ یہ خیال قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف اور بالکل غلط ہے۔ حد ہو گئی کہ ابو سلیمان دارانی نے جو اپنے وقت کے ایک بڑے صوفی تھے "رضا" کی تعریف میں

یہاں تک کہہ دیا :۔

قال ابو سلیمٰن الرضا ان لا تسال اللہ تعالیٰ الجنۃ ولا تستعیذ بہ من النار (الرسالۃ القشیریہ صفہ ۹)	ابو سلیمان نے کہا کہ "رضا" یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے نہ جنت کی دعا کرو اور نہ دوزخ سے پناہ مانگو۔

یہ قول جس کا بھی ہو اللہ و رسول کے اقوال کی عین ضد ہے اور صوفیائے کرام ہی کی تصریحات کے مطابق اسے قبول نہیں کرنا چاہیئے۔

امام ابوالقاسم قشیریؒ

نام و نسب الامام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن بن عبدالملک بن طلحہ بن محمد النیسابوری القشیری۔ ان کا خاندان عرب کے علاقہ "استوا" کا باشندہ تھا۔ ان کا نسبی تعلق بنو قشیر بن کعب سے ہے۔ یہ خاندان عرب سے منتقل ہوکر خراسان میں آباد ہوگیا تھا۔

ولادت امام قشیری ربیع الاول ۳۷۶ھ مطابق ۹۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا لیکن انھوں نے علوم شرعیہ اور ادب کی تعلیم جاری رکھی۔ "استوا" کے علاقے میں یہ ایک بستی کے مالک تھے جس پر خراج اور دوسرے مطالبات کا بہت بار پڑ گیا تھا۔ انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ نیسابور جائیں تاکہ وہاں حساب اور معاملات سے متعلق دوسرے امور و علوم کی تعلیم حاصل کریں اور اس کے ذریعے اپنی جائداد کے مالی بار سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں۔

نیسابور میں آمد اسی رائے کے ساتھ وہ نیسابور آئے جو اس وقت علماء اور مفکرینِ اسلام کا مرکز تھا۔ اتفاقاً وہ اُس مجلس میں شریک ہوئے جو اپنے وقت کے امامِ صوفیہ، ابوعلی الحسن بن علی الدقاق منعقد کیا کرتے تھے۔ جب انھوں نے ان کی گفتگو سُنی تو بہت پسند آئی اور وہ ان کے دل میں اُتر گئی۔ ان کے ایمان کی کلی کِھل گئی۔ اُسی دن انھوں نے اپنے اس سابق ارادے کو جو انھیں

نیسا بور لایا تھا، ترک کر دیا اور سلوک الی اللہ اور مجاہدے کی زندگی اختیار کر لی۔ ابو علی دقاق نے جب ان کے جذبے اور ان کی صلاحیت محسوس کر لی تو انھیں قبول کر لیا پھر اپنی بہترین نگرانی میں ان کی رُوحانی تربیت شروع کر دی، انھوں نے ان سے کہا کہ علوم شرعیہ کی تکمیل کریں۔ ان کی ہدایت کے پیشِ نظر انھوں نے اس وقت کے ماہرینِ علوم شرعیہ سے علم دین کی تکمیل کی۔ پہلے وہ ابو بکر محمد بن ابو بکر طوسی کے درس میں شریک ہوئے اور "فقہ" میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ابو بکر محمد بن الحسن ابن فورک کے درس میں شریک ہوئے اور "علم الاصول" میں مہارت حاصل کی، پھر انھوں نے ابو اسحاق اسفرائنی کے درس میں شرکت کی اور چند دن وہ ان کا درس سنتے رہے، ایک دن اُن کے استاذ نے کہا کہ یہ علم صرف سننے سے نہیں آتا بلکہ اس کو قلم بند کرنا بھی ضروری ہے۔ امام قشیری نے ان چند دنوں میں استاذ سے جو کچھ سُنا تھا وہ اُن کے سامنے دُہرا دیا، استاذ ان کی ذہانت اور حافظے کی قوت پر متعجب ہوئے اور سمجھ گئے کہ ان کا شاگرد کس درجے کا آدمی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ تمھیں میرے درس میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ میری تصنیفات کا مطالعہ تمھارے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اسفرائنی اور ابن فورک کے طریقوں کو جمع کیا پھر انھوں نے قاضی ابو بکر بن الطیب الباقلانی کی کتاب کا مطالعہ کیا۔ تعلیم کی اس پوری مُدت میں وہ برابر اپنے شیخ ابو علی الدقاق کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے رہے۔ جب ان کے شیخ نے محسوس کر لیا کہ وہ مرتبۂ کمال پر پہنچ گئے ہیں تو اپنی صاحبزادی سے ان کا نکاح کر دیا اور اس طرح ان کو اپنے خاندان کا ایک فرد بنا لیا۔

علماء و مورخین کے اعترافات

ابن خلکان نے اپنی کتاب "وفیات" میں ان کے متعلق لکھا ہے:

کان علامۃ فی الفقہ والتفسیر والحدیث والاصول والادب والشعر والکتابت وعلم التصوف۔ جمع بین الشریعۃ والحقیقۃ	وہ فقہ، تفسیر، حدیث، اصول، ادب، شعر، کتابت اور علمِ تصوف میں علامہ تھے، انھوں نے شریعت وحقیقت کو یکجا کر دیا تھا۔

ابوالحسن باخرزی نے مبالغے کے ساتھ ان کی تعریف لکھی ہے اور خطیب نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ امام قشیری ۴۴۸ھ میں بغداد آئے اور انھوں نے علماء کو حدیثیں سنائیں اور ہم لوگوں نے ان کی حدیثیں لکھیں:

وکان ثقۃ، احسن الوعظ، ملیح الاشارۃ وکان یعرف الاصول علی مذھب الاشعری والفروع علی مذھب الشافعی	وہ ثقہ تھے، ان کا وعظ بہترین اور ان کا اشارہ حسین تھا وہ مذہب اشعری کے مطابق اصول اور مذہب شافعی کے مطابق فروع کے عالم تھے۔

مورخین نے ان کے اشعار بھی نقل کیے ہیں اور ان کی تعریف کی ہے۔

سفرِ حج انھوں نے علماء ومحدثین کے ایک قافلے کے ساتھ سفرِ حج کیا تھا۔ اس قافلے میں امام الحرمین کے والد ابو محمد الجوینی اور احمد بن الحسین البیہقی بھی تھے۔ ان لوگوں سے بغداد اور حجاز میں بہت سے علماء نے حدیثیں سنیں احادیث سننے والوں میں یہ علماء بھی تھے

احمد بن محمد بن عمر الخفاف ـــــ محمد بن احمد بن عبدوس المکی ـــــ ابونعیم عبدالملک بن الحسن الاسفرائنی ـــــ الحاکم ابوعبداللہ ـــــ اور صاحب "طبقات الصوفیہ" ابوعبدالرحمٰن السلمی۔

تصنیفات امام قشیری نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ یہاں ایک فہرست پیش کی جارہی ہے:

(۱) الرسالۃ القشیریہ ۔ اس کی شرح شیخ الاسلام زکریا الانصاری نے لکھی ہے اور اس شرح پر نفیس حاشیہ شیخ الاسلام السیّد مصطفیٰ العروسی نے لکھا ہے ۔ یہ کتاب متعدد دفعہ طبع ہو چکی ہے ۔

(۲) "لطائف الاشارات" فی تفسیر القرآن ۔ غیر مطبوعہ ۔ اس کتاب کے مخطوطات ہندوستان، استانبول، دمشق اور لیڈن میں موجود ہیں ۔

(۳) "کتاب الفتویٰ" اس کا ذکر سبکی نے طبقات میں کیا ہے ۔

(۴) "حیاۃ الارواح والدلیل علی طریق الصلاح والفلاح" غیر مطبوعہ ۔ اس کا نسخہ اسکوریال میں ہے ۔

(۵) "کتاب المعراج" اس کا نسخہ بانکی پور میں ہے ۔ ڈاکٹر حسن عبد القادر نے اس کو ایڈٹ کر کے قاہرہ سے شائع کر دیا ہے ۔

(۶) "شکایۃ اہل السنۃ" اس کا ذکر سبکی نے طبقات الشافعیہ میں کیا ہے ۔

(۷) "الفصول" "اللمع" یہ دونوں کتابیں غیر مطبوعہ ہیں اور قاہرہ میں ہیں ۔

(۸) کتاب "التوحید النبوی" غیر مطبوعہ ۔ قاہرہ میں ہے ۔ (۹) "کتاب التفسیر فی علم التفسیر" اس کا مخطوطہ ہندوستان اور لیڈن میں ہے (۱۰) "کتاب التمیز فی علم التذکیر" غیر مطبوعہ ۔ استانبول، طہران، قیروان اور قاہرہ میں ہے (۱۲) کتاب "الاربعین حدیثا" اس کا مخطوطہ لیڈن میں ہے (۱۳) کتاب "ترتیب السلوک" اس کا مخطوطہ ڈبلن میں ہے (۱۴) کتاب "شرح اسماء الحسنیٰ" اس کا مخطوطہ، موصل، طہران، تونس اور دمشق میں ہے ۔ ان کے علاوہ ان کی اور تصنیفات بھی ہیں ۔

وفات ۱۶ ربیع الاول ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ء سنیچر کی صبح کو نیساپور میں وفات پائی اور اپنے شیخ اور خسر ابو علی دقاق کے جوار میں مدفون ہوئے رحمہ اللہ تعالیٰ

(مجلۃ التربیۃ الاسلامیۃ بغداد ۔ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ)

اسلامی تصوّف

اس کتاب میں فلسفۂ یونان اور ویدانت سے متاثر تصوف کے بجائے وہ تصوف
پیش کیا گیا ہے جو قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں موجود ہے۔ اس میں صوفیۂ کرام
کے وہی اقوال و احوال نقل کیے گئے ہیں جو کتاب و سنّت سے متصادم نہیں ہیں۔

سیّد احمد عروجؔ قادری